

محبت، من، محرم

پاک سوسائٹی

سمیرا حمید

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

محبت کا نام

سے پرے تو ہیں ہی۔ ساتھ ساتھ معاشرتی مزاج پر بھی
بہت بھاری پڑتے ہیں۔

ذرا سے فاصلے پر بنے کپل ہٹس (HUTS)
میں سے ایک میں ماریہ سو رہی تھی۔ ماریہ زینتی
جوبہ ازبکستان کی پیدائشی۔ اپنی مام کی طرح گہری بزر
آنکھوں والی اس کی بیوی الٹی پٹی سی۔ عدنان نے
بہت سے اٹے مزاج کے لوگ دیکھے تھے۔ ایک وہ خود
بھی تھا۔ لیکن ماریہ جیسی الٹی شخصیت اسے اب تک
ایکسی ملی "ناریہ خود"۔

جب وہ آ رہا تھا تو اس نے کہا کہ اسے سونا ہے۔ اب
جب وہ واپس جائے گا تو وہ کوئی قلم دیکھ رہی ہوگی یا
گھنٹوں سے واش روم میں ہی ہوگی۔ اسے واپس آئے
چند منٹ ہی گزریں گے تو وہ خود چہل قدمی کے لیے باہر

عدنان کیپ ٹاؤن کے ساحل پر اکیلے ہی چہل
قدمی کر رہا تھا۔ فیسے میں جی تو اس کا چاہا کہ قریب جوار
میں نامناسب لباس پہنے چہل قدمی کرتی عورتوں کو شک
کسی ایک آدھ لڑکی کی کمر میں اپنے بازو جھانک کر دے
اور ہمیں تو انہیں آنکھیں مار دے اور اس اشارے پر
جب کوئی اس کے قریب آجائے تو وہ اسے لچکے لچکے
لے جائے۔ رات میں ڈنر کے لیے اور پھر دسکوکے
لیے اور پھر۔

لیکن ماریہ سے بدلہ لینے کی شدید خواہش کے باوجود
اس کا جی نہ مانا کہ وہ اپنے دو پہلائی میون پر یہ سب
کریے شادی سے پہلے کی اور بات تھی۔ اس وقت
جب کبھی وہ دوسرے ملک تفریح کے لیے گیا ماریہ
بہت سے کام کیسے ویسے ہی کام جو مذہب کے دائرے

مکمل ناول



جائے گی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو اس کے ساتھ کیوں نہیں جا ب اگر وہ یہ بات پوچھے گا تو ہنی مولن تباہ کرے گا۔ ڈیٹن بن کر وہ اتنا ضرور کے گا۔

”میں بھی آؤں ساتھ۔“

وہ پلٹ کر دیکھے گی بھی نہیں اور چلی جائے گی۔ عدن کو جواب دے بنا صرف وہی ایسے جاسکتی ہے۔ جا کر وہ واپس آنا بھول جائے گی۔ فون کٹش کے لیے ہاتھ ٹپ کے پاس یا کسی ڈرائیو رکھا ہو گا۔ وہ اپنے ساتھ صرف امریکن کریڈٹ کارڈ لے کر نکلتی ہے۔

ناچار وہ اکیلا ہی ڈنر کرے گا۔ ایک بار وہ اسے ڈھونڈتا کلب جا پہنچا۔ وہ بے خود ایک کونے میں پڑی تھی۔ اگر وہ نہ جاتا تو وہ ساری رات وہیں پڑی رہتی۔ لیکن ایسا فی الحال ایک ہی بار ہوا تھا۔ مگر وہاں وہ بھی سکتا تھا کیونکہ وہ اسے ساتھ کم ہی رکھتی تھی۔ بدل چلا تو ساتھ۔ ورنہ دور دور۔

وہ اچھے سے اچھے ہوٹل، ریسٹورنٹ، مولن لٹ ایریا، ٹریولرز، ہنٹ انوار اقسام کے کلبوں کے بارے میں معلومات کرتا ہوٹلوں میں سٹیٹس سمندر میں جہاز بک کرواتا۔ مگر وہ جا کر نہ دیتی۔ اگر چلی بھی جاتی تو منہ ایسے بتایا ہوتا۔ جیسے کسی ناگوار بدبودار جگہ آئی ہو۔ یہ ان کا ہنی مولن تھا۔ جس پر ماریہ کے ڈیٹن نے بے تحاشا پیسہ خرچ کیا تھا۔

”تم کتابور ہوئی ہو۔“ دراصل وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم کتابور کرتی ہو۔

ماریہ نے ابھرا چکا کر اسے دیکھا اور کھانا کھاتی رہی۔ خاموشی کا یہ وقفہ عدن کی بے عزتی کیے جا رہا تھا۔

”میرے تجزیہ نگار نہ بنو۔“ کچھ وقت کے بعد اس نے جواب دیا۔ لیکن کیا خوب دیا۔ اس رات کا ڈنر بھی تباہ ہو گیا۔

وہ کسی بات کسی چیز سے خوش ہوتی ہی نہیں تھی۔ چیزیں تو خیر اس نے بہت برتی ہوں گی۔ مگر شوہر تو وہ بھلا تھا۔ کبھی وہ خوش کر دیتی۔ کبھی خوشی چھین لیتی۔ کبھی کندھے پر خود ہی سر رکھ دیتی اور کبھی اپنے

کندھے پر سر رکھنے بھی نہ دیتی۔

”یہ تمہارا پلان کیا ہوا ہنی مولن ہے؟“ ایکسپنر بری طرح سے چڑ گیا۔

”میرا نہیں ڈیٹن کے سیکرٹری کا۔“

”اس نے تمہاری پسند سے ہی کیا ہو گا۔“

”ہاں تو مجھے یہ سب پسند ہے۔“

”لگتا تو نہیں ہے۔“ سچی بات بھی اس کے سامنے ڈرڈر کے کرنا پڑی تھی۔

”کیسے لگے گا؟“ وہ صاف برا مان گئی۔

عدن کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ نہ ہی کوئی نیا سوال۔ جواب بھی بہت تھے اور سوال بھی۔ لیکن اس نے مزاج والی کے لیے اب کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔

”ایم او کے۔ کول۔“ پرفیکٹ۔ اس طرح نہ بھاڑ کر مجھ پر تبصرہ نہ کیا کرو۔

عدن چپ ہو گیا تھا لیکن وہ نہیں رکی اس کے منہ بھاڑ انداز پر وہ تھلا کر رہ گیا۔ زیر لب گالیاں دیں۔ اپنے ہنی مولن پر صرف چالیس دن پرانی بیوی سوٹ ہارٹ کو گلہ دی۔

شاید یہ گلہ دینے کی نوبت اتنی جلدی نہ آجاتی۔ اگر دعی پام شی میں اس نے ماریہ کے ساتھ اس کے ذاتی دلا میں قیام نہ کیا ہوتا۔

ان دونوں کی شادی پاکستان میں ہوئی تھی۔ دسمبر دعی پام شی میں دیا گیا دلا میں ہی دونوں نے دو ہفتے قیام کیا۔ دونوں کی فہمیدہ واپس جا چکی تھیں۔ شروع کے دن کافی پر ہمار اور ہنگامہ خیز تھے۔ دونوں گھنٹوں سونمنگ کرتے۔ نت نئے ہوٹلز جاتے۔ ماریہ کے دوستوں کی طرف سے دی گئی چند پارٹیز اینڈ کیس۔ کلب اور سینما کے چکر لگائے۔

ماریہ کے ایک شیخ دوست طاہر البشر نے انہیں ڈنر پر بلایا۔ بقول شیخ ”رہائش گھر“ اور بقول عدن ”چھوٹے سے محل“ میں انہیں دعوت طعام دی گئی واپسی پر انہیں دعی کے ایک پوش علاقے میں واقع ایک پارٹمنٹ گنٹ کیا گیا۔ لیکن یہ سب بھی اتنا

محل نہ تھا۔ شیخ کا محل نہ ہی سونے چاندی کے پرچے۔ بس وہ خوش آمدیدی اور الوداعی انداز۔ واپس بائیں گل پر بوسے جو شیخ اور ماریہ دونوں کی رائے سے تھے۔

ان روایتی ملاقاتی انداز کو عدن خوب جانتا تھا۔ لیکن صرف یہ روایتی انداز ہی نہیں تھا۔ ماریہ نے بغیر آئین کا سنرا گاؤں پہنا تھا اور شیخ کو ماریہ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں رہا تھا۔ عدن نے کمال بے غیرتی سے نظریں اوڑھ کر کہیں۔ لیکن اس کے اندر سوال جواب شروع ہو گئے۔ نیا نیا تھا۔ ابھی عادی نہیں ہوئی۔ شیخ صاحب کمال مولانی سے اپنی ساری توجہ ماریہ پر مرکوز کرتے رہے۔ کمال کے انسان تھے۔ شوہر نام کی چیز صرف ایک نظری ڈالی۔

اور اتفاقاً اس کی نظر بھی اس نام پر پڑ گئی جو ماریہ کو اس کے گھر سے فیکس کی گئی رپورٹس پر لکھا تھا۔ وہ نام بھی شیخ طاہر البشر تھا۔

وہ اپنے لب لباب پر چند ای میل چیک کر رہا تھا۔ جب لاہوری میں ذرا قریب رہی فیکس مشین میں فیکس آیا۔

”تمہارا فیکس آیا ہے ماریہ۔“

وہ ماریہ کو جانتا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھیں جو شادی کے بعد شوہروں اور شادی سے پہلے اپنے فریڈز کو اپنے پاس دروازہ دیتی ہیں۔ وہ بیکالی کی نہیں الگ الگ کی قائل تھی۔ وہ تو اس کے موبائل کو بھی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر وہ لب لباب پر کام کرتی۔ کبھی اٹھ کر چلی بھی جاتی تو وہ اچک کر یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اتنی دیر سے لب لباب پر کیا کرتی تھیں۔ میڈ کو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا ایک بھائی فیکس آنے والا ہے۔ وہ ضروری فیکس عدن کے پاس تھا۔ اس کی نظر نے صرف شیخ طاہر البشر کو پڑا۔

وہ سوانا ہاتھ لے رہی تھی۔ چلائی۔ ”نیمیل پر رکھ لے۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کا فیکس پڑھ لیا جائے

گا۔ ڈریس غریب غریب۔ ماریہ کیوں ڈرے؟ اتنا کی بیٹی کیوں ڈرے۔

تیار ہو کر وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔ وہ دن ایسے ہی صبحو شام جاتی رہی۔

”کنج تو کہیں نہیں جانا؟“ تیسرے دن اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ اپنی موٹ وراثت بیوی سے۔ اس کے گل پر چنگی بھر کر۔ لڈ کرتے ہوئے۔ وہ اس کے انداز میں۔

اس نے چنگی بھرتے ہاتھ کو جھٹکا۔ ”کیا مطلب؟“

”ایسے ہی۔“ ہاتھ جھٹکے جلنے پر اسے پہلی بار پہلا صدمہ ملا۔

”چلی بھی جاؤں۔ کنج بھی۔ اور جب کبھی۔“

”تمہیں کیا؟“ الفاظ سے زیادہ انداز رہا تھا۔

”ہاں جی! اٹھیک عدن کو کیا۔“ وہ منہ پھلا کر پہلی بار ناراض ہو کر باہر نکل گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ضرور محسوس کرے اس کے پیچھے آئے گی۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ واپس گیا تو وہ جا چکی تھی۔ ملائیشین میڈ سے پوچھا۔ اس نے رنی ہوئی انگریزی طرز پر کہا۔

”آئی ڈونٹ نو سر۔“

عدن کو کچھ سکی سی محسوس ہوئی۔ اس جیسا لڑکا جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آکر موبائل فرش پر دیوار پر دے مارتا تھا۔ اب صرف غصے میں غمٹنے لگا۔ کس کے سامنے موبائل دیوار پر دے مارے۔ ٹی وی کے چینل بدلنے لگا۔ شام گزر گئی۔ ماریہ آئی۔ جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گئی۔ بیگ بیڈ روم کے دروازے کے پاس گرا پڑا تھا۔ موبائل کی چین من گلاسز کو صوفے پر اچھالا گیا تھا۔ من گلاسز صوفے کے کنارے سے گرنے کے قریب تھے۔

”ماریہ!“ وہ اس کے اوپر جھکا۔ غصے کو ایک طرف کیا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو چھوٹا چاہا۔ اس نے جواب میں ایک مختصری اول۔ س۔ کی۔ اس انداز پر غصہ دوبارہ آگیا۔ دراصل ماریہ ایک چیز تھی تو وہ بھی بہت زعم میں تھا۔ ماریہ پہاڑ کی چوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

دروازوں کی پروا کرنا کون ہے۔ اب وہ اسے اپنی گرل فرینڈ سمجھ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کی بیوی تھی اور کسی بیوی نما گرل فرینڈ "کھل جاسم سم" تھی۔ ساؤتھ افریقہ میں ماریہ کے مزاج کے مطابق دن گزار کر وہ امریکا ہوئیں آگئے۔ وہ منزلہ چھوٹا سا اسپتال تیار کیا تھا۔ تین و آرائش اس نے اپنی مرضی سے کروائی۔ جراحی آلات و دیگر ساز و سامان اپنی مگرال میں منگوایا۔

پہلی قسط اسپتال تیار تھا۔ پاکستان سے اس کے پاپا، اما اور بہن آئی۔ سفید رین کو اس کے سر پر کاٹا۔ بلند بانگ قہقہہ اس کے پاپا نے لگایا۔ اس نے تالیاں بجائیں اور سب اسپتال میں داخل ہو گئے۔ پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔ "اب کون کیا خیال ہے؟"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کلچر حسی استقامت



قلندر حسی

قیمت - 400/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

پاپا نے اسے اپنی گرل فرینڈ سمجھ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کی بیوی تھی اور کسی بیوی نما گرل فرینڈ "کھل جاسم سم" تھی۔ ساؤتھ افریقہ میں ماریہ کے مزاج کے مطابق دن گزار کر وہ امریکا ہوئیں آگئے۔ وہ منزلہ چھوٹا سا اسپتال تیار کیا تھا۔ تین و آرائش اس نے اپنی مرضی سے کروائی۔ جراحی آلات و دیگر ساز و سامان اپنی مگرال میں منگوایا۔

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔ "اب کون کیا خیال ہے؟"

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔ "اب کون کیا خیال ہے؟"

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔ "اب کون کیا خیال ہے؟"

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔ "اب کون کیا خیال ہے؟"

خاص کر مشرقی شوہر کی بات کا جواب نہ دیا جیسے اسے پیٹھ دکھا دی جائے۔ اس سے اچھا ہے کہ اس کے منہ پر چائنا مار دیا جائے۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔" وہ تباہ ہوا کھڑا تھا۔ مرنے مارے کے لیے تیار۔ غیرت مند پاکستانی شوہر۔

"تو؟" انداز میں حیرت تھی نہ سوال میں۔

"تمہاری رپورٹس پڑھ لی ہیں۔"

"گلف" پاؤں مل رہا تھا۔

اس انداز پر عدن کا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔

"کچھ اور؟" سوال تھا یا مذاق۔

"کتنے ابارشن کرا چکی ہو؟" عدن نے اپنی طرف سے اسے تھپڑ مارا کہ وہ بلک اٹھے گی۔

"صرف دو تک ہی نوٹ آئی تھی۔" الٹا وہ بدک الٹا تھپڑا سے ہی لگا۔ وہ تو مزے سے کہہ گئی۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے ان میں لڑائی ہوتی رہی۔ لڑائی بھی کیا۔ عدن ہی بھڑک بھڑک جا رہا تھا۔ وہ آزاد خیال بھی ہے اور آزادی بھی رکھتی ہے۔ وہ جانتا تھا۔ لڑجھڑ کوہ قریبی ہوٹل آگیا۔ پاپا کو فون کیا۔

"وہ اس کی بیوی نہیں گرل فرینڈ تھی۔" اس نے ماریہ کی کسی ایک ایک بات پاپا کو بتا دی تو انہوں نے کمال الفاظ سے اسے تسلی دی۔ "میکس گرل فرینڈ۔"

ماریہ کو کچھ پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ دینی کے اسی کلینک سے اپنا چیک اپ کروایا تھا۔ جس کے لیے اس نے امریکا سے اپنی رپورٹ منگوائی۔ اس کی تانہ ترین رپورٹ میں بھی بہت سے مسائل ہی تھے۔ اس کی طرف سے اب وہ مرے یا جیسے یا

لیکن خود کو وہ جھنڈا سمجھ رہا تھا جو فلاح لگا تا ہے۔ اس کے خیال میں ماریہ کو اس کے پیروں تلے ہو جانا چاہیے۔ بے شک خود گردن اکڑا کر چوٹی بنی کھڑی رہے۔

غصے سے وہ باہر آنے لگا تو دروازے کے پاس بڑا بیگ اٹھایا۔ باہر لے آیا۔ کھولا۔ اندر تین کاغذ تھے کیے رکھے تھے۔

وہ بہت بڑھا لکھا تھا۔ امیر تھا۔ بہت سے مہنوز جانتا تھا۔ لیکن اب غصے میں آکر وہ کاغذات پڑھنے لگا۔

مہنوز ماریہ پر غصہ تھا۔ اس نے آنکھیں میکیٹس۔ لمحے بھر کو ذرا سا کانٹا۔

باری باری تینوں کاغذات پڑھے۔ ایک فیکس تھا جو امریکا سے اسے کیا گیا تھا۔ دو رپورٹس تھیں جن کی تائید ایک دن پہلے کی تھی۔ تینوں کاغذات پڑھتے ہی اس کا دل غرا گئے۔ سوئی ہوئی ماریہ کو بھینچوڑا۔

"یہ کیا ہوا اس ہے؟"

"واٹ؟" نیند سے اٹھائے جانے پر وہ غصے سے بولی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کاغذات اس کے سامنے لہرائے۔

وہ لپک کر اٹھی اور اس کے ہاتھ سے کاغذات جھپٹ لے۔ تمہاری اتنی جرات ہے؟ وہ انگلیش میں دھاڑی۔ وہ انگلیش میں ہی بات کرتی تھی۔ اردو بہت کم بول اور سمجھ سکتی تھی۔ عدن اس کی جرات پر حیران رہ گیا۔ الٹا وہ اسے یہ بتا رہی تھی کہ اس نے اس کے کاغذات کو بیگ میں سے نکالنے کی ہمت ہی کیسے کی۔

کمال کی بات ہے نا؟

"تم شیخ کی بیوی تھیں؟" اس کی آواز اور غصہ اور بلند ہو گیا۔

اس نے جیسے سنائی نہیں۔ کاغذات کو ہاتھ میں لیے الماری تک گئی۔ پٹ کھولا اور اندر رکھ کر مقفل کر دیا۔

"ماریہ! عدن چلایا۔ مشرقی خوب صورت مرد اور

اس نے بھی جواباً یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو
”جی۔ کمال کا خیال ہے۔“

اس افتتاح میں ماریہ شامل نہیں تھی۔ اس کی پروا
کے تھی۔ چند دن بعد وہ اسپتال آئی۔ ادھر ادھر گھوم
پھر کر دیکھا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ نہ جانے
کیا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ کے انداز پر عدنان کا منہ بن
گیا۔ لیکن ڈھیٹ ہی بنا رہا۔

”جتنے مرضی طفر کر لے گدھی۔“ اسے ساتھ لے
کر وہ بچ کے لیے آگیا۔

ماریہ آج کل گھر سیٹ کر رہی تھی۔ حیرت کی بات
تھی کہ اپنی ازدواجی زندگی کی بنیاد گھر کو وہ بہت دل جمعی
سے سیٹ کر رہی تھی اور اس بنیاد کی بھی بنیاد
”تعلق“ پر اس کی نظر نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ اس
سے بھی مشورہ لے لیتی۔ اس کی پسند کا پوچھ لیتی۔
پورے گھر میں ڈرائنگ روم کی ایک سائیڈ ٹیبل عدنان
کی پسند کی آئی تھی۔ وہ بھی نہ آئی تو عدنان کو فرق پڑنے
والا نہیں تھا۔ یہی کافی تھا کہ ان کی بول چال میں تبدیلی
آگئی تھی۔ بلکہ پھلکی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ ایک ساتھ
پر اس دن کر لیتے۔ کبھی کبھار باہر چلے جاتے۔ سب
ہی سرنہ سہی ایک آدھ سمران کے رشتے کا ٹھیکہ نہ ہی
جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے کریم کافی بناتی اور اس کی گردن
پر ایک جھنکی بھرتی۔

کبھی کبھار وہ خواہ مخواہ ہنسنے لگتی۔ جب وہ کار کا دروازہ
کھولتا۔ کھانے کی میز کی کرسی کھسکا کر کھڑا رہتا۔
”ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔ ٹھیک۔“ انگلی لراتی کہتی
جاتی۔

اور وہ ہر بار یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کرتا تھا کہ ڈیڈ کیا
کہتے ہیں۔ ایک بار یہ عظیم غلطی کی تھی۔

”ہوں۔“ اس نے صرف دو انگلیوں کو موڑ کر
ٹھوڑی کے نیچے رکھا۔ ہونٹوں کو نیم وا کیا۔ بولی کچھ
نہیں۔ آنکھیں ذرا سی تر چھی اس کی طرف نکالیں۔
عدنان کو مارلن منو کی مشہور زمانہ تصویر یاد آگئی جو کالج
کے دنوں میں اس کے ساتھ روم کے دروازے پر چسپاں
تھی۔ بعد ازاں اس نے اس کی جگہ کھٹی پیری کو

چسپاں کر دیا تھا۔
”انہوں نے کہا۔ وہ غلام علی غلام کا بیٹا ہے۔ مجھے
چاہے سدھا لو۔“

عدنان مسام ورم مسام بھیگ گیا۔ پاکستان کے ہر
اپنے شعبے میں قابل اور باکمال ڈاکٹر عدنان اپنا دم ختم کر
بیٹھا۔

”گور سنو۔ انہوں نے کہا۔ جو لوگ کاری ضرب
دیتے ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا۔ عدنان سے نہیں بچو
کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس میں اتنا دم ختم
نہیں ہے۔“

بات کہہ کر نزاکت سے اٹھ کر وہ چلی گئی۔ جیسے
فٹ بال میچ کے آخری لمحات میں فیصلہ کن گول کیا ہو
اور اس کی نیم جیت گئی اور اتنی دیر سے جو وہ محتاط چل
رہا تھا۔ وہ پوچھ لینے کی ایک بڑی غلطی کا مرتکب ہوا
تھا۔ تاکہ ماریہ نے اسے اور پلواد گمن رہا تھا۔

کس بات کا دم ختم؟ آنے والے وقت میں شاید
اسے بتا ہی دے گا۔ جا بھی دے گا۔ اس کے ڈیڈ کے
پاس صرف چند ہزار ملین ہی زیادہ تھے اس کے پاس
سب سے پیسے کا بس اتنا سا ہی فرق۔ ان کے پاس روم
دونوں میں تھی اور ان کے پاس ڈائروں میں۔ طاقت
اور عقل تو مرد کے پاس ہی ہوتی ہے۔ تا تو اس طرف
مرد تھے۔ عدنان اور اس کے پیپا غلام علی غلام اور اس
طرف صرف آغا عباس حیدر۔ اور پھر عدنان شوہر تھا۔
کتنے پوائنٹس تو ایسے ہی اپنے آپ مل جاتے ہیں۔
صرف شوہر ہی ہوتے۔ وہ لائق قاتل ڈاکٹر تھا۔

دونوں میں ہی کہاں کہاں پہنچ جائے گا اور ماریہ
حسن کی دیوی۔ اس حسن کے بل بوتے پر بھی بلاؤنگ
کی فیلڈ میں کوئی نام نہیں بنا سکی۔ چند کمرشل ہی
کر سکی۔ باپ کا پیسہ بھی کام نہ دلا سکا۔ ہالی ووڈ کی
فلمیں تو بہت ہی دور کی بات، کبھی عدنان کو خود کو مطمئن
رکھنے کے لیے بہت سے فلسفے مل جاتے تھے۔ بہت
سی خامیاں۔ اسے ہر جگہ اپنی ہی کامیابی نظر آتی
تھی۔ کاری ضرب تو وہ واقعی شاید نہ ہی دے سکے
لیکن چھوٹی چھوٹی ضربیں وہ تیار کر سکتا تھا۔ جو کاری بنا

کیا نہیں کی اسٹھی ہو کر۔
”ماریہ سے فاصلے پر لیکن دوست بن کر رہنے لگا۔
اپنی گریڈ ہے۔ کہاں آجاری ہے۔ کس کس سے
لڑتی ہے اور ایسی ہی دوسری باتیں امریکا میں رہتے تو
پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب اس نے توجہ دینی بھی
پہنچا دی۔ جب کبھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا
تھا تو وہ چلا جاتا۔ وہی ماریہ کے ٹائپ کی پارٹیز۔ وہاں
نہیں۔ نہ جاتی۔ اور لڑکھڑاتی واپس آ جاتی۔ جی تو
اس کا ہاتھ کہ اسے کسی سڑک پر دھکا دے کر گرا دے
اور گولی کا راس کا سر پھیل دے۔ لیکن وہ اسے سہارا
دے کر بیڈ تک لاتا۔ وہ جو توں سمیت بیڈ پر لوندھی
کر جاتی۔ عدنان بیڑا تاتا اور دوسرے کمرے میں جا کر
سو جاتا۔ پھر وہ اس کے ساتھ جانے سے ہی کترانے
لگا۔ نہ بھی شوق میں اسے لے کر نہیں جاتی تھی۔
صرف وہیں جہاں پہل کید رنگ ہوتی۔ وہ نہ جاتا تو ماریہ
کے ڈیڈ اس پر چلانے لگتے۔

”تم سے شادی کس لیے کی ہے اس کی؟“ سب
نے فرعون بنے تھے شاید۔ باپ بیٹی ایک ہی
انداز میں بات کرتے تھے۔ لفظوں کو چباتے ہوئے
اور کھاتے ہوئے پھر بھی دل دہلاتے ہوئے۔

عدنان کو کیا معلوم کہ اس سے کیوں کی ہے۔ اسے تو
صرف اپنی طرف کا ہی معلوم تھا۔ وہی ”کھل جاسم“

”اس کے ساتھ جایا کرو۔ اس کا خیال رکھا کرو۔“

ماریہ ہندھے اسے ساتھ جانا ہی پڑتا پارٹیز میں وہ
کتنے اے تو بہت کرتا۔ لیکن ماریہ کا برتاؤ اس کے خون کا
پلازما تھا۔ وہ ہر کسی کی بانہوں میں جھول جاتی۔ گلے
کے گلے سے گلے رکھتی اور۔ اور۔ اور۔
ایسے وقت اسے مشکل لگتا۔ صرف اسے گمرل
نہیں سمجھتا۔ غیرت اٹھ اٹھ آتی اس میں۔

”تم روز روز ایسی پارٹیز میں آکر کھکتی نہیں؟“
وہ دیر تک چھوٹے بچوں کی طرح نہ نہ۔ میں
نہیں ہلاتی رہی۔ عدنان اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جس نے
پہنچا پ کی نہیں سنی وہ اس کی کیا سنے گی۔

”میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ترس
گیا ہوں۔“

گولڈن ہائی ہیل اتار کر اس نے اپنی گود میں رکھی
ہوئی تھیں۔ عدنان کے اس طرح کہنے پر ایک ایک
کر کے سینٹل اٹھائی اور لا پرواہی سے اس کی طرف
اچھال دی۔ ایک منہ اور ٹھوڑی سے رگڑ کھا کر کھڑکی
کی طرف نک گئی اور ایک کندھے اور سینے کو چھو کر
اس کی گود میں گری۔ اس انداز پر وہ جیسے چپ رہا وہی
جاننا تھا۔

”سچ؟“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
اس بار عدنان صرف مسکرایا۔

”تم ایک قاتل شوہر ہو۔“ اگلی بات نے اس کی
مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیا اور وہ گلا پھاڑ کر ہنسی۔ ایک
آنکھ دبا کر آنکھ ماری۔ اب اس کا جی چاہا کہ اسی کی ہائی
ہیل سے اس کی یہی آنکھ پھوڑ ڈالے۔ لیکن کیسے پھوڑ
ڈالتا اسپتال ابھی نیانا تھا۔ وہ بھی وہاں نیا تھا۔

آنے والے دنوں میں وہ بھی ٹھوڑی قاتل بیوی
بننے لگی۔ میڈ کو دیکھ لیتی۔ گروسری کے لیے جاتی۔
اس کے لیے بھی شاپنگ کرتی۔ کبھی کبھار اسپتال آکر
اس کے ساتھ دوسرے کھانا کھاتی اور کبھی کبھار ہی اس
کے چھوٹے بڑے کام بھی کر دیتی تھی۔ اب اسے ڈر
لگتا کہ یہ اچھی بیوی ہی نہ بن جائے۔ کیونکہ وہ اس
سے محبت کرنے کے مؤذ میں اب نہیں تھا۔ ”اس کے
ساتھ زندگی گزارنی ہے۔“ اس کی فرست میں نہیں
تھا۔ ”اس کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔“ یہ ضرور
فرست میں درج تھا۔

ویک اینڈ پر وہ ڈیڈ کی طرف چلے جاتے۔ اس کے
ڈیڈ چمکے چمکے ماریہ کی طرف دیکھتے اور پھر اپنی بیوی کی
طرف۔ دونوں میاں بیوی نظروں ہی نظروں میں بہت
کچھ کہہ سن لیتے۔ جیسے کہتے ہوں۔

”دیکھو ایسی ٹونکا کام کر گیا تا۔ بھل گئی نا ماریہ۔
ٹھیک ہو جائے گی۔ اور ٹھیک ہو جائے گی۔ دیکھی تھی
دیکھی مرضی دیکھی لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں۔ دنیا
گھوم پھر لو۔ اپنا دس کام ضرور آتا ہے۔“

اس کا عدن ہوگا۔
تین دنوں کے آٹھ محنتوں میں ڈاکٹر نے اس کا دلغ
خوب چاٹا۔ ماریہ سے متعلق اس کی معلومات میں اور
سے اور اضافہ ہوا۔

کشمیر کی کھلی، اذہک کی پری، خوب صورتی میں مس
یونورس، ایک کامیاب ماڈل نہیں بن سکی تھی۔
یہ تھا شاخوب صورت ہونے کے باوجود اور اس سب کے
ساتھ ہی وہ ایک کامیاب ماڈل کے جو اس کا بوائے فرینڈ
تھا ساتھ تعلق قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ بوائے فرینڈ کی
کامیابی کا گراف بڑھنے لگا۔ وہ ماڈلنگ سے کمرشلز اور
پھر فلم تک جا پہنچا۔ پھر اس کے لیے ایک گرتے ہوئے
گراف کی ماڈل کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اگر وہ دنیا میں
اکلوتی خوب صورت ہوتی تو شاید کوئی بات بھی نہ تھی۔

اب یہ سچی محبت کے کھوجانے کا وہ تھا یا کیر نہ
 غنے کا غم مار یہ نے ان ہی دنوں ڈور گزرتی شروع کی۔
 سگریٹ ڈور تک سب کچھ وہیں سے آیا۔ فتح بھی اسی
 بے راہ راوی کا نتیجہ تھا۔ ڈپریشن کے ان ہی دنوں میں
 اس نے بہت کچھ کیا۔ اسے دنیا کھائی گئی۔ لیکن ہر بار
 اس نے نیا ہی کارنامہ انجام دیا۔

ڈاکٹر اور اپنی ساس کے ساتھ آخری ملاقات میں اس کا جی چاہا کہ وہ جاتے ہی ماریہ کو فارغ کر دے۔ اتنی تھوکی ہوئی لڑکی وہ چاٹ رہا ہے۔ ذات کی اتنی بد عمل میں اتنی کمتر اس رات وہ صبح تک بار میں بیٹھا رہا۔ اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بل نوے چھ۔ دولت کے ساتھ ہی سہی، لیکن اس نے کبھی ایسی زندگی کا نقشہ نہیں بنایا تھا۔

وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ اپنی جوانی کے سنہرے دن کس کے ساتھ گزار رہا ہے۔ یہ سب ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

خالص پاکستانی انداز میں اپنے سرالوں پر چڑھ دوڑنا چاہتا تھا۔

”کیا سب؟“ مساس کی بھی فرعونوں جیسی گردن اکڑ
 مہنی۔
 ”پنی بیٹی کے کرتوتوں کا۔“

اس کے کندھے پر رکھا سناٹا تھا۔
 ”تم نے کیوں پوچھا؟“
 ”کیسے ہی۔“ اور اس نے ایسے ہی پوچھا تھا۔ جیسے
 کوئی بھی بات کر لی جاتی ہے۔
 ”دوبارہ مت پوچھنا۔“ پرانا تپا ہوا انداز واپس لوٹ
 گیا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہہ دیا۔ لیکن ٹھیک ہوا
 نہیں۔

یہ روم کا دروازہ بند کر کے وہ ڈرنک کرتی رہی۔
 جان کو تشویش ہوئی۔ بہت چاہا کہ وہ دروازہ کھول دے
 لیکن وہ انگلش میں گالیاں دینے لگی۔

عجیب مصیبت تھی۔ عدن نے اسے بھاڑ میں ڈالا اور دوسرے کمرے میں جا سویا۔ اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی یہی ہوتا رہا۔ پھر ماریہ کی مام آئیں۔ ماریہ کا فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ تین دن سے وہ کمرے سے نکل نہیں تھی۔ قریب جاتے ہی گالیاں دیتی۔ جس اٹھا اٹھا کر پھینکتی، چلاتی، نہ جانے کیا کیا کرتی۔

”تو تم مجھے بتاتے۔“ مام اس پر غصہ کرنے لگیں۔

”جب میں پیش نہیں کر سکتا تو آپ۔“
 ”میں کر لیتی ہوں۔ تم! اس طرح اپنی تکلیف میں
 لے آتے دن رکنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ تم اس کے
 بالاکو فون کر کے بتاتے۔ تم تو کسی کام کے نہیں ہو۔“
 ”چلا کر چلی گئیں۔“

”پاکل۔ سنی۔ سارے۔“ اس نے یہ صرف
سوچا تھا کہ انہیں۔

ہم ہادیہ کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔ نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس اس کے سیشن ہونے لگے۔ چند دنوں بعد عدالت کی بھی ملاقات کروائی گئی ڈاکٹر کے ساتھ کہ اسے مارپیچ کے ساتھ کیسے رہنا ہے، کیا کہنا ہے۔ کیا نہیں کہنا، کس رویے کا اظہار کرنا ہے، کس کا نہیں کرنا، کون سی بات اسے ڈپریشن میں لے جائے گی اور کون سی احساس کمتری میں۔ اسے دورے برس لگے وہ چلانے لگے گی۔ ڈرنک کرنے لگے گی۔ ڈرگز کی طرف پھر آجائے گی۔ اور اس سب کا ذمہ دار

ازبک ہوں۔“
 ”پاکستان تک تو آگئی ہو۔“ اس نے دونوں ہانڈوں
 کا گیر آس کے گرد بٹایا۔
 ”پھنسا لیا تم نے۔“
 ”پھانس لیا تم نے۔“
 اس کی آنکھوں میں پھونک مار کر دو بھاگی۔ آنکھوں
 کو جھپکادو بھی اسی کے پیچھے بھاگ۔
 چند ہفتوں کے لیے وہ پاکستان سے بھی ہو آئے
 غلام علی غلام نے زور زور سے اس کے کندھے پر
 تھپکیاں دیں۔ ”ماسٹر نکلے تم تو بھئی۔“
 وہ مسکراتے لگا۔ جیسے نوبل انعام ملا ہو۔ شکر یہ کی
 تقریر اسے ابھی کرنی تھی۔

”بھگدھے کی بچی کو لوٹا لیا۔“ جتناقی تہقہ بلند ہوا۔
 ”کمال کر دیا، بھئی واہ، مزا آگیا، مزا آیا۔“ پھر رک کر
 اس کے کھن میں سرگوشی کی۔ ”فل کھی کر رہے ہو
 کیا؟“

وہ چلا گیا۔ ماریہ نے اب پھر سے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں تیسری بار نئے سرے سے نکلا اور ہاتھ۔

”جو بھی ہے، جاری رکھو۔ گدھے کی گردن میں
کے کاٹا ڈال دو، نہیں پھر ٹھیک ہے؟“

”جی! ٹھیک ہے۔“ اس کا باپ کتے کا بٹا اسے
النے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہاں وہ خود اس کے کتے
میں سے تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ رنگ ماسٹر بن
جائے۔ شیر سے بھیڑیے تک سب کو سدھا لے۔
یسا کہ ضرور لیتا۔ اگر اپنے باپ کی طرح ہوتا۔ ابھی وہ
بنا تھا۔ کچھ کتابوں میں پڑھے اخلاق اس کے اندر
تھے۔ کچھ ان سب کا ابھی وہ علوی نہیں ہوا تھا اور کچھ
کبھی کبھی کوفت کا شکار ہو جاتا تھا۔ ورنہ سب ٹھیک
ل رہا تھا۔

”تمہاری ملائنگ کا کیا ہوا؟“ رات کو چہل قدمی کرتے ایسے ہی عدنان نے پوچھ لیا۔ ماریہ نے جھٹکتے

اور ازبک پوی جواب دیتی ہو۔ ”ہاں لیان لیا۔“
عدن ایسی نظروں کو پکڑ لیتا تو اور اکر جاتا۔ اس کے
پایا غلام علی غلام نے کہا تھا۔
”عدن! کوئی توجہ ہے کہ اس کا جھکاؤ ہماری طرف
زیادہ ہے۔“ اور وجہ یہی تھی کہ عدن جیسا قابل انسان
ہی قابل شوہر بن سکتا تھا۔ ڈرنک اور سگریٹ تو ماریہ
کے ناشتے کھانے تھے۔

ازبک ماں نے کہا کہ وہ کسی طریقے سے ماریہ کو ان سے دور کرے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ان دونوں میں کچھ تو محبت پیدا ہو ہی چکی ہے اور اس محبت کے نام پر ماریہ بہت کچھ کر لے گی۔

عدن نے سب اٹھا کر پھینک دیا۔ ساریہ ہنسی۔
 ”کسی نے آج تک اتنی جرأت نہیں کی۔“
 ”میں جرأت بھی کروں گا اور اصرار بھی۔“ اس بار
 واقعی عدن نے ہمت سے ہی کلام لیا تھا۔
 ”آہ۔ آہ۔ آہی سی۔“ اس نے ابرو اچکائی۔ پھر
 مسکرا دی۔

عدن واقعی ایک قابل انسان تھا۔ ماریہ ذرا سا اور بدلی تو عدن کی یادداشت بھی کمزور ہونے لگی۔ وہ شیخ طاہر البشور کو بھولنے لگا۔ ماریہ کے دوستوں 'بے تکلفی'، 'لا پرواہی'، 'طنز'، 'لڑائی' اور 'ادھر ادھر کے دوسرے چھوٹے بیڑے واقعات کو بھی بھولنے لگا۔ ویسے بھی وہ مرد مومن تو تھا نہیں کہ حرف آخر رکھتا۔ نہ مرد آہن کہ ڈٹ جاتا۔ وہ ماریہ پر جان نثار کرنے لگا۔ نیا نیا عاشق سا لگنے لگا۔ دلوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے، مزے کرتے، اکثر ماریہ کی قبلی بھی ساتھ ہوتی۔

”ڈاکٹر صاحب! تم بہت شرارتی ہو۔“ اس کے گلے سے وہ جھول جاتی۔ جب کبھی وہ ساحل سمندر پر بیٹھ کر اسے خالص پاکستانی انداز میں کوئی ویسی لطیفہ سناتا۔ اور وہ رست پر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

”مسز عدنان! تم بہت خوب صورت ہو۔“

”تمہیں کسے فخر ملے گا۔“
 ”تمہیں کسے شہسوار کی فخر ملے گا۔“
 ”پاکستان تک نہ لے جاؤ مجھے، میں اگر کچھ ہوں تو

”تم نہیں جانتے تھے اے؟“

”صرف اسے جانتا تھا۔“

”تم اور تمہارے پاپا تو یہاں آتے رہتے تھے۔ تمہیں معلوم تھا ماریہ کا لائف اسٹائل۔ اس لب و لہجے اور اتنی لونی آواز میں دوبارہ مجھ سے مخاطب نہ ہونا۔ میں ماریہ کی باتوں میں تمہاری نہیں۔“

”آپ کو اسے سمجھانا چاہیے۔“ ہنر کھا کر وہ سنبھل گیا۔

”سمجھالیا اب تم سمجھاؤ سنبھالو اسے۔“ انداز ایسا جیسے تمہیں تنخواہ دیتے ہیں اپنی ڈیوٹی کرو۔

”وہ میری نہیں مانتی مجھے اس کی فکر ہے میں اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا۔“

انہوں نے آنکھیں پھیلا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ یہ وہی ہے جو ابھی کر تو توں کی بات کر رہا تھا اور اب فکر کر رہا ہے۔

”کو شش کر رہے ہیں ہم۔ تم بھی کرو۔ کبھی کبھی وہ ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ ہو جاتا ہے ایسا سب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔“ سانس سے ہار کر وہ پاپا کو فون کرنے لگا۔

”وہ چپس اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ میں نے بھی کسی کے ایسے رویے نہیں دیکھے۔“

”تو تم سامنے سے ہٹ جایا کرو سن!“ وہی جتنا ہی قہقہہ لگا۔

”پاپا۔ پلیز۔“

”یابے بچے ہو کیا تم؟“

”جنگل ہے۔“

”جنگل کا کون سا ایسا جانور ہے جسے انسان نے پالتو نہیں بنایا۔ پنجرے میں لا نہیں بٹھایا۔“

”سانپ نہیں پالتے میں نے۔“

”تو بین بجاؤ پنچاؤ اسے۔“

”وہ مجھے نچاتی ہے۔ میرا سکون تباہ ہو رہا ہے پاپا!“

”دور رہو اس سے گرنے دو جو کرتی ہے۔“

”اس کا باپ کہتا ہے۔ اس کا خیال رکھو۔ دور کیے رہو؟“

”اس گدھے کو الو نہیں بنا سکتے تم؟“

”وہ مجھے گدھا بنا رہا ہے۔“

”عدن! لڑکیوں کی طرح رو بنا کر مرو۔“

اور وہ مودین گیا۔ ماریہ کا حال چال پوچھتا۔ بات کرنے کی کوشش کرتا۔ بات کر لی تو ٹھیک دور نہ اور ہر ہو جاتا۔ خود وہ اپنے معمولات میں سیٹ تھا۔ صبح اٹھتا جو گنگ ورزش کرتا اپنا ناشتا خود بنا تا اور اسپتال آ جاتا ماریہ سے کہیں زیادہ اسے اسپتال کی فکر تھی۔

رات کو دیر سے آتا ماریہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا تو اسے دیکھ لیتا۔ درندہ بند دروازہ دیکھ کر شکر ادا کرتا۔ اپنے کمرے میں آکر سو جاتا۔ ماریہ کے دورے کی حالت طویل ہو کر ختم ہونے لگی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتی۔

”ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“ اتنا عرصہ پہلے کی بات اسے یاد تھی۔

”ہاں کہا تھا۔“

”اب بھی کرتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ اور اس وقت وہ ہنسی تھی۔

عدن گڑبڑا گیا۔ ہاں ہی کہنا پڑا۔

”نہیں تم نہیں کرتے۔“ وہ ہسٹریائی ہنسی پائیں ہاتھ کی پمپلی انگلی اٹھا کر اس کی طرف لڑائی۔ ”نہیں کرتے نا؟“ ہاتھ گود میں گرالیا۔

”تم تو میرے شوہر ہو بس۔ قابل شوہر۔ بس۔“

وہ ماسف اور گہرے دکھ سے بولی۔ کچھ مل چپ رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر بگی سی ہنسی بننے لگی پھر جھٹ سے عدن کی شرٹ کے کالر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

”عورت ہوں۔ پاگل نہیں ہوں۔ کتنی ہی بے حس ہو جاؤں محبت کی حس رکھتی ہوں۔“ وہ کالر کو جھجوڑنے لگی۔

”چھوڑو مجھے۔“ پھر وہ پڑا۔ اس نے دل میں سوچا۔

”نہیں چھوڑتی۔“

”ماریہ!“ وہ نرمی سے بولا۔ کالر آزاد کرو آکر اسے

اپنے بچے سے لگایا۔

ماریہ نے کہا کہ وہ عورت ہے۔ لیکن پاگل نہیں۔

اپنے بچے سے لگا کر وہ اسے بتا دے گا کہ وہ پاگل ہے یا نہیں صرف چند ہی جملوں میں۔

محبت نہ کرتا تو تم سے شادی کرتا؟ پہلا جملہ۔

ختم پر پل پل مرتا ہوں۔ مرنا چاہتا ہوں اور ختم۔“

”ختم میں۔“ اس نے بہت معصومیت سے کہا۔

”تمہیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔“ وہ جیسے بہت دیکھی تھا اس کے لیے۔

”کیا ہو جاتا ہے عدن؟“ اس کی طرف بہت آس کر بولا۔

”میں تو ٹھیک ہوتی ہوں۔ خراب تو دوسرے ہو جاتے ہیں۔“

”میں دوسرا نہیں ہوں تمہارا شوہر ہوں۔“

”میریے ہو تم؟“

”ہاں! صرف تمہارا۔“

”صرف میرے؟“ بہت پیار سے پوچھا گیا۔

”صرف تمہارا۔“ بے حد پیار سے کہا گیا۔

محبت کے نام کی بین بجا کر عدن نے اسے سلاؤ ڈالا۔

وہ ہل گئی ٹھیک نظر آنے لگی صبح اٹھ کر اس کے ساتھ جو گنگ کے لیے جاتی۔ بھانگے ہوئے ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑا کر اسے منہ کے بل گرادی۔ وہ چلاتا۔

بھاگ جاتی۔ رات کو وہ سوتا تو فل والیوم میں میوزک لگا کر خود دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی۔ اس کے کمرے کے لور گاڑی کی چابی چھادی۔ گھر میں وہ آگے کے بھاگتی۔ پیچھے پیچھے بھاگتا۔

خود منٹ کی ڈرائیو پر ڈیڈ کا گھر تھا۔ آج کل ناشتا کھانے کے ساتھ کرنے لگے تھے اس کے ڈیڈ اس سے لاڈ کرتے اس کی پلیٹ بھرتے اس کے ہاتھ کی پمپلی کو ہوشوں سے لگاتے اور اس کے بالوں کو ذرا سا کھینچتے۔

”گھوم پھر کیوں نہیں آتے تم لوگ۔“ بیٹی ذرا سا سنبھل کر توڑ پھوٹ آفر کیا جانے لگا۔

”آفر اچھی ہے۔“ ماریہ نے جوس کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

عدن کا خیال تھا وہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ وہ سنجیدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ سنجیدہ ہی تھی۔ اس نے پلان کر لیا تھا اور کیا خوب پلان کیا تھا۔

عدن کو لگا کہ اس نے کوئی عار اور دہانہ نہیں چھوڑا۔ اس ٹرپ میں وہ اتنی سنجیدگی سے ان سب کا جائزہ لیتی رہی جیسے ان پر کتاب لکھ رہی ہو۔ عدن میں موج مستی کا عنصر زیادہ تھا۔ اسے کنڈرات سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کسی زمانے میں اسے شوق ہوا تھا اجڑی عمارتوں کو دیکھنے کا۔ چند ماہ اس نے دل لگا کر دیکھیں بھی۔ پھر وہ جلاپالی زیر زمین ٹرین سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور ماریہ نے اسے ریڈو جنگل میں چلنے والی گھٹیا سی سیاحتی ٹرین میں بٹھا دیا۔ یہ ٹرپ اس کے باپ کی طرف سے تھا تو مرضی بھی باپ کی بیٹی کی ہی چلتی تھی۔ اس کا ٹرپ تو خاک ہوا ماریہ البتہ تروتازہ ہو گئی۔

”ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔“ بہت دلوں بعد اس نے یہ جملہ دہرایا۔

”تمہارے جیسے شوہر مزے سے بندھے رہتے ہیں۔ نہ جاتے ہیں نہ جانے دیتے ہیں سر جھکائے نہ جاتے ہیں۔“

بہت ذہین تھی۔ اسے قائل ہونا پڑا۔ شاید ڈیڈ نے یہاں بھی کچھ کہا تھا۔ دنیا میں کسی ایک مرد کی تو وہ سنی تھی مگر۔ وہ مرد اس کا باپ تھا۔ اس لیے نہیں وہ مرد اس سے ہر حال میں محبت کرتا تھا اس لیے ہر انسان کو ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر حال میں اس سے محبت کرے اور گندے سندے راستوں میں صرف ایک محبت کا ہی راستہ ہوتا ہے جو گندے نکل باہر کرتا ہے۔ اب یہ اس محبت کے فلسفے اور اس پر ہے کہ وہ گندے کسے سمجھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کا سارا منافع عدن کی جیب میں ہی جاتا تھا۔

”آفر اچھی ہے۔“ ماریہ نے جوس کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

عدن کا خیال تھا وہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ وہ سنجیدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ سنجیدہ ہی تھی۔ اس نے پلان کر لیا تھا اور کیا خوب پلان کیا تھا۔

عدن کو لگا کہ اس نے کوئی عار اور دہانہ نہیں چھوڑا۔ اس ٹرپ میں وہ اتنی سنجیدگی سے ان سب کا جائزہ لیتی رہی جیسے ان پر کتاب لکھ رہی ہو۔ عدن میں موج مستی کا عنصر زیادہ تھا۔ اسے کنڈرات سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کسی زمانے میں اسے شوق ہوا تھا اجڑی عمارتوں کو دیکھنے کا۔ چند ماہ اس نے دل لگا کر دیکھیں بھی۔ پھر وہ جلاپالی زیر زمین ٹرین سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور ماریہ نے اسے ریڈو جنگل میں چلنے والی گھٹیا سی سیاحتی ٹرین میں بٹھا دیا۔ یہ ٹرپ اس کے باپ کی طرف سے تھا تو مرضی بھی باپ کی بیٹی کی ہی چلتی تھی۔ اس کا ٹرپ تو خاک ہوا ماریہ البتہ تروتازہ ہو گئی۔

”ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔“ بہت دلوں بعد اس نے یہ جملہ دہرایا۔

”تمہارے جیسے شوہر مزے سے بندھے رہتے ہیں۔ نہ جاتے ہیں نہ جانے دیتے ہیں سر جھکائے نہ جاتے ہیں۔“

بہت ذہین تھی۔ اسے قائل ہونا پڑا۔ شاید ڈیڈ نے یہاں بھی کچھ کہا تھا۔ دنیا میں کسی ایک مرد کی تو وہ سنی تھی مگر۔ وہ مرد اس کا باپ تھا۔ اس لیے نہیں وہ مرد اس سے ہر حال میں محبت کرتا تھا اس لیے ہر انسان کو ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر حال میں اس سے محبت کرے اور گندے سندے راستوں میں صرف ایک محبت کا ہی راستہ ہوتا ہے جو گندے نکل باہر کرتا ہے۔ اب یہ اس محبت کے فلسفے اور اس پر ہے کہ وہ گندے کسے سمجھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کا سارا منافع عدن کی جیب میں ہی جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اس کا اکاؤنٹ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ غلام علی غلام کے ساتھ اس نے ایک فیکٹری میں حصہ داری کر لی۔
”اپنے سر کے برابر ہو جاؤ تو مالوں۔“ وہ اسے ہمیشہ بڑا نارگٹ ہی دیتے تھے۔ سو میٹر کی ریس اس نے جیتی تو انہوں نے کہا۔

”پہلے نمبر پر ٹوکٹی بھی آجائے گا کوئی ریکارڈ بناؤ کہ کوئی توڑ نہ سکے۔“

جناب اتنا لباس حیدر اس کے سر! جس کا اپنا ایک ذاتی طیارہ تھا۔ امریکا میں پھیلی ہوئی اسٹورز کی چین تھی۔ اس لباس کے ملکوں میں گھر اور ایئر ٹنٹ تھے اور عدن کے باپ کے پاس صرف تین فیکٹریاں تھیں جو مختلف مشین آلات بناتی تھیں۔ صرف پاکستان کے دو شہروں میں دو بنگلے تھے ایک فارم ہاؤس تھا جس۔

ایک فیکٹری پر مقدمہ چلتا رہا تھا۔ اس مقدمے نے ان کی ساکھ خراب کر دی تھی۔ پیسہ الگ پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں کو خریداجا رہا تھا۔ بے نقص منصوبہ تھا آگ لگانے کا۔ بیس کمپنی کے تقیشی جاسوسوں نے پکڑ لیا۔ غلام علی غلام نے الٹا بیس کمپنی پر مقدمہ کر دیا۔ بیس کمپنی بھی سینہ ٹھوٹ کر میدان میں اتر آئی۔

یہ سب اس کی شادی سے پہلے ہوا تھا۔ بعد ازاں مقدمے کو کسی نہ کسی طرح ختم کروایا۔ فیکٹری کو نئے سرے سے کھڑا کیا۔ اسی فیکٹری کا آؤٹا مالک عدن تھا جس نے اپنے جیسے کے سارے پیسے اسپتال کے منافع سے دیے تھے۔

جب بھی ماریہ پر دورے پڑتے تھے جی تو اس کا چاہتا کہ مار مار کر اس کا حال برا کر دے۔ لیکن ایسی مار اس کا اپنا حال بدترین کر دے گی۔ اب وہ اپنے سر کو پیچھے رکھنا چاہتا تھا تو اسے ماریہ کو آگے رکھنا ہی تھا۔ ابھی ماریہ کو مارنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ شام کو اسی کے لیے وہ گھر جلدی چلا جاتا۔ وہ اس کے لیے کوئی گھر بھی کرکتی تھی۔ اس کے کپڑے ترتیب سے ہینگ کر دیتی تھی۔ اس کے خمرے بھی اٹھا لیتی تھی۔ وہ بھی لاؤ کر لیتا۔

لیکن اس سب کے دوران بھی وہ اس کے لیے ایک امتحان بنی ہوئی۔

عدن حسن پرست تھا اور کتنا بھی حسن پرست تھا عورت میں شرافت کا قائل تھا۔

وہ اندر سے ایک گھسا پٹا روایتی مو تھا۔ نیک سرتی کا تمنا کی شرافت اور حیا کا دلدادہ تقد کرے نہ کرے تعریف کرے نہ کرے پر تمنا کی ضرورت تھا۔ کالج میں اس نے ایک سے بڑھ کر ایک حسن کے عجوبے سے دوستی کی، فکرت کیا، لیکن ان عجوبوں کے قریب ہوتے ہی وہ انہیں مختلف فہرستوں میں درج کر لیتا۔ یہ فکرت کے لیے یہ صرف دوستی کے لیے یہ ہائے ہلو کے لیے یہ صرف مسکرا کر دیکھنے، کبھی کبھار بات کرنے کے لیے۔ یہ ذرا ذائقہ بدلتے کے لیے یہ ہلڑبازی کے لیے یہ بور ہوئے وقت فون پر بات کرنے کے لیے۔

ان میں سے ایک بھی ”یہ شادی کے لیے“ والی فہرست میں نہیں آئی تھی۔ امیر سے امیر ترین بھی نہیں۔ ایک، دو نے اسے بہت شوق سے اپنے خاندانوں سے طوایا، لیکن وہ ان سے مل کر بھی برے برے ہی رہا۔ ایسا بھی کڑا وقت اس پر نہیں آیا تھا کہ سیکنڈ ہینڈ کتابیں لے کر پڑھے اور اسے دو م پر کچھ ہند بھی نہیں تھا۔ نہ انسان، نہ حیوان، نہ چیزیں، نہ درجہ۔ اس کا ہر پیمانہ اول تھا۔ عورت کے پیمانے پر ایک اول اسے ملا تھا۔ لیکن دولت کے نمبر پر اس کے پاس آخری نمبر بھی نہیں تھے اور یہی اول اسے اکثر یاد آجاتا۔

جب وہ گرے ہوئے نمبروں والی ماریہ کو بوسے لیتے ڈرنک کرتے، ٹاپتے اور دوڑنے کی حالت میں دیکھا۔ اس کے منہ سے گندی گندی گالیاں سناتاب بھی۔ بس اسی لیے عدن نے ماریہ کو ایک نقطہ ہی بتا لیا تھا، تاکہ جب چاہے اسے کانڈ سمیت پھاڑ کر پھینک دے۔

جسمانی طور پر وہ کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار تھی کہ آئندہ چند سالوں تک وہاں نہیں بن سکتی تھی۔ عدن کے پاس یہی چند سال تھے اسے گرے ہوئے نمبروں

سے گرا ہوا بھی نہیں چلے سکتا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ چاہتا تھا کہ اگر ماریہ کے جی میں آئی تو وہ ہر پیمانے کو بالائے طاق رکھ کر مایں ضرور بن جائے گی۔ لیکن بھی ان کے دور میان بننے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

جیہا کی شادی شدہ زندگی کی چارج شیٹ سے غلام علی صاحب مطمئن تھے۔ عدن کے اکاؤنٹ سے ان کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ وہاں سے فیکٹری میں ایک منافع اکھرے سے دہرا لوز دہرے سے تین گنا ہوتے تھے۔

”میں ایک اور اسپتال کیوں نہیں بنوا لیتے؟“ ماریہ فون کی زندگی سیٹ تھی تو پیانے بروقت مشورہ دیا۔ اس نے وقت نکال کر اپنے سر سے ان کے آفس میں ملاقات کی۔ انہوں نے نہ تائید کی نہ انکار وہ بولتا رہا کہ ”سرا! آپ کے شو ز پالش کیے ہیں۔“

اور سر۔ سراٹھا کر ”ہوں“ بھی نہیں کہتے۔

جیہا ہفتوں بعد اسے معلوم ہوا کہ ماریہ کے نام ایک اسپتال کی گئی ہے۔ چند ہفتے اور گزرے تو اس کے سر سے اسپتال دکھانے لگے۔ عدن کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کانڈات ماریہ کے نام ہیں۔ اسے منافع سے فخر تھی۔ آگے کے اس کے پلانز بھی بہت کمال کے تھے۔ وہ کسی تیسرے شخص سے (در اصل خود) اپنے سر کے اسٹورز میں شیئرز لے گا۔ وہ ان ہی کے فون سے ان ہی کے کارڈ بار میں گھس جائے گا۔

اپنی لودھوری تعلیم مکمل کرنے کے لیے ماریہ نے لکھنؤ جانا شروع کر دیا۔ وہ ہسٹری میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اس کا تعلیمی سلسلہ چھوٹا تھا۔ اب ذہنی طور پر وہ کچھ بہتر ہوئی تو دوبارہ انڈیشن لے لیا۔ عدن کے اسپتال کو بھی سیٹ کرنے لگا۔ میڈ گھر کو بھی۔ بوسٹن میں سب ٹھیک تھا۔ پاکستان میں بھی سب ٹھیک تھا۔

بات وہاں سے بگڑ گئی۔ جب وہ ماریہ کے ساتھ ایک گھر میں چلا گیا۔ آج کل ماریہ بہت کم پارٹیز میں جاتی تھی۔ اس کی دوستوں نے اصرار کیا تو وہ اسے

ساتھ لے کر آگئی۔ وہ دونوں لور اس کی دو دوستیں ساتھ ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک دوست نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر کچھ کہا۔ ماریہ نے ذرا سا گردن کو ہموار کر پیچھے دیکھا۔

عدن نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ لیکن جھوم میں اسے تو کچھ نظر نہیں آیا۔

”ہو رہی ہوگی کسی کے لبوس یا جیولری کی بات۔“ اس نے خیال نہ کیا ماریہ کی جیسے حالت غیر ہو گئی۔ وہ رنگ بدلتے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اوپن ایر میں سکرٹے سستے جھوم میں اس نے کئی بار نظریں گھما کر اسے دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی۔ اس کی دوستیں بھی غائب ہو گئیں۔ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھنڈی ہو گئی۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے فون کیے لیکن وہ کال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ بہت دیر بعد اس کا میسج آیا۔

”میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہوں تم چلے جاؤ۔“

”تم ہو کہاں؟“

”تمہیں اس سے کیا؟“ بھڑکتا ہوا جواب آیا تو وہ گھر آیا۔ چند گھنٹوں بعد اسے بھی آجانا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ اگلے دن شام تک نہیں۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ اس نے اس کی مام کو فون کر کے بتا دیا۔ اب وہ اس کا کوئی الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔

”وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اسی کے ساتھ چلی گئی۔“ ازبک مام نے نہ جانے کس کس فرینڈ کو فون کر کے اس کا پتا کیا اور اسے بھی بتا دیا۔

اس کی طبیعت کو وہ جانتا تھا۔ رات کو وہ واپس آئی تو وہ بوچھے بنا رہا نہیں سکا۔ وہ الماری کھولے کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھی جیسے سناہی نہیں کپڑے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی۔ عدن کا جی چاہا کہ گردن سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹ دے۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔“

”کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”بیوی ہو تم میری۔“ اتنی مشرقی بات مغربی بیوی

کے سامنے۔
”تم بھی میرے شوہر ہو“ میں نے تو کبھی نہیں پوچھا۔“

دانت پر دانت جھاکر آواز کو دبا کر وہ بولا۔ ”تو پوچھ لیا کرو۔“

”مگر پوچھا تو بتانا بھی پڑے گا۔“ ایک تو یہ باپ بیٹی چلا کہ بہت تھے۔ ہر چیز کی حد بندی کیے بیٹھے تھے۔

”تم نہ بھی پوچھو تو نہیں یہ بتانا ہی پڑے گا تم کہاں تھیں کل رات ڈرنک کرتی رہی ہو اپنی حالت دیکھو گس کے ساتھ تھیں تم؟“

اب وہ سیدھی ہوئی ”بیباؤں“ آواز میں تسخیر بھی تھا اور اترا ہٹ بھی ”ریکس کے ساتھ تھی۔“

”تمہارا وہی ماڈل ہوائے فریٹس۔“

”کمال کی یادداشت ہے تمہاری۔“ تلی بجانے جیسا انداز۔

”تم اس سے ملیں؟“

”کیوں نہ ملتی دو سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔“

”رات بھر۔“ عدن کا سر گھوم گیا۔ وہ آزاد خیال ہے لاہور ہے، ڈھیٹ ہے پراگتی۔ وہ نہیں جانتا تھا جو کچھ شادی سے پہلے کیا۔ وہ اس پر ڈھیٹ بن گیا۔ بے غیرت ہی سہی۔ مگر ابھی وہ زندہ تھا۔ اس کی موجودگی میں اسے نہ کوئی ڈرنہ لگا۔ جو اصل تکلیف تھی عدن کو وہ بھی تھی کہ اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ وہ قدم بڑھا کر ایک زوردار پھڑپھڑ کے سفید گل پر مارا اتنی زور سے کہ وہ بل کھا کر نیچے گری۔ ہونٹ سے خون کی ایک باریک لکیر نکلی۔

”بے غیرت سڈیل!“ کچا جاتی آواز۔

فرش پر گرے سر اٹھا کر اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”میمی بیوی ہو کر تم رات بھر کسی اور کے ساتھ رہیں۔“

ٹانگوں کو سمیٹ کر وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ عدن غصے سے بل کھاتا ٹھٹھٹے لگا۔ اب وہ اس عورت کے ساتھ

اور نہیں رہے گا۔ بہت ہو گیا۔ ذلیل۔

سائمن بچنے لگا۔ عدن نے توجہ نہ دی۔ سائمن کی آواز قریب آتی گئی۔ ماریہ کمرے سے نکلی۔ لپک کر داخل دروازہ کھولا۔ دو پولیس آفیسرز اندر آئے۔ سائمن نے عدن کی طرف اشارہ کیا اور تیز تیز بولنے لگی۔ آفیسر نے بڑھ کر اسے جھکڑی لگائی۔

”ماریہ!“ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ میں بیوی کے جھکڑے گھروں میں نہیں رہتی۔ یہ امر کا ہے ”میں تیرا لباس تو میرا لباس“ یہاں یہ نہیں چلے طاقت کے بے دریغ اور غلط استعمال پر یہاں حدیں لگا دی جاتی ہیں مار کھا کر چھپ کر رو یا نہیں جاتا۔

ماریہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جھاکر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ جھلانے لگی۔

”چور بجائے شور۔“ اردو کا یہ فقرہ اسے بروقت یاد آیا۔ اس کے نزدیک چور صرف ماریہ تھی۔

پاکستان میں ٹاپ کرنے والے دیوانے کے باپ غلام علی غلام کو کانوں کلن خبر بھی نہ ہونے دی گئی کہ وہ جیل میں ہے۔ عدن کے وکیل نے اس کے سر کو بتایا۔ انہوں نے ماریہ سے بات کی اور جب وہ باہر آیا تو سیدھا ان ہی کے دفتر گیا۔ اس کا خون ابل رہا تھا اس گھٹیا عورت کے اس درجے کے گھٹیا پن پر۔ اپنا ہمدرد بنانے کے لیے اس نے انہیں ساری بات بتائی انہیں غیرت دلانا چاہی کہ ان کی بیٹی ساری رات کسی کے ساتھ تھی۔

وہ اپنی بیٹی کی طرح ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھ رہے جیسے ان کا بنگران سے احکامات لے رہا ہے۔ سگار پی رہے نہ تائید نہ انکار نہ مزید کی حوصلہ افزائی۔

”تم نے اسے مارا کیوں؟“ ساری بات سن کر بھی یہی پوچھا۔

”ہاتھ اٹھ گیا تھا میرا۔“ سوال اسے پسند نہیں آیا۔

”تم نے اس کی پوری بات سنی۔ وہ ریکس سے لی۔ اس نے سب کو ڈنر آفر کیا تو ساتھ چلی گئی وہ اور دوست

ہو گئے۔ رات وہ اپنی دوست کے پاس رک گئی اور قہقہے لگے بار۔“

سائمن کمرے میں غلطی عدن کی نکلی۔ پاکستان نہیں ہے۔ ”کیسا باپ تھا۔“

”مجھے فون کر کے بتانا چاہیے تھا۔ اس نے کہا جس کے ساتھ ساری رات۔“

”تو ساری رات۔“ کیا ساری رات وہ دوست باتیں کر رہے تھے؟ اپنے سر کی اس اعلا درجے کی مثالی بیٹی پر اسے بہت تاؤ آیا۔

”میں اس کا شوہر ہوں۔ احازت نہ لیتی جتنی تو سہی۔“

”میں اپنی بیوی کے ساتھ ریکس کے ڈرن میں نہیں جاتا تھا۔“ دراصل آج عدن نے سوچ لیا تھا کہ اس

بپ کو یہ بتا کر ہی اٹھے گا کہ اس کی بیٹی کے کروت کیا ہیں۔

”ہسپتال سے کتنا منافع آتا ہے تم اسے بتاتے ہو۔“

”اب آگے پیچھے سے اسے ہنر لگنے لگے۔“

”اور منافع کہاں جاتا ہے یہ۔“

”خاندان کا بھی نہیں تھا اس کا سر جو وہ اور غلام علی کے ساتھ بیٹھے تھے۔“

”اب سمجھ کر رہ گیا۔ ہر بار جواب ہو کر ہی اٹھتا تھا۔“

”میں ریکس اس کا صرف اچھا دوست ہے اور بس۔“

”اس کے تم ہی رہو گے۔ فکر نہ کرو۔“ جاندار

”میں اس کے اندر نفرت کی آگ جلنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ان دونوں کو اس نوبت تک لے آئے کہ وہ اس کے گھر کے چائیں اور وہ انہیں ہش ہش کرے ایسی

”میں اس کی شکست دے کہ دونوں انگلیں میں بیات لے کر ہل جائیں۔“

”میں ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی چپ رہ کر

”تھکا کر رہا تھا یہ سب جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ

جب وہ گھر آیا تو ٹیبل پر پاؤں رکھے ماریہ ٹیبل پالش لگا رہی تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔ وہ لی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ وہ اگلی ڈرننگ

گاہوں سے بلیو لائٹ گاؤں میں آئی۔ رولرز کھولے۔ میک اپ کیا اور ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔

عدن اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ ذہنی مریض بن جائے گا ماریہ کے ساتھ رہتے۔ اس کا لہجہ بھر کو جی چاہا کہ لات مارے سب پر اور بھاگ جائے۔ جیل ہو آیا تھا۔ سر کے ہنر کھا آیا تھا۔ پاکستان کے لائق فائق

خوبصورت لڑکے کا یہ حل ہو رہا تھا۔ خود کو مار مل کرنے کے لیے اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہن سے بات کی۔ پر وہ اور ڈسٹرب ہو گیا۔ اس کا جی کسی اور

کوئل کی آواز سننے کو چاہنے لگا۔

”تم تاؤ۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟“

”تم کیا کرو گی؟“

”میں دعا کروں گی۔“ کوئل نے بہت اعتماد سے کہا۔

”میں نے کبھی اپنے لیے دعا نہیں کی۔ کسی سے کیا کراؤں گا۔“ قہقہہ۔

”تم نے تو خود سے میری طرح محبت بھی نہ کی ہو گی۔“

یہ دعا بھی مجھے ہی کرنے دو۔“

”میں اتنا پاک اندہ ہی نہیں ہوں۔ پکا کیا نہ ہی ہی نہیں ہوں۔“

”اللہ کے تو ہو میں۔ اللہ کے بنائے۔ یاد بھی نہیں؟“

”عالم مت بنو۔“ اس نے آٹا کر فون بند کر دیا۔

ماریہ پہلے والی ماریہ بن گئی رات رات عتاب رہتی۔ کبھی کبھار ہی عدن کو اس کی شکل دیکھنے کو ملتی۔

”مر جائے۔“ اس کی طرف دھیان جاتے ہی وہ سوچتا۔

”چند سالوں کی بات ہے۔ صرف چند سال۔“

وہ کچھ دنوں سے ایک فون نمبر کو یاد کرنے کی کوشش

کر رہا تھا۔ لیکن ہر بار باؤسی ہی ہوتی، نمبر یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ نمبر بھول چکا تھا۔ جس سم میں وہ نمبر تھا وہ سم اس نے پاکستان میں اپنے ہاتھ روم کے فلیش میں بھادی تھی اور اب وہ نمبر یاد کرنا چاہ رہا تھا۔

آج اسے میاں جانا تھا اسپتال کے لیے کچھ آلات لینے۔ کلام تو ایک ہی دن کا تھا لیکن وہ ایک ہفتے کے لیے جا رہا تھا۔ بیگ لے کر وہ ایرپورٹ آگیا ابھی وہ کاونٹر تک نہیں گیا تھا کہ دو امریکن اس کے آگے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔ اپنے کارڈ نکال کر اسے دکھائے عدن کی آنکھیں کھل گئیں۔

”کھودا۔“ (ہمارے ساتھ آؤ)

”لیکن کیوں؟“ عدن حواس پاختہ ہو گیا ”امریکن پولیس اور سی آئی اے کی کہانیاں وہ اخبارات میں آنے دن پڑھتا تھا۔“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک نے کمر کے پیچھے اس کے ہاتھ لے جا کر لاک کیے اور اسے آگے دھکا دینے لگا دوسرے نے بازو پکڑ لیا۔

”میں نے کیا کیا ہے۔ کیوں لے جا رہے ہیں مجھے آفسرز؟“ اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

وہ دونوں گونگے ہوئے بنے اسے ساتھ لے کر کار تک آئے، سر پر ہاتھ رکھا کر اسے اندر دھکیلا اور کار چلا دی۔ وہ سارے راستے کیوں ”کیا“ کیسے جیسے سوال کرتا رہا کوئی جواب نہیں ملا۔

اسے ایک اندھیرے سیل میں بند کر دیا گیا۔

وہ اس وقت جیل میں ہے اس کا جرم کیا ہے۔ وہ نہیں جانتا جن دو لوگوں کے ساتھ وہ آیا انہوں نے اسے سیکرٹ سروس کارڈ دکھایا تھا۔

”یہ کیا مذاق ہے؟“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ رونے کے قریب ہو گیا۔ کیا یہ ماریہ نے کیا ہے، لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی، اگر چاہے بھی نہیں کر سکتی۔ امریکا میں ایسی فون کالز نہیں چلیں جن کے ملائے اور بات ہوتے ہی بے گناہ لوگ جیل میں دھر لیے جاتے ہیں اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اس جینے پر نہیں کہ ماریہ جیسی کر گزرے۔ اسے کچھ

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی کو یہ دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور اس کا سر کون ہے۔ بے خیالی میں وہ دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھا رہا۔ اب ان امریکن کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تو ٹھیک ہے یہ کلیئر کر لیں اس کا حساب صاف تھا چند گھنٹے اوچکنے کے بعد اسے پیاس لگی، لیکن پانی نہیں تھا اس کے ہاتھ پیچھے کمر بندھے تھے۔

وہ دائروں پر چلانے لگا۔ کٹنی دیر تک چلاتا رہا لیکن گھاڑ آواز سیل میں ہی گونجتی رہی۔ اس کا حلق ٹوڑ خٹک ہو گیا۔ رات تک چلانے کی ہمت بھی جاتی رہی صبح تک وہ صوک اور پیاس سے فرش پر جھک گیا اٹھ کر بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ سیل کے اندر کوئی نہیں آیا۔ نہ ہوا نہ پانی نہ کھانا نہ انسان۔

اس کے پیٹ سے آوازیں آنے لگیں دوبارہ نیم بے ہوش ہوا، غنودگی طاری ہوئی لیکن غینہ نہ آئی۔ گزرتے گزرتے بل کھنٹے بن کر ایک اور پورے دن میں ڈھل گئے۔ شام ہوئی رات آئی۔ پیاس سے اب وہ بالکل مرنے کے قریب تھا۔ اب وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی ایک قطرہ پانی پر لٹا سکتا تھا۔ کسی کا قتل کر سکتا تھا ایک بوند کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا اس نعمت کی قدر اسے آج سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ صرف دو دنوں میں ہی وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے، کتنا لائق فائق ہے، کتنی فیکٹریوں کا مالک ہے، وہ آج کا آئندہ کا بھول گیا، لیکن حیرت انگیز طور پر اسے گزشتہ سے پیوستہ یاد آئے لگا۔

چند اور گھنٹے گزرے۔ رات گہری ہو گئی۔ وہ فرش پر ہی اودھ مو پڑا رہا۔ ہونٹ سوکھی لکڑی کی مانند ہو گئے اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ اٹھ کر چلائے۔ لیکن اٹھ نہ سکا، باقاعدگی سے ورزش کرنے والے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا کمزور ہے۔ کچھ باتیں بہت چھلاک ہوئی ہیں وقت آنے پر ہی کھلتی ہیں۔ بھلے سے پہلے کتنے بھی تجربے کر لو رکھ لو۔ حساب کتاب لگا لو۔ جب کھلتی ہیں تو ہی اصل پرکھ دیتی ہیں۔

جب وہ پیاس سے بالکل مرنے کے قریب ہو گیا تو

اس کے سیل کا دروازہ کھلا۔ دو لوگ اسے اٹھا کر لے گئے ایک کرسی پر بٹھلایا گیا اس کمرے میں دو تیسرا شخص اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لایا۔ ”ہو آؤ“ (کون ہو تم) پیاس سے مرنے کے قریب عدن کو کچھ اندازہ ہوا کہ اس سوال سے اس کا مطلب کچھ اور ہی ہے۔

”اکثر عدن۔ ہرمنڈ آفس۔ سن آفس۔“ ایک گھونسا اس کے جڑے پر آکر لگا۔ ”ہم نہیں چاہتے ڈاکٹر اٹون سن آفس غلم علی غلم۔ نام نہیں دے سکتے۔“

جڑے پر بڑے گھونے کی تکلیف سستے بند ہوتی گھونوں کو بمشکل اٹھاتے اور سوکھے حلق کی تکلیف کو سہنے اس نے اس سب پر غور کرنا چاہا کہ اگر وہ اتنا کچھ جانتا ہے تو اس سے پوچھ کیا رہا ہے۔ اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کے منہ کے ساتھ پانی لگا دیا جیسے ہی اس نے زبان سے پانی اندر کیا پانی ہٹا لیا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو۔“ وہ

میں کے سامنے چند تصویریں ایک ایک کر کے لائی گئیں۔ چند قطرے ہی اس کے حلق میں گئے تھے۔ ”ابھی بھی گھوم ہی رہا تھا تصویریں دیکھ کر بھی اس نے نہیں دیکھیں۔ ایک اور گھونسا جڑے پر آیا۔“

”وہ گھو انہیں کون ہیں؟“ اس نے آنکھیں پوری کھول کر غور سے دیکھنا چاہا۔ ایک کو دیکھا دوسرے کو دیکھا۔ تیسرے کو دیکھا۔ وہ

”میں نہیں جانتا انہیں۔“ اس نے نہ میں گردن ”غور سے دیکھو انہیں۔“

اس نے پھر غور سے دیکھا۔ وہ ایک اور گھونسا کھانا کھاتا تھا ایک کی شکل کو اس نے ذرا سا پہچانا لیکن

یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا۔ ”میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔“ اس نے صاف صاف بتا دیا۔

”گھٹ۔ باقی بھی بس اگلے دو۔“ ”میں نے اسے نہیں دیکھا ہے اور بس۔ میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“ ”یہ تمہارا سا بھائی ہے۔“

”میرا سا بھائی؟“ آوازیں اسے دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بہت قوت لگا کر بول رہا تھا۔ ”یہ ہمیں مطلوب ہیں اور یہ تمہارے ساتھی ہیں۔ کہاں ہیں یہ؟“ اس نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

”میں انہیں نہیں جانتا۔ یہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔“ وہ مسام مسام بھیک گیا۔ ”یہ تمہارے ساتھی ہیں۔“ وہ اس کے کان کے پاس منہ لاکر چلایا۔ جیسے وہیں سے گردن میں دانت گاڑ دے لگا۔

”میں انہیں نہیں جانتا۔“ اس نے بھی زور لگا کر چلانا چاہا۔

”یہ تینوں تمہارے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔“ اس نے بند مٹھی کا ایک اور گھونسا تیار کیا۔

بجلی سی کوندی اور عدن کو یاد آیا کہ اس نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک اس کا مریض تھا۔ ہاتھ کا زخم لے کر ایک بار آیا تھا۔ زخم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے عدن کو اچھی خاصی رقم دی تھی اور خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔ عدن نے رقم رکھ لی اور علاج کر دیا۔ چند ہفتوں بعد اسی شخص کا حوالہ دے کر وہ اور لوگ گمراہ پیٹ کے ویسے ہی گہرے زخموں کے لیے اس کے پاس آئے تھے۔ یہ تیز دھار چاقو کے زخم تھے۔ رقم اس بار بھی زیادہ ملی اور عدن بھول بھی گیا کہ ایسا کوئی اس کے پاس آیا بھی تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ وہ امریکا میں ہے اور وہاں کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ وہ تینوں سفید فام تھے۔ غیر مسلم تھے۔ لیکن ان کا تعلق مشرق وسطیٰ کی خفیہ تنظیموں سے تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”ہاں۔ یہ میرے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔“ عدنان نے سب سے پہلے بتا دیا۔ یہ بھی کہ ان سے بہت پیسے ملے تھے لیکن اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

اس پتلے سے باڈی گارڈ ٹائپ آدمی کے چہرے پر مسخراہٹ۔

”کہاں ہیں وہ اب؟“
”میں نہیں جانتا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میں قسم کھاتا ہوں یہ خود میرے پاس آئے تھے۔“

”کون ہیں وہ؟ تمہیں کہاں ملے۔ تمہارا رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ سوال پر سوال پوچھنے لگا۔ اس کے اعصاب رچاوی ہو چکا تھا۔

”میں قسم کھاتا ہوں میں نہیں جانتا۔“ عدنان کی آواز رندہ گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے اس پاس شرارے نظر آنے لگے۔ نیم اندھیرے میں رقص بکس۔ زخم خوردہ نیند میں جان کیوا خواہ۔

”تم ان کے ساتھ ہو۔ تم ایک دہشت گرد ہو؟“
وہ اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ امریکی جیل میں ایک امریکی کے سامنے مردوں کی طرح بیٹھا وہ کی دعا کر رہا تھا کہ وہ اس پر ”دہشت گرد“ کا ٹیٹل نہ لگا دیں۔

اخباروں میں بڑھی گئیں ”ٹی وی میں دیکھی گئیں خبریں اس کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ اس پر بیان سے باہر دہشت طاری ہو گئی۔ وہ صرف تفتیش نہیں کر رہا تھا اسے دہشت گرد ثابت کر رہا تھا۔ اس سے منوار رہا تھا۔

اس نے ایک غلطی کی تھی ان سے زیادہ رقم لینے کی اور اسی لالچ کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ جیسے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی وہ امریکی سیل میں بھی ہو گا۔ ایسے ہی اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر آئے گا بھی کہ نہیں۔

اب اسے ماریہ یاد آ رہی تھی۔ اس کی بیوی تھی۔ اسے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور وہ ضرور کرے گی جب غلام علی غلام کو اس کے اندر ہونے کی خبر ملے

گی تو وہ بھاگے چلے آئیں گے اپنے سارے اثر و رسوخ استعمال کر لیں گے اور اس کے سرورہ کیسے برا اثر کریں گے کہ ان کا دماغ ان کی اکلوتی بیٹی کا شوہر جیل میں رہے۔

وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔ جلد ہی۔ اتنی دولت۔ اتنے تعلقات کب کام آئیں گے۔ وہ ایک بڑھا لکھا برا من شہری ہے ڈاکٹر ہے مسیحا دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ اس کے حق میں بہت سے ثبوت ہیں گے۔

جیل آنے کے آٹھ ماہ بعد اس نے بیرونی دنیا کے جس پہلے شخص کو اپنے پاس پایا۔ وہ اس کا وکیل عبدالعزیز تھا۔ سیاہ فام امریکی مسلم تھا۔ اس کے سامنے وہ دیر تک گم مسم بیٹھا رہا۔ عزیز اسے بتا رہا تھا کہ کن مشکلات سے اس سے یہ ملاقات ہو پائی ہے۔

”پاپا نہیں آئے؟“ اس کا پہلا سوال ہی تھا۔ وہ لاغر کمزور ہو چکا تھا۔ یہ جسمانی بات تھی۔ وہ اندر سے کیا کچھ ہو چکا تھا۔ یہ دوسری بات تھی۔

”وہ نہیں آسکتے۔ تم سے صرف میں ہی مل سکتا ہوں۔“

”کہاں ہیں وہ؟ انہیں آنا چاہیے تھا۔“ ہر چیز کو ممکن کرنے والے لپٹا کے لیے یہاں آنا کیا مشکل تھا۔

”وہ امریکا میں نہیں ہیں۔“

”پھر کہاں ہیں؟“ اسے اپنے جیل آنے سے زیادہ صدمہ اس بات کو جان کر ہوا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے پاس امریکا میں نہیں ہیں۔

”میرے پاس وقت کم ہے۔ تم مجھے ہر بات بتاؤ۔ میں نے جتنی بھی معلومات اکٹھی کی ہیں وہ ناگفتی ہیں۔“

”میرے پاپا کہاں ہیں؟“ بھاڑ میں جائے اس کا کیس۔ اسے اپنے باپ کی فکر تھی کیس۔ وہ دہشت گرد پاکستان میں ہیں۔ مجھے انہوں نے عید پاکستان سے باز کیا ہے۔“ اس نے تحمل سے جواب دیا۔ جب

”کیس پر بات کریں۔“
”پاکستان میں۔“ اسے ایک اور صدمہ ملا۔ وہ جیل میں لوڑ اس کا باپ پاکستان میں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو پہلی فلائٹ لے کر یہاں بھاگے چلے گئے ہوں گے۔

”وہ ٹھیک ہیں؟ ٹھیک ہیں وہ؟“ وہ صدمے سے بڑھ کر قریب تھا۔ ”وہ زندہ ہیں نا؟“ وہ سمجھا اس کے صدمے نے ان کی جان لے لی ہوگی۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں میری ان سے یہاں آتے ہیں بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم گھبراؤ۔“

اس بات پر وہ الجھ گیا۔ ”وہ خود کیوں نہیں یہاں آتے۔“

”وقت ختم ہو رہا ہے۔ اپنے کیس سے متعلق بات کرو۔“ وہ جھنجھلا گیا۔

”پاپا عدنان نے اسے ایک ایک بات شروع سے آخر تک بتادی۔“

”ان کے پاس ویڈیو بھی ہے۔ ان تینوں کی“
”ہے اسپتال میں آتے وقت کی۔ وہ رات گئے تھے تقریباً منہ چھپا کر۔“

”عزیز نے اس سے کافی باتیں کیں۔ جاتے ہوئے ان نے تسلی کے نام پر دو لفظ نہیں کہے شاید وہ جھوٹی دیکھ بھالوں میں سے نہیں تھا۔“

شروع کے دنوں میں وہ چیخا چلاتا رہا تھا۔ سوال پر جواب نہ دیتا تھا۔ پھر بار کھاتا تھا۔ کئی کئی دن بھوکا رہا جاتا تھا۔ پھر اسے جب لگ گئی۔ اب وہ بنا آواز اور آنسو سے نہ نیند آجاتی تو شکر کرتا اور نہ جاگتا رہتا۔ ٹی وی پر کبھی ڈاکو منٹریاں اسے یاد آنے لگتیں۔ اب وہ بھی ان سے ہمیں نکل سکے گا۔ پہلے ہی ہفتے اسے یقین ہو گیا۔

”اس نے باہر آنے کی امید چھوڑ دی۔ وہ صرف موت کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنی قید کے دن گنے لگا۔ اب عزیز اس کے پاس رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔

اس کا اسپتال سیل ہو چکا تھا۔ اکاؤنٹ فریز کر دیے

گئے تھے۔ غلام علی غلام کو ان کے پاکستانی وکیل نے مشورہ دیا تھا کہ ان کا امریکا جانا ٹھیک نہیں۔ ”سی آئی اے“ کی تحویل میں وہ بھی آسکتے ہیں۔ ایسا سو فیصد ہو سکتا تھا۔ انہیں پاکستان ہی رکنا پڑا۔ وہیں سے ساری کوششیں کرنی پڑیں۔ اسپتال کے فروخت ہوتے ہی ساریہ اور اس کے خاندان پر بھی کڑی نگرانی رکھی گئی تھی۔ کئی ہفتے ان سے تفتیش ہوتی رہی تھی۔ آغا عباس حیدر کو اسٹورز کی ساری چین ہاتھ سے نکلتی دکھائی دی۔ ان کی اپنی امریکی قومیت خطرے میں پڑ گئی۔

اس موقع پر وہ رپورٹ کچھ کام آئی جو ماریہ نے عدنان کے پتھر پر کردہائی تھی اور پولیس عدنان کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ ماریہ کی مام ڈیڈ اور اس کے اکلوتے بھائی نے اپنے وکیل کے مشورے پر صاف صاف یہ بیان دیا کہ وہ اس کی علوات اور حرکتوں سے پہلے ہی سے تنگ تھے۔ وہ خود اس کی طرف سے مشکوک تھے۔ اس کے رویے سے تالاں تھے۔ وہ اسے نہیں جانتے۔ وہ پاکستانی تھا۔ وہ امریکا میں رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا تعلق کن کن لوگوں سے تھا۔

آغا عباس حیدر زیادہ گھاک تھے۔ انہوں نے جھوٹی چھوٹی اور کئی باتیں سوچ کر گم کر سنائیں۔ انہیں بس اپنی جان چھڑوانی تھی۔

ساتھ ہی ماریہ نے عدالت میں طلاق کے لیے درخواست دائر کر دی۔ ازبک مام نے اسے لاپٹی اور پیسے کا رسیا ثابت کرنا چاہا۔ وہ ایک لمبے عرصے سے امریکا میں رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امریکا میں کسی مسئلے سے کیسے نکلنا ہے۔

عدنان کے خلاف ڈھیروں بیانات اکٹھے ہو گئے۔ ”اس کا ساتھ دینے کے بجائے تمہاری بیٹی اس سے طلاق لے رہی ہے۔“ بیوی کو گرل فرینڈ بنا کر رکھنے کا مشورہ دینے والے لپٹا یہ شکوہ کر رہے تھے۔ ”یہ فیصلہ وہ پہلا پتھر کھانے پر ہی کر چکی تھی۔“ امریکیوں سے پہلے انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ دہشت گرد ہے۔

”اس کی مدد کرنے کے بجائے تم یہ سب کرو گے مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی اور نہیں تو دوست کا بیٹا ہی سمجھ لو اسے۔“

”اس کی مدد کے لیے تم کیوں نہیں یہاں آ جا۔ تم باپ ہو تم اس کے۔“

”قانونی باپ تو تم بھی ہو اس کے۔“

”میں صرف ماریہ کا باپ ہوں اور اسے وہ مارتا رہا ہے۔ کتنے لالچی ہو تم لوگ اس کے اکاؤنٹ سے پیسے تمہارے ہی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتے رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے نے تو یہاں ڈالر کی فیکٹری لگا رکھی تھی وہشت کرو ہے۔“

”نہیں ہے وہ وہشت کرو۔“ وہ غصے سے کھول اٹھے۔

آغا جی نے جتنا قہقہہ لگایا۔ ”ماں لویہ بات؟ امریکی غلط نہیں ہوتے اگر غلط ہوں تو بھی اسے غلط نہیں رہنے دیتے۔“

”تم نے پھنسا دیا ہے اسے۔“ فون کے پار وہ دھاڑے۔

”مجھے اس چوہے کو پھنسانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی مڈی کو میں پیروں تلے بھی نہیں پکھلتا“

چوہے کے لیے سیر کا تجربہ ہونے لگا۔

”اسی مڈی کے ساتھ تم نے اپنی کل گرل بیٹی کو بیاہ دیا۔ جس پر ہر امریکی تھوک گیا تھا۔“ ان کا بس نہیں چل رہا تھا آغا کی گردن دیوچ لیں۔

”اس تھوکی ہوئی کو تمہارے بیٹے نے کیوں چاٹا آخر۔“ آغا نے بہت آرام سے پوچھا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد عدن سے متعلق آنے والی کوئی فون کل ریسیونہ کی گئی۔ ماریہ کو امریکا سے باہر بھیج دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد خود بھی فرانس چلے گئے۔ اپنے بزنس کو وہ کہیں سے بھی ہینڈل کر سکتے تھے۔

ماریہ نامی باپ آغا نامی دولت کو بہت شان و شوکت سے عدن کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ بہت محوم و دھڑکا تھا ان کے نام اور دولت کا عدن اور اس کے باپ کے لیے

ایک سال آٹھ ماہہ مشران ناموں کا بہت ڈنکا بجاتا تھا۔ رنگ ماسٹر غلام علی غلام نے بہت لمبی پلاننگ کی تھی۔ دونوں دوست تھے ساتھ ساتھ پڑھے تھے آغا امریکا چلے گئے۔ غلام علی نے اپنے باپ کا دوبارہ سنبھال لیا۔ ٹھہرے میں آغا کہاں سکھماں جا بیٹھے اور غلام علی صرف تین فیکٹریاں ہی بنا سکے۔ جس طرح وہ اپنے بیٹے کو بڑے بڑے ٹارگٹ دیتے تھے۔ اسی طرح اپنے لیے بھی بڑے بڑے ٹارگٹ ہی رکھتے تھے اور ان کا ٹارگٹ آغا کو ٹ کرنا تھا۔ لیکن ایسا ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے امریکا چکر لگاتے رہتے۔ آغا پر قریب سے نظر رکھتے ماریہ بھی ان کی نظر میں تھی اور اس قریب کی نظر میں ہی وہ جان گئے کہ ماریہ جیسی لڑکی ان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ بہت ہی مشکل ہے کہ کرے گی تو اپنی مرضی سے ورنہ کوئی اسے عدن کے لیے منا نہیں سکے گا اور آغا کیوں عدن کی طرف جھکے گا۔ ساتھ ساتھ غلام علی نے دو تین اور خاندانوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آغا عدن کی طرف جھک ہی گیا۔ ماریہ انہیں مل ہی گئی لیکن پھر بھی کیا ہوا۔ آغا خود کو بچا کر ایک طرف ہو گئے۔ بیٹا تو ان کا ہی گیا۔

غلام علی کو یقین تھا کہ اس سب کے پیچھے آغا کا ہاتھ ہے۔ آغا نے کسی حسد یا جلن میں عدن کو پھنسا دیا ہے۔ کوئی بدلہ لیا ہے۔ غلام علی سے۔ اور غلام علی دھوکا کھا گئے۔ آغا سارا الزام دھرتے وہ اس آگ کو بھول گئے جو چلتی فیکٹری میں لگا کر بھڑکائی گئی تھی۔ فیکٹری دیوالیہ ہو رہی تھی۔ انہیں پیسہ کی رقم چاہیے تھی۔ فیکٹری کو حادثے کی ضرورت تھی۔ اس حادثے کا منصوبہ انہوں نے بنالیا۔ غلام علی، عدن، عدن کے بھائی، ان کے چند دوستوں نے مل کر مکمل کا منصوبہ تشکیل دیا۔ چلتی فیکٹری دن کے وقت پچاس ورکرز کی موجودگی میں آگ بھڑکی اور فیکٹری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس آگ نے کیا کچھ نہیں تباہ کیا تھا۔ صرف غلام علی غلام کو ہی تباہ نہیں کیا تھا دس نو عمر لڑکے مجلس کر

ایک غریب زندہ رہے وہ جگہ جگہ سے مجلس گئے تین تین منٹوں کے وقفے سے مر گئے۔ کہتے ہیں آگ کا جلا نہیں چھا جو مر گئے تھے ان کے گھر والے پیچھے سے مر گئے کسی کا جوان بھائی گیا، کسی کا شوہر کوئی تین تین عیم کر گیا کوئی سات۔

مرنے والے مر گئے۔ فیکٹری بند ہو گئی۔ باقی ماندہ لوگ مار ہو گئے۔ امداد کے نام پر ان کو ایک روپیہ نہ دیا گیا نہ علاج کروایا گیا نہ کھانے کو دیا گیا، فیکٹری میں کمرے والے پچاس ورکرز اپنی موت اور آگ سے بچنے والے پر روز کی طرح کام کرنے آئے تھے ان سے کئی بعد ازاں دس کے مریض بن گئے۔ ان کے ساتھ یہ سب اچانک ہوا اور بھانک ہوا۔ اتنے دن بیٹوں، شوہروں، باپوں کو نگل لینے والا غلام علی غلام نے صرف ایک بیٹے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ آغا کے کہے ان کے اندر ایسی آگ بھڑکی تھی کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کے سینے پر چڑھ کر اس کا کیجہ کچا کر لیں۔ لیکن وہ بے بس تھے۔

غلام علی غلام کو اب اپنی طاقت اور حیثیت کا اندازہ رہا تھا۔ زندہ لوگوں کو جلانے والے کاغذ کے ٹوٹے چھوڑنے والے فرعون بنتے ہیں، بھول جاتے ہیں پھر کا جواب گھونٹنے سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔

غلام علی غلام کا بس نہیں چل رہا تھا ایک ایک امریکی کو خرید لیں لیکن نہ ان کے پاس اتنے پیسے تھے۔ نہ ہی سارے امریکی بک رہے تھے امریکا وہ جانتیں گئے تھے ان کے وکیل نے سختی سے منع کیا تھا۔ عدن کے اکاؤنٹ سے پیسے انہیں ہی ٹرانسفر کیے جاتے رہے تھے انہیں بھی وہشت کرو سمجھ لیا جائے گا پاکستان سے ہی انہوں نے ایک قاتل وکیل کو ہار کیا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود عدن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کس ریاست، کس شہر، کس جیل میں، کوئی بھی انہیں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آٹھ ماہ غلام علی غلام نے جتنے کونوں پر گزارے

پیسہ پانی کی طرح جاریا تھا۔ وہی پیسہ جو پانی کی طرح کمایا گیا تھا۔ وہ ہر وقت عزیز سے رابطے میں رہتے تھے۔ عدن سے ملاقات کی روداد سن کر غلام علی غلام روئے کے قریب ہو گئے۔ انہیں ایسا وقت بھی دیکھنا تھا۔ ان کا دیوتا غلام بٹھایا گیا تھا۔ ان کے بار بار پوچھنے پر بھی عزیز نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہو گیا تھا۔ وہ کیس ہی ڈسکس کرتا رہا۔ عزیز نے انہیں ایک فیصدی بھی اس نہیں دلائی تھی کہ اس کا کیس مضبوط ہے اور وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

”سب کچھ اس کے خلاف ہے۔ اس کے پاس اپنے حق میں ثابت کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”وہ بے قصور ہے۔“ غلام علی کے پاس صرف یہی ایک دلیل تھی۔

”اس نے ان سے پیسے لیے تھے۔“

”وہ پیسے علاج کے لیے تھے۔“

”وہ پیسے ان کی شناخت کو چھپانے کے لیے تھے۔“

عدن نے رات گئے اپنے آفس میں تھکا نہیں ڈیل کیا۔ ان کا علاج کیا اور۔۔۔

”وہ پھر بھی بے قصور ہے۔ وہشت کرو نہیں ہے۔ ان کا ساما بھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے وہ۔ تم اسے جلد سے جلد باہر نکلاؤ، جتنا چاہے پیسہ لگے، میں دلاں گا۔“

”پیسہ نہیں۔ ثبوت چاہیے، یہاں پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پیسے سے سب ہو جاتا ہے۔“ غلام علی کے پاس ایک ہی حل تھا پیسہ۔

عزیز چپ ہی رہا۔ سوچنے لگا، کیسا انسان ہے بات سمجھ ہی نہیں رہا۔ پیسہ پیسہ کر رہا ہے جیسے قانون میری جیب میں ہے۔ عدالت میرے حکم سے چلتی ہو اور میں وکیل نہ ہوں۔ کوئی دکان دار ہوں کہ سب خرید کر دے دیا۔ دوا لے ہی مشرقی لوگوں سے اس کا واسطہ پہلے بھی پڑ چکا تھا لیکن اس بار اسے حیرت تھی۔ کیونکہ غلام علی مسلمان تھا۔ وہ خود بھی مسلمان تھا۔ اس شخص کے ساتھ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے رابطے میں تھا

اور اس کی کسی ایک بھی بات نے عزیز کو متاثر نہیں کیا تھا۔ بہر حال یہ اس کا پیسہ تھا اور اسے دل جمعی سے کام کرنا تھا۔ وہ ففوفے سے اس کی کئی ملاقاتیں عدین سے ہوئیں۔ اب وہ کچھ سنبھل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

”تم دوبارہ ان سے کبھی ملے؟“

”نہیں، کبھی نہیں، پھر کبھی نہیں۔“

”ان کے نام بھی نہیں جانتے؟“

”نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کچھ مدت پوچھو صرف علاج کرو۔“

”برائے مولائی مجھے ایک بار پھر سے یاد کر کے بتاؤ۔“

وہ تم سے کہیں اور ملے یا دوبارہ تمہارے پاس آئے یا تمہیں فون کیا؟“

”میں کتنی بار بتا چکا ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔“

”تمہیں اپنے اعصاب قابو میں رکھنے چاہئیں۔“ عزیز نے قہقہے سے کہا۔

”کچھ بھی میرے قابو میں نہیں ہے۔“ وہ چڑ گیا۔

”کثرت باتیں بے معنی نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ بے حد اہم ہوتی ہیں۔ اگر وہ تیسری چوٹی بار تمہارے قریب سے بھی گزرے ہوں گے تو میرے لیے تمہارے کیس کا دفعہ مشکل ترین ہو جائے گا۔“

عدین نے اپنی سوچوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ بہت باریک بینی سے پھر سے اپنی یادداشت کا جائزہ لیا۔

”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں انہیں جانتا ہی نہیں۔ وہ میرے پاس خود آئے تھے۔“

”یہ نہیں مانیں گے، تم نے ان کی شناخت رجسٹرڈ نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی۔“

”یہ کیسے نہیں مانیں گے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں، پولیس والا نہیں کہ علاج سے پہلے تفتیش کروں۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے ان کے ناموں کے اندراج نہیں کیے۔ ان کے زخموں کی نوعیت کو چھپایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان کا ساتھ ہی ہوں یا دہشت گرد ہوں۔ مجھے میرے حصے کی سرپرستی چاہیے۔“

مگر اتنی بڑی سزا نہیں۔“

”یہ دلائل توجہ کے سامنے ہی سامنے جائیں گے۔“

اس جواب پر عدین غصے سے عزیز کو دیکھ کر رہ گیا۔

”اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو جو دقت پڑنے پر چھکی بھی دے اور ہاتھ پر دھکا کر گڑھے سے بھی نکل سکے۔ اپنی پشت پر یہ ہاتھ تمہیں خود مانا ہو گھسیٹ من و سلوکی نہیں کہ پیچھے ہٹ جائے۔“

عزیز کی بات درست تھی مگر پشت پر چھکی دینے والا وہ ہاتھ اسی پشت کو کنویں میں لور پیچھے دھکا دے کر جا چکا تھا۔

اس کا اپنا سا باپ امریکا کے ڈر سے امریکا نہیں آ رہا تھا۔

”مرکبات تو بہت سے ہیں۔ یہ بھی کہ مقدمہ عدالت تک جائے گا ہی نہیں اور یہیں کہیں تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔“

ایک اور تیز نگاہ اس نے عزیز پر ڈالی کچا کھا جانے والی۔

”یہ کیا کیسے کر سکتے ہیں۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ پڑھا لکھا ایسے کیسے؟“ وہ چلایا۔

عزیز نے خاموش رہائی مناسب سمجھا۔

”تمہاریسے کے ڈیڈ سے رابطہ کرنے کی کوششیں کرو بہت سے سرمایہ دار ان کے دوست ہیں۔ بڑے بڑے لوگ ان کے گھر آتے جاتے ہیں۔ کچھ قانون دان بھی ان کے جاننے والے ہیں۔ میڈیا سے روابط ہیں ان کے۔“

”جو بیانات انہوں نے تمہارے خلاف دیے ہیں مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہاری کوئی بھی مدد کریں گے۔ مگر پھر بھی بڑائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“

”ماریہ سے بات ہوئی تمہاری؟“

”اس کے کوئل سے ہوئی تھی۔“

عدین نے تین چار غلیظ گالیاں ماریہ کے نام کی امریکی قانون دانوں کو گالیاں دینے لگا۔ جنہوں نے اس جیسے شریف بڑے لکھے انسان کو قید کر لیا تھا۔

پھر گیارہ ماہ گزر گئے۔ کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

اس کی منت ساجت پر آگیا۔

”میں کوشش ہی تو کر رہا ہوں عدین!“

”مجھے یہاں سے نکالو، پلیز کچھ کرو۔“ اس نے

”میں میں شرم محسوس نہیں کی اور عزیز کے سامنے نہ لگا۔“

”مگر تم پر کچھ ثابت نہ ہو تو تم ضرور باہر آؤ گے۔“

”مگر ثابت ہو گیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا۔ پھر۔“

”ٹیک اسٹ ایزی پلیز۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”مجھے کون سے گناہ ثابت کرے گا۔“

”میں کوشش کروں گا کر رہا ہوں۔“

”کوئی میری ضمانت بھی نہیں کروا سکتا؟“

عزیز کو اس کے بھولپن پر مسخرانہ ہنسی سی آئی۔

”ایک تو ایسا بھی تمہیں ضمانت پر رہا نہیں کروا سکا۔“

”پھر کون کروا سکتا ہے؟“ اس وقت وہ پاگل پن کی حد کے قریب تر تھا۔

عزیز نے کندھے اچکائے پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

”خدا۔“

”خدا! عدین بڑبڑایا۔ جیل میں رہتے بھی اس نے بھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ وہ کھ میں ہی سی۔“

”خدا کا نام آتا ہے اسے مل ہی جاتا ہے۔ عدین کو لگتا آتا نہیں تھا۔ جسے آتا تھا اس کا دعوا تھا اسے سب مل جاتا تھا۔“

”تم ایک کام کرنا عزیز۔ پاپا کو فون کرنا غور سے کرو۔ گناہ گناہ کلی نیلا گنبد کلی نمبر چار میں جائیں۔ سبز رنگ کے دروازے والے گھر میں آواز دے کر کہیں گے آزاد کروادے۔ صرف ایک اور احسان کرو۔“

”خدا کا نام آتا ہے اسے مل ہی جاتا ہے۔ عدین کو لگتا آتا نہیں تھا۔ جسے آتا تھا اس کا دعوا تھا اسے سب مل جاتا تھا۔“

انار کلی خیلے گنبد سے اندر رہا تھی آبادی میں پہلی سڑک سے نکلتی گلیوں میں دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں جو بند بھی ہے اور تنگ بھی اور جس میں صرف دو ہی گھر ہیں جس میں سے ایک گھر میں وہ رہتی ہے افق کشمیری حسن والی خشک میوے کے ڈھیر پر مسخ کشمیری سبب سی وہ اس وقت فرمایا رہی تھی۔ سب کچر دم اٹھ کر گھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ لکڑی کے چوڑے تختے نما چوکی کے سامنے چوڑی جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سرتک چوڑی ایسے ہی جی رہی۔ پانی کا جگ بھر کر وہ اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔ تاکہ دوسرے پہلے اٹھنا نہ پڑے۔ گھنٹوں سے پوست چوڑی لمحے بھر کے لیے کھلتی تو درد کی لہرس نکلتیں، پھر دوبارہ بیٹھنے میں درود ہوتا۔ وہ ٹھیک دو بجے اٹھ جاتی۔ روٹی پکائی، سالن پکائی۔

اب سب آتے جائیں گے کھانا کھاتے جائیں گے۔ پہلے اسد اور جمل آئیں گے کھانا کھائیں گے اور بڑھنے بیٹھ جائیں گے۔ ان سب کے پاس ایک ہی چیز کی کمی تھی وقت کی ورنہ فارغ وقت میں وہ پہاڑ بھی کھودنے بیٹھ جاتے۔ سارے وقت میں وہ بس کام ہی کرتے رہتے۔ روٹی پکانے اور کھانے میں صرف ہونے والا یہ آدھ گنبد بھی افق پر بڑا بھاری گزرتا جی چاہتا کہ فرمایاں جلدی جلدی بن جائے۔ اسے ڈر رہتا تھا کہ اگر اس نے وقت پر فرمایا کر نہ دیا تو اسے مزید کام نہیں ملے گا اور اگر کام نہیں ملے گا تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ یہ ڈر اسے ہر روز لاحق ہو جاتا۔ چھوٹی سی تھی تو چھوٹے چھوٹے ڈر رکھتی تھی۔ ہر وقت ڈری ہی رہتی۔

”تمن بچے امل آئیں، بنا کھانا کھائے ہی لیٹ گئیں۔ فرمایا تھے وہ اٹھی۔“ کہا ہوا، تھک گئیں؟“

”مسکرائیں۔“ میں کھانا کھاؤں گی، تم اپنا کام کرو۔“

”جی! کھانا کھائیں!“

”کھانا کھائیں تم نے؟“

”جی! کام کرتے ہوئے کھا گیا۔“

”کچھ دیر آرام کرلو۔“

”نہیں جی! وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

دونوں اسی طرح اپنے فرائض پورے کر دیتیں۔

اتنی تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ ہزار کا فرما تھا۔

ایک ایک کانڈ کو نمبر دیکھ کر فونڈ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی تہ

بٹھائی ہوتی ہے۔ شام چھ سات بجے دکان سے لڑکا آتا

ہے تیار شدہ فرمائے جاتا اور مزید تیار کرنے کے لیے

دے جاتا۔ کبھی کبھی فرے کی جگہ خاکی لٹافے بنانے

کے لیے دے جاتا۔ ہفتہ وار اجرت مل جاتی۔

”اتنی! چائے لے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

اس نے جھک کر کانڈ کی تعداد دیکھی اور تیزی سے

ہاتھ چلانے لگی۔ چھ سے ساڑھے چھ ہو گئے۔ فرما بن

گیا۔ اس نے ٹھنڈی چائے پی لی لڑکا آیا فرما اٹھا کر

لے گیا۔ نئے بنانے کے لیے رکھ گیا۔ اب یہ والے

فرے وہ رات کو شروع کرے گی۔

تھوڑی دیر لیٹ کر وہ کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ اماں

کھانا بنانے لگیں۔ چند گھنٹے بڑھنے کے بعد اسے پھر

سے کام سے لگ جانا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے

چاروں افراد کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سخت

محنت کرنی پڑتی تھی۔ اتنی گھر میں کرتی تھی۔ اماں

اسکول کی کینٹین میں دونوں بھائی پریس میں بہت

سیالوں سے ان کی زندگی ہر روز ایسے ہی شروع ہو گئی

تھی۔

اماں آٹھ پاس بھی نہیں تھیں۔ اسکول کی پرنسپل

اچھی تھیں۔ انہیں کینٹین کے لیے رکھ لیا تھا۔ دو بجے

تک وہ چھوٹی سی دکان نما کینٹین میں کاپی پرنسپل ’جوس‘

پر گر بیچتی تھیں۔

شروع میں چند سو ماہوار پر رکھا گیا۔ سال گزرنے

پر ان کی تنخواہ میں چند سو بڑھ جاتے۔ اب انہیں ڈھائی

ہزار ملتے تھے۔

جمال اور اسد سرکاری اسکول کے فنڈ سے پڑھتے

تھے۔ بیماری کی صورت میں وہ فنڈ سے پیسے لے سکتے تھے

جو انہوں نے کبھی نہیں لیے تھے۔ انہیں صرف

کتابیں ہی چاہیے تھیں۔ جمال کا خیال تھا کہ وہ جلد

ہی اپنا نام فنڈ کی فہرست سے خارج کروادے گا۔

فیس خود بخود چاہتا تھا۔ وہ دونوں آدمے گھنٹے کی مراعات

ملے کر کے پیدل اسکول آتے جاتے تھے انہوں نے

اس بات پر کبھی آنسو نہیں بہائے کہ شام کو کھینچنے

بجائے انہیں پریس کیوں جانا پڑتا ہے۔

انسان کا پیٹ کتنا اچھا ہے۔ کتنا بھلا مانس، شریف

حب، مان لینے والا، ایسے ہی اتنی نے کیا، اتنی نے

آٹھویں تک اسکول سے پڑھا تھا۔ میٹرک پر انہیں

کیا۔ آج کل ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بھی

معصوم سی، کم عمر سی لڑکی تھی۔ اتنا کلم کرتی، اتنا کہ

اماں اسے دیکھ دیکھ روکنے کے قریب ہو جاتیں۔ اس کی

ڈر لگتا کہ تختے پر جھکے جھکے وہ بدھی ہو جائے گی۔ جھکی کر

اس کا کب نکال کر ہی چھوڑے گی۔

”اتنی بس کرو۔“ رات گئے ان کی آنکھ کھل کر

حسب معمول کھلا۔

”جی اچھا! ابھی کر دیتی ہوں۔“ وہ اکلوتے کمرے

کے آگے بنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اماں کمرے

میں سو رہی تھیں۔

اماں کے سامنے وہ کمریدھی کر کے تہ بھی

کرتی۔ ورنہ اماں وہ وقت کی روٹی پر سب کو لے

آتیں۔

ایک کمرے، برآمدے اور چھوٹے سے مچھ

مشتمل گھر تھا۔ آہستہ آہستہ پیسے جمع کر کے اماں نے

فرش اور دیواریں کی مرمت کروائی تھی۔ اماں ہر سال

سفیدی کرواتی تھیں۔

اکلوتے کمرے میں لنڈے کا قالین بچھا تھا۔ کمرے

کا یہی واحد سامان تھا۔ اسی پر وہ سب تکیے رکھ کر

جاتے تھے۔ تکیے اٹھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ دیوار پر سامنے

ایک گھڑی، ایک طرف کیلنڈر اور دوسری سامنے دیوار

پر اتنی کے مرحوم والد کی ایک تصویر لگی تھی۔

برآمدے میں دو موڑھے، ایک میز اور ایک لوہے کی

الٹاری رکھی تھی۔ موڑھوں کو اٹھا کر اتنی اپنا چھکی

تخت بچھا کر فرما خاکی لٹافے بناتی، چھوٹے سے مچھ

میں چند کلمے رکھے تھے۔ بس یہی سب کچھ تھا۔ اماں کی

اس گھر میں۔

وہ سب خوش اور مطمئن تھے اپنی زندگی سے

رات کے بارے میں صرف اتنا ہی سوچتے تھے جتنی

ان کی ضرورت تھی۔

اتنی کے والد ایک فیکٹری میں رُک ڈرائیور تھے۔

دوسرے شہروں میں مالی سپلائی کرتے تھے۔ لوڈنگ کے

دوران وہ بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی

خالق حقیقی سے جا ملے۔ فیکٹری مالکان نے چند لاکھ

دیے۔ جس سے اماں نے یہ بوسیدہ گھر خرید لیا۔

آہستہ آہستہ جب ہر رشتے دار کی اصل شکل

سامنے آنے لگی تو وہ زندگی کے سامنے ڈٹ گئیں۔

اپنے بچوں کی طرف دیکھتیں اور مضبوط ہوتی چلی

جائیں۔

جو سبق انہوں نے خود کو پڑھایا، وہی اپنے بچوں کو

اُڑ کر دیا کہ وہ یتیم ہوئے ہیں، لاچار نہیں۔ زندگی کا

ڈٹ کا مقابلہ کریں۔ آنسو پونچھ لیں کہ انہیں صاف

کرنے والا ہاتھ گیا اور حالات کو ہر ادیس اور انہوں نے

واقعی روٹا چھوڑ دیا۔ بنیاد میں سیسہ بھرا جائے تو دیوار کی

جگہ پہاڑ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ماں ان کی بنیاد

تھی۔ انہیں تو پہاڑ بننا ہی تھا۔

آہستہ آہستہ ان کے گھر کی صاف ستھری حالت کو

دیکھ کر اکا دکا آنے والے رشتے دار سمجھنے لگے کہ وہ

فوق حال ہو رہے ہیں۔ اگر وہ رات کو دو دو بجے تک

پریس میں کام کرنے والے جمال اور اسد کو دیکھ لیتے تو

ملائے جیران نہ ہوتے۔ پانچویں اور ساتویں جماعت کے

بچے بستر پر سونے کے بجائے پریس میں مشینوں پر

کڑے کام کر رہے ہوتے۔ اگر وہ اتنی کو کئی کئی گھنٹے

لٹاتا تو دیکھ لیتے تو اس کے ہاتھ جو ملے۔

اماں چھٹی کے دن اتنی کو گھر کا بھی کام نہ کرنے

دیتیں۔ اس دن وہ انہیں پلاؤ یا آلو گوشت کھلاتیں۔

جمال اور اسد کو کھیلنے کے لیے بیچتیں اور اتنی کو ساتھ

لے کر بازار چلی جاتی تھیں۔ اسے آنسو کریم کھلا کر

لگاتیں۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں ترتیب دی گئی ان

کائنات کی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اس ٹھیک ٹھیک زندگی

میں ایک گھنٹی بھی۔

”اتنی کے پاس آج کوئی کام نہیں تھا کرنے کے

لیے۔ نہ فرما، نہ خاکی لٹافے، نہ دکان والے نے کہا کہ

دس پندرہ دن کے لیے کام نہیں آئے گا، آرڈرز نہیں

آ رہے۔ وہ اپنی کتابیں کھولے پڑھ رہی تھی۔ اس کی

انگریزی زیادہ خراب تھی بار بار گرامر کی مشق کر رہی

تھی۔ اس کے پاس جو فون تھا۔ اس پر کم ہی کسی کی کال

آتی تھی۔ کبھی گھسار ماموں کی یا فیصل آباد والے بچاکی۔

زیادہ تر اماں ہی اسکول کے آفس سے فون کرتی

تھیں۔

فون اس کے پاس ہی رکھا تھا۔ بجا تو اس نے اٹھایا

کان سے لگایا۔

”میری عرشہ سے بات کرو ادیس؟“

”عرشہ تو نہیں ہے جی؟“ وہ ابھی مولانہ آواز سن

کر گھبرا گئی۔

”نفسا ہوگی؟“

”جی وہ بھی نہیں۔“ وہ اور گھبرا گئی، اپنے ماموں اور

بچا کے علاوہ اس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔

”عرشہ بھی نہیں ہے، نفسا بھی نہیں ہے تو شانہ تو

ضرور ہی ہوگی۔“ ڈر اٹھ کر کہا گیا۔

اتنی نے فون بند بھی نہ کیا، رائنگ نمبر بھی نہ کہا۔

”کیسی لڑکی ہو تم، کچھ ہے ہی نہیں تمہارے پاس“

اچھا چلو عاترہ بھی نہیں تو حرم، تحریم، زہیم، کوئی ایک تو

ہوگی، دیکھو اب نہ تمہارا کتنا ٹھیک نہیں ہوگا، میں نے

بتا دیا ہے پہلے ہی۔“ دلی دلی ہنسی۔

”نہیں، کوئی بھی نہیں ہے۔“ اس نے ذرا سی بے

چارگی اور افسوس لیے کہا، جیسے خود سے ہی کوئی گناہ

ہو گیا ہو۔

”کوئی نہیں، ہلہلا۔“ ایک طویل تہقیر لگایا گیا۔ فون

کرنے والا جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔

”یار! کیا نام ہے تمہارا، کب سے ہو اس دنیا میں“

تمہارے اس انداز پر جی چاہتا ہے کہ تمہارے قدموں

میں بچھ جاؤں اور اپنی جان بے دلی۔ تم کہاں آگئیں

ہم سب معاشوں میں۔ جواب دو جلدی سے۔“

”مجھے آپ کو اپنا نام نہیں بتانا۔“ اس کے ہنسنے پر اسے غصہ بھی آیا اور عقل بھی کہ کوئی جھگ کر رہا ہے اس نے فون بند کر دیا۔ پھر بجا اور بجاتا ہی رہا۔ اس نے نہیں اٹھایا، پھر مسیج آنے لگے۔ ہر مسیج میں ایک نیا نام تھا۔

”اسماء ہو؟ شایان ہو؟ نمو ہو؟ جویریہ ہو؟ ہادیہ ہو؟“

اتنے نام اتنے مسیج۔ اس کا ان باکس بھر گیا۔ پھر فون بجنے لگا۔ اہاں آفس تو اس نے فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اگلے کئی دن ایسے ہی کاڑ اور مسیج آتے رہے۔ افق کا سارا دھیان دے کر دیا۔ فون اٹھاتی نہیں تھی۔ لیکن فون بجتے ہی فون کی طرف دیکھنے لگتی۔ اب نہیں بھی بجاتا تھا تب بھی دیکھتی تھی کہ بج کیوں نہیں رہا۔ مسیج آتے تو پڑھتی۔ نہ آتے تو پہلے والے پڑھتی۔

چند دنوں میں ہی ایسا ہوا، لیکن ہو گیا۔ بیرونی دنیا سے زیادہ واسطہ نہیں تھا اس کا۔ جتنا بھی واسطہ تھا اس میں ایسی شرارتی باتیں کرنے والے خوب صورت گواڑ والے شامل نہیں تھے۔ اب وہ زرمیم تحریم شلیان سوچے جاتی، سوچے جاتی، مسکراتے لگتی۔ اس کا جی چاہا کہ اہاں کو یہ لطیفہ سنائے، پھر سنا نہیں سکی۔

”چھوٹی ہو، بڑی ہو، موٹی ہو، لمبی ہو، پیاری ہو، پری ہو، کون ہو؟“

روزانہ نئے سرے سے اس کا ان باکس بھرے لگے۔

”کوئی ہو بول نہیں سکتیں، اپنی حترم آواز میں گانا تو سناؤ، گالیاں ہی سنا دیا اپنا کوئی سبق ہی۔“ کج کیا کھاؤ گی، کہاں بیٹھی ہو، کیا کر رہی ہو، کچھ بولو، کچھ سنو، کچھ پوچھو، چلو کچھ کریں، چلو آؤ، چلیں۔“

جی بات تھی یہ دو دو حنی مسیج پڑھتے پڑھتے افق ہنس ہنس کر لوٹ بوٹ ہو گئی، کہاں نے سبزی بناتے بیٹے اسے دیکھا۔ موبائل اس نے کتب میں رکھا ہوا

تھا۔ قریب ہی ایک پرانا سا رکھا تھا۔

”کیا ہوا افق؟ ایسے کیوں ہنس رہی ہو؟“

”کچھ نہیں جی؟“ ہنسی چھا کر کہا۔

افق کا جی چاہا۔ اپنی کسی میسج کے کدے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں ایک ایک بات بتائے۔ میسج اس کی کوئی تھی نہیں۔ کانج وہ جاتی نہیں تھی۔ چاروں خالہ زاد ماہوں زلو کوئی ان کے گھر آتا نہیں تھا۔ دنیا میں اکیلے تھے تو تجربات میں بھی اکیلے تھے اور ان کی تجربات زندگی کا تو ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ کمال کا مشاہدہ اور کہاں کی عقل۔

افق دل کھول کر ان مسیج پر ہنستی رہی۔ کئی دن ایسے ہی چلتا رہا۔ ایک دن ایک انجیل نے نمبر سے فون کیا۔ اس نے اٹھایا، لیکن چپ رہی۔

”رکو رکو۔ تمہیں قسم ہے اپنی آواز کی جلدی ہو اپنی آواز کی سر جری کہاں سے کر والی ہے؟“ اسی لڑکے کی آواز سن کر وہ پہلے سے زیادہ ہلکا گئی۔

”جی۔ اتنا ہی کہا۔ اسے کیا پتا کہ آواز کی سر جری بھی ہوتی ہے۔“

اور قہقہہ اٹا بلند ہوا کہ وہ دیر تک ہنستی رہی۔

”مجھ سے دوستی کرو گی۔“ جھٹ سے پوچھا۔

”جی؟“ اس کے منہ سے پھر بے ساختہ نکلا۔

”جی۔ چلو دن ہوا۔ میرا نام اہاں ہے۔ اہاں پر رہا ہوں۔ پھر جاب کروں گا۔ پھر شادی، صر لہو، پچھ کروں گا لڑکے کا نام بازل رکھوں گا۔ لڑکی کا نام ریحان افق نے گہرا کر فون بند کر دیا۔ اس کی بیسیل

بھیک گئی تھیں۔ مسیج کیا ”فون بند کر دیا۔ کوئی آگیا تھا کہ میں رہا تھا کہ روار رکھوں گا۔ روار ابھی ستر بنے گی اور بال بال بار بنے گا، پیسہ کمائے گا اس پیسے کو میں جمع کر آؤں گا۔ جب بہت زیادہ ہو جائے گا تو ہوائی میں چڑھے گا۔“

”گھر لوں گا۔ ایک بازل کے لیے ایک اپنی گرل فرینڈ کے لیے۔ گرل فرینڈ کو بیوی سے چھپا کر دہاں رکھوں گا، شش مستانہ کسی کو گور۔ کیا۔“

”افق۔ توبہ۔ اللہ جی۔“ افق کا ہنس ہنس کر رہا حال ہو گیا۔

”کیا تم میری بیوی بنو گی؟“ ایک ذرا لمبے وقفے کے بعد یہ مسیج آیا۔ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ایک کرنٹ اس کے اندر سے ہو کر گزرا۔ انجیل نمبر تھا۔ انجیل شخص تھا غلط انداز تھا غلط ہی زمانہ تھا۔ اتنا وہ جانتی تھی، پھر بھی اس نے رات تک کئی بار اس فقرے کو پڑھا۔

”میری بیوی بنو گی؟“ ہر بار کرنٹ ہی کرنٹ سا لگتا۔ وہ ڈر جاتی۔ کانپ جاتی۔ پھر بھی بار بار پڑھتی۔

ساری رات اس فقرے کے آگے پیچھے بھاگتی رہی۔

اہاں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ منہ اندھیرے اٹھنے والی بے سدھ پڑی تھی۔ اہاں نے اسکول سے ہنسی کر لی۔ اسے تیز بخار تھا۔ دونوں بھائی پریشان صورت لیے اسکول گئے۔ افق بیمار ہو گئی۔

اہاں اس کی بیماری سے بہت پریشان ہو جاتیں۔ انہیں شرمندگی ہوتی۔ انہیں لگتا سب ان ہی کی وجہ سے ہے۔ اتنا کام کرتی ہے وہ۔ کتنے سالوں سے کر رہی ہے۔ کانج بھی نہیں جاسکی۔

انہوں نے سوچا۔ اسے ماموں کے یہاں بھیج دیں۔ ان کے بچوں سے دوستی نہیں تو سلام دعا ہی کی۔ ایک دو منگے سوٹ لے دیں گی۔ ماحول بدل جائے گا۔ چاروں تو ماموں مہمان بنائی لیں گے۔

شام تک اس کا بخار اتر گیا۔ فون کے ساتھ الٹ بیٹ گئی رہی۔ اہاں نے اس کی تیاری کی۔ کپڑوں کے چالے ساتھ لے جانا چاہا۔ پر وہ نہیں ملتی، ماموں کے بچے کانج یونیورسٹی جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سلام دعا نہ کرتے تھے بس۔ مای جی اسے کاموں میں لگائے

تھے۔ آتے ہوئے سیمابائی، زینوبائی کے استعمال شدہ کپڑوں، جوتوں کی گھڑی ہاندھ کر پکڑا دیتیں۔ اسد وہی بھلے لے آیا۔

”افق بائی! ٹھیک ہوتا؟“ وہ بے چارہ بہت فکر مند ہو جاتا تھا۔

”ہاں! میں ٹھیک ہوں۔“

”افق بائی! بیمار نہ ہوا کرو۔“ وہ اور بے چارہ نظر آنے لگا۔ ”مجھے بڑا روٹا آتا ہے کسی کو بھی بیمار دیکھ کر۔“

”میں نہیں ہوتی اب بیمار۔“ وہ مسکرائی۔

”میرے پاس کچھ اور پیسے بھی ہیں۔ میں چوک سے ملک شیکلا دوں۔“ وہ پھر مسکرا دی۔

اہاں اسے لے کر سڑک پار پارک چلی گئیں۔ سبزے پر وہ دیر تک غمگینی رہیں۔ جنگل سے سڑک دیکھتی رہیں۔

”میری بیوی بنو گی۔“ وہی آواز سبزے پر بچھ گئی۔ درختوں پر لہرا گئی۔ درختوں پر چڑھے پرندے ایک ساتھ خوب آہن رنگا گیا۔

سبزے پر چاندنی بھی پھیل گئی اور قوس قزح بھی۔ پھول پودے لہرا لہرا کر جھومنے لگے۔ یہ منظر اس کے اندر کا تھا۔ وہ اب ہی آپ مسکراتے لگی۔

بخار اتر گیا۔ اہاں خوش ہو گئیں۔ پارک سے اسے آکس کریم کھلانے لے گئیں۔ فون کو ہاتھ میں لیے لیے ہی وہ سو گئی۔ پھر کوئی مسیج نہیں آیا تھا۔

”میری بیوی بنو گی۔“ اس نے رات کے نہ جانے کس پہر اور کس اوٹ میں چھپ کر کہا۔

”نہی سی پیاری سی لڑکی بولی“ ہاں ”خود سے بھی چھپ کر پڑ کر کانپ کر رات کے اندھیرے میں۔“

کئی دنوں بعد فون آیا۔ بجتے بجتے بند ہو گیا۔ لیکن اس کا دل دھڑکتا رہا۔ پھر مسیج آنے لگے وہی اگے سیدھے۔

”کوئی ہے؟ کوئی چڑیا، کو، شیر، ہاتھی، چلو گھوڑا ہی سی۔“ گائے بھی نہیں چلے گی۔

”خاموشی اتنی حسین ہے تو کلام کتنا غضب دھائے گا۔“

امیں نے پوچھا۔ ”فقیر! آتا کو بندھ لیا؟“

”جی شہر۔“ ہر رات گئی۔

”شہر۔“ اماں حیران پریشان۔

دور کے مارے اس نے رات تک فون کو ہاتھ نہ لگایا۔ جب سب سو گئے تو باورچی خانے میں جا کر چپکے سے کتب کھول کر اس میں فون رکھا اور پڑھنے لگی۔ ایک بار دوبارہ نہ جانے کتنی ہی بار۔ اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی یا دل نہیں بھر رہا تھا پتا نہیں۔

اس کے امتحان ہونے والے تھے تو اماں نے اس کے سارے کام ختم کروا دیے تھے وہ لی اے کے بعد اسے کوئی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر اب اس کا دھیان ہی قائم نہیں رہا تھا۔ باگھی۔ شہر۔ لکھا نظر آتا۔ وہ ہنس دیتی۔

فون آتے رہے، مسیج بھی آتے رہے۔ وہ خاموشی میں ہی اس سے ہم کلام ہوتی رہی۔ وہ اس کی زندگی کا جز بن گیا۔ سانس کی طرح جو آتے جاتے دکھائی نہیں دیتی، لیکن ہوتی ہے اور بہت ضروری ہوتی ہے۔

چند دنوں سے نہ فون آ رہے تھے پھر چڑی ہو گئی۔ ”آخری بار اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ وہ مرجائے گا تو ہی جواب آئے گا۔“

افتی کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ کتنا مستقل مزاج ہے اور اب یہ مستقل مزاج چپ ہو گیا تھا۔ مصروف ہو گا، بیمار ہو گا یا بھول گیا ہو گا۔

دو ہفتے گزر گئے، کیسے گزرے افتی ہی جانتی تھی۔ ”وہ مری گیا ہو گا!“ افتی کا دل دہل گیا۔

”فقیر پڑھ لو۔“ اماں نے کہا۔ پہلے انہیں کہنا نہیں پڑتا تھا۔

رات تک کوئی مسیج نہیں آیا تھا۔ رات سے صبح ہو گئی۔ اماں اسکول چلی گئیں۔ وہ اکیلی رہ گئی۔

”کوئی ہے؟“ اس نے پہلی بار دیکھا۔

رات گئے تک کوئی جواب نہیں آیا۔

دو دن گزر گئے۔ اتنی ہمت کر کے کیسے گئے فون کوئی جواب نہیں آیا۔

”کہاں گئے سب؟“ پھر لکھ کر بھیجا۔

جواب پھر بھی نہ آیا، دو دن اور گزر گئے۔

”اب تو وہ مری گیا ہو گا پکا۔“ فون بھی بند ہو گیا۔

اس نے کل کے فون کو دیکھا۔ پہلی ہی تیل پر۔

”یہاں ہیں سب“ اور تمہ۔“ سوال کا جواب نہ دیا۔

جواب کے لیے سوال۔

”دور تم۔“ افتی کا دل پھر پھڑپھڑانے لگا۔

”آ رہے۔“ اور تمہ۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

اس نے فون بند نہ کیا ہنستی رہی۔

”دور رہی ہو کہ کون لنگا اور بد معاش ہے۔“ بولتی

نہیں ہو، سانس بھی لیتی ہو کہ نہیں؟ کھانوں کا نہیں

تھیں۔ قتل بھی نہیں کروں گا۔ اب بھی تمہارا

فون نہ آتا تو مرجاتا اپنی قسم کھاتا ہوں، مرجاتا بولو گئی

کیا کوئی ہے؟“

”ہاں!“ اس نے کہا، ”اسے کہنا ہی پڑا، بچوں کی

پیاری لڑکی کو کہنا ہی پڑا، یقین جانئے کہنا ہی پڑتا ہے۔“

اسلامی فطرت، عورت اور مرد کی انٹی جوڑی دار سا بھلا

اور کشش۔ کوئی اس کشش سے کہاں جا چکے۔

”تمہارا نام۔“ اس نے اتنے پیارے انداز سے

پوچھا۔

”افتی۔“

نام بتاتے ہی بات چل نکلی۔

افتی کو ایک سیلی مل گئی۔ وہ کب مدنی، کب

وہ اسے بتاتے گئی۔

محبت نے عجب ستم بھایا اس پر۔ وہ اپنی اماں کی

گھر کی کام کی چھوٹی چھوٹی سوچوں سے دور نکل گئی۔

اسے اس سے بات کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے

کہا۔ اگر وہ اتنی ہی عسکر المزاج رہی تو فرشتہ بن جائے

گی۔ وہ ہنس دی۔

”تمہیں میری ہر بات پر ہنسی آتی ہے؟“

”آپ کی ہر بات ہنسنے والی ہوتی ہے۔“

”مجھے جو کر سمجھا ہے؟“

”ہاں سمجھ لیتی ہوں۔“ کھی کھی کھی۔

”ایک دن ایسے ہی جیسے میں تمہارا اگلا باپوں گا۔“

”ہائے اللہ!“ اس کے سنجیدہ انداز پر وہ واقعی سنجیدہ

ہو گئی۔

”ہاں!“ وہ دل کھول کر ہنسا۔

اپنے تعارف میں اس نے اپنا نام اماں بتایا تھا۔ کلچ

میں وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ دراصل چند ماہ شوق

شوق میں وہ ہاسٹل رہا تھا۔ ہاسٹل میں اندرون خانے

انہوں نے بہت سے کارٹونے انجام دیے تھے۔ ان

کے گروپ کا نام ”یگل“ تھا اور وہ سب ایک دوسرے

کو فرضی یا تک نیم سے بلاتے تھے۔ یہ صرف ایک

سیف سائیڈ پلان تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے اور بات

تفتیش تک جا پہنچے تو کوئی ان تک پہنچ ہی نہ سکے۔

چوکیداروں کو بھی ان کے اصل نام معلوم نہیں تھے۔

آئے دن وہ منت خیز شرارتیں کرتے، ہاسٹل میں رہنے کا

شوق پورا ہو گیا۔ وہ ہاسٹل چھوڑ آئے۔ نام ساتھ ہی

لے آئے۔ اماں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ

بچھلے دنوں فون پر لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا۔ ایک نمبر پر

وہ ملی تو اس کی آواز، انداز پر فدا ہو گیا۔ وہ دوسرے نمبر

سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ ڈی ایچ اے میں

ایک بنگلے میں اپنے چار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔

وہ بات اس انداز سے کرنا کہ پیارا لگتا۔ اس میں

ایک بات تھی کہ وہ بچ بڑے دھڑلے سے بولتا تھا۔

جب اس نے یہ کہا کہ وہ لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا۔ افتی

خاموش ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

”اپنے چھوٹے سے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔“

چور ڈاکو نہیں ہوں میں۔ قدر کرو میری، میں کتنا بچ

بوتا ہوں۔ چاہتا تو یہ بات نہ بتاتا، تم ہی بھولی لڑکی سے

زیادہ تو بھالو عقل والا ہو گا۔ نہ بتاتا تو کیا معلوم کر لیتیں

تم یہ؟“

اس نے اتنی بڑی دلیل دی کہ افتی قائل ہو گئی۔

”مجھے جو کر سمجھا ہے؟“

”ہاں سمجھ لیتی ہوں۔“ کھی کھی کھی۔

”ایک دن ایسے ہی جیسے میں تمہارا اگلا باپوں گا۔“

”ہائے اللہ!“ اس کے سنجیدہ انداز پر وہ واقعی سنجیدہ

ہو گئی۔

”ہاں!“ وہ دل کھول کر ہنسا۔

اپنے تعارف میں اس نے اپنا نام اماں بتایا تھا۔ کلچ

میں وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ دراصل چند ماہ شوق

شوق میں وہ ہاسٹل رہا تھا۔ ہاسٹل میں اندرون خانے

انہوں نے بہت سے کارٹونے انجام دیے تھے۔ ان

کے گروپ کا نام ”یگل“ تھا اور وہ سب ایک دوسرے

کو فرضی یا تک نیم سے بلاتے تھے۔ یہ صرف ایک

سیف سائیڈ پلان تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے اور بات

تفتیش تک جا پہنچے تو کوئی ان تک پہنچ ہی نہ سکے۔

چوکیداروں کو بھی ان کے اصل نام معلوم نہیں تھے۔

آئے دن وہ منت خیز شرارتیں کرتے، ہاسٹل میں رہنے کا

شوق پورا ہو گیا۔ وہ ہاسٹل چھوڑ آئے۔ نام ساتھ ہی

لے آئے۔ اماں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ

بچھلے دنوں فون پر لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا۔ ایک نمبر پر

وہ ملی تو اس کی آواز، انداز پر فدا ہو گیا۔ وہ دوسرے نمبر

سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ ڈی ایچ اے میں

ایک بنگلے میں اپنے چار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔

وہ بات اس انداز سے کرنا کہ پیارا لگتا۔ اس میں

ایک بات تھی کہ وہ بچ بڑے دھڑلے سے بولتا تھا۔

جب اس نے یہ کہا کہ وہ لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا۔ افتی

خاموش ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

”اپنے چھوٹے سے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔“

چور ڈاکو نہیں ہوں میں۔ قدر کرو میری، میں کتنا بچ

بوتا ہوں۔ چاہتا تو یہ بات نہ بتاتا، تم ہی بھولی لڑکی سے

زیادہ تو بھالو عقل والا ہو گا۔ نہ بتاتا تو کیا معلوم کر لیتیں

تم یہ؟“

اس نے اتنی بڑی دلیل دی کہ افتی قائل ہو گئی۔

جا نہیں رہا تھا۔ ایک جگہ بڑے بڑے تھک گیا تھا۔

ورنہ کلچ میں مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ہر لڑکی میری

دوست بنتا چاہتی ہے۔“

کلچ میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ یہ بات افتی کو بری

لگی۔ افتی نے فون بند کر دیا۔ اسے بے عزتی کا احساس

ہوا۔ اس احساس میں بھی اس نے اماں کو برا نہ سمجھا۔

صرف اس کی حرکت کو ہی۔

”رونا مت۔“ مسیج آیا، پھر کی مسیج بار بار آتا

رہا۔ وہ مسکرائی دی۔

”بہت لڑکیوں سے دوستی ہے۔ بہت سوں سے

بات کرتا ہوں افتی۔ لیکن۔“ ”میری بیوی بنو گی۔“

صرف تمہیں کہا، سمجھیں۔ میں تم سے ڈرتا نہیں

ہوں۔ میں نے یہ صرف تمہیں ہی کہا۔ دوبارہ ایسے

فون بند مت کرنا۔ ورنہ میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔

تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

افتی نے کہا۔ ”سب لڑکیوں سے دوستی چھوڑ دو۔“

اس نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”چھاتی!“

”ان سے بات نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”یہاں گھر ٹھیک نہیں۔“

”چھاتی! گھر ٹھیک ہے اور کچھ؟“

”بس اتنا ہی۔“ ”وہ فوراً“ سمجھ کر مان جاتی تھی۔

”تم سے ملتا ہے۔“ اب وہ صرف یہی ایک بات

کرنا۔

”دیکھتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔

”تو پھر ملو نا، پھر دیکھتے ہیں۔“ ”تجربہ بھی، فراکش بھی۔“

”یہ بھی دیکھتے ہیں۔“ وہ کل کر ہنسی۔

اس کا زلٹ آیا۔ وہ فیل تھی وہ پرچوں میں۔ اماں

بہت ہنسلا۔ ”یہی ہوتا تھا۔“

افتی کو دلی صدمہ ہوا۔ اماں کی ساری امیدیں خاک

ہو گئیں۔ وہ دنوں اداس رہی۔ پھر سوچیں، اتنا کام کرتی

ہے، پھر ایسے میں کہاں کی پڑھائی۔ انہوں نے افتی کو

سمجھایا کہ وہ جو میں گھنٹوں میں ایک وقت کی روٹی بھی کھا سکتے ہیں۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئی۔ لیکن مسئلہ کچھ اور تھا۔ کام نہیں تھا۔ آج کل وہ جو کام کر رہی تھی وہ تو بہت آسان تھا۔ ریڈی میڈ کپڑوں پر بن لگانے کا کام تھا۔ وہ ہینڈ فری کلن میں لگا کر ایک طرف بیٹھی کام کرتی رہتی اور باتیں بھی۔

امان بہت مصروف انسان تھا۔ لیکن وہ ہر روز اس سے بات ضرور کر لیتا تھا۔

امان نے کہا کہ اس نے ٹاپ کیا ہے۔ وہ خوش تو ہوئی۔ لیکن حیران بھی ہوئی۔ امان سے بات کر کے وہ ٹپ ہو گئی۔ لیکن افق نے خیر ایسے کیا جیسے اس نے خود نے ٹاپ کیا ہو۔ اتنا دکھ تو اسے اپنے ٹپ ہونے کا نہیں ہوا تھا۔ جتنا اس کے ٹاپ کرنے کی خوشی ہوئی تھی۔

اب وہ ملنے کی ضد کرنے لگا تھا افق میں حوصلہ نہیں تھا۔ افق سیکرٹریٹ کی طرف بنی فیکٹری میں کام کرنے لگی تھی۔ وہاں فرے اور خاکی لفافوں کی نسبت کام آسان بھی تھا اور پیسے بھی زیادہ تھے۔ اسے صرف چھ گھنٹے کام کرنا ہوتا۔ ماہوار چھ ہزار۔ تین گھنٹے اور لگانے پر آٹھ ہزار۔ افق آٹھ بجے جاتی تین بجے تک واپس آجاتی۔ جمل اور اسد اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسے چھوڑ کر وہ اپنے اسکول چلے جاتے۔ امان کے بار بار کہنے پر اس نے اسے نیشنل کلج آف آرٹس کے آگے کھڑا ہونے کے لیے کہہ دیا۔ اسے اسی سڑک کے فٹ پاتھ پر سے گزرنا تھا۔

جمل آگے آگے چل رہا تھا اور اسد ذرا سا پیچھے چل رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے قدم افق کے پاگل برابر آتے۔

”افق باقی! تیز چلو۔ آج اتنی آہستہ چل رہی ہو۔“

اس نے دو قدم تیز اٹھائے۔ پھر آہستہ ہو گئی۔ وہ کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ کے بارے میں افق کو بتایا تھا اور افق نے اسے ہلکے گلابی رنگ کی شلوار کیس اور کالی سیاہ چادر کے

بارے میں بتایا تھا۔ وہ کار کے بونٹ کی طرف کھڑا تھا۔ پہلے امان نے اسے دیکھ لیا۔ شاہراہ قائد اعظم کی پر شور سڑک پر کشمیری حسن سے مجھے کو سڑک پر چلے دیکھ۔ حیران رہ گیا۔

افق فٹ پاتھ پر اس کے قریب سے گزر کر چلی گئی۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر نیکی شرٹ والے کو دیکھا۔ قاعدوں کی نظریں ملیں۔

امان زندگی میں لڑکی نام کی چیز سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ وہ لڑکیوں کو پسند کر لیتا تھا۔ دوستی بھی، فطرت بھی، لیکن متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ افق سے متاثر ہو گیا۔ اس کے حسن سے۔ اس نے رات کو فون کیا تو یوں لگتا ہی بھول گیا۔

”تم اتنی خوب صورت ہو!“

اس نے اس انداز سے کہا جسے افق نہیں سمجھتی تھی۔ دنیاوی پٹانوں سے ابھی وہ نہیں گزری تھی۔ خوب صورتی اگر کوئی قاعدہ ہے تو وہ اسے فی الحال کوئی قاعدہ نہیں دے رہی تھی اور اگر یہ کوئی خبیث ہے تو وہ خبیث ان کے لیے بے کار تھی۔

”مجھے نہیں معلوم میں کیسی ہوں۔“ اس نے بے کمال۔

”تمہیں معلوم ہو بھی نہیں سکتا۔“ امان کا انداز۔

کھو گیا۔

”مجھے معلوم کرنا بھی نہیں۔“ اس بار بھی اس نے بے کمال۔

”اگر تم نے معلوم کرنا چاہا تو غضب ہو گا۔“

وہ حیران ہوئی۔ ”کیا مطلب؟“

”ہمارے کلج میں ذرا جو خوب صورت لڑکیاں ہیں۔“

”تو کمال کے ٹانگ کرتی ہیں، پھر تم سی ایس سی ٹانگ کرتیں۔“

”ٹانگ کیا؟“

”چھوڑو اس بات کو نہیں۔“

اس نے چھوڑ دیا۔ اتنی عقل والی میں تھی کہ باتوں سے ہزار ہزار مطلب نکال لیتی۔

امان نے کرید کرید کر اس سے بہت سے سوال

کیے۔ ابا اور ان کی موت کے بارے میں۔ خاندان کے بارے میں۔ یہ سوالات اس نے پہلے نہیں پوچھے تھے۔ وہ اپنی باتیں کرتا، اپنی شرارتیں، تھوڑا بہت وہ جانتا تھا جو کچھ پوچھتا، افق بچ بچ بتا دیتی تھی۔

اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد اس نے بہت سنجیدہ گفتگو کی تھی اس کے ساتھ۔ اس کی باتوں سے افق کو اندازہ تھا کہ وہ امیر ہے۔ لیکن اتنا امیر ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ فیکٹری نہ جائے۔ وہ اسے چھ ہزار دے دیا کرے گا۔ اس کی یہ بات افق کو اتنی اچھی لگی کہ وہ خوشی سے نہل ہو گئی مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس سے پیسے لے لیتی۔ فیکٹری نہ جاتی تو امان کو کیا بہانہ کر کے پیسے دیتی۔ امان سمجھ کر چپ کر گیا۔ افق کا انکار کرنا اسے بھی اچھا لگا۔

آنے والے دنوں میں وہ کئی کئی بار اس کے راستے میں کار روک کر کھڑا ہوا۔ چادر کا پلو منہ میں دبائے وہ قریب سے گزرتی رہی۔ ایک نظر دیکھتا اور اگلی نظر کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس نے اس سے زیادہ خود ہی اصرار نہیں کیا۔

اب امان چاہتا تھا کہ افق اچھے نمبرز سے امتحان پاس کرے تو وہ اسے کسی اچھے کلج میں داخل کروا دے۔ کم از کم اس کے پاس ایک اچھی ڈگری تو ہوگی۔ امان کے لیے وہ سب اچھی ڈگریاں حاصل کر سکتی تھی۔ وہ اس کی ہر بات مان لیتی تھی۔ خدی تو وہ تھی ہی نہیں۔

وقت اور زمانے نے کچھ چیزوں، کچھ افکار، کچھ قدروں کو نابود و تباہ بنا دیا ہے۔ اب چور بازاری اتنی ہے کہ شریف الناسی پر جان دینے کو جی چاہتا ہے۔ جھوٹ اتنا ہے کہ سچ کو اٹھا کر طاق میں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ دعا بازی، فریبی، چالاک، مکاری، فرعونیت اس حد تک سرایت کر چکی ہے معاشرے میں کہ معصوم اور بھولے بھالے کسی بھولے بھٹکے آدم زاد کو گھر میں تالا بند کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سادگی، معصومیت، نیکی،

شرافت، اعلا کرداری، یہ نوادرات کی فہرست میں درج ہو گئے ہیں۔ امیر لوگ، لاکھوں، کروڑوں لٹاتے ہیں ان نوادرات کو اپنے گھروں میں بچانے کے لیے۔ سادہ، معصوم، بوجھلانی سی افق کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہ ہاتھ امان کے تھے۔ بات محض وقت گزاری، تفریح اور دل لگی سے شروع ہوئی۔ اب دل کی طرف جاری تھی۔ امان کے دل کی طرف۔

افق کے حسن کا تیرہ عین نشاۃ پر لگا۔ اس کی سادگی نے امان کا دل موہ لیا۔ کبھی جو اس نے عورت کے لیے ایک معیار بنایا تھا۔ افق اس معیار پر پوری اتر رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا ہے۔ وہ جانتا تھا آخری بھی ہو گا۔ وہ قسم کھا سکتا تھا۔ افق سے سادہ طبیعت لوگ نہ منہل بدلتے ہیں نہ راستے لوگ اور محبت تو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امان اس کی ہر بات کو بہت پسند کرتا تھا۔

اس نے کبھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتا تھا۔ افق کے لیے یہی محبت تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ افق امان تک جانے میں اور امان افق کے پاس۔

ایک پورا دن امان کا فون نہیں آیا اور نہ ہی اگلے دن۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن افق پریشان ہو گئی۔ اگر وہ فون نہیں کرتا تھا تو مسیج ضرور کر دیتا تھا۔ تیسرا دن آیا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر فیکٹری میں روٹی رہی۔

اتنے سے ہی دنوں میں اسے لگا کہ وہ اسے چھوڑ گیا ہے۔ یہ خوف مسلسل اس کے اندر قائم تھا۔ امان پر مکمل یقین کے باوجود یہ خوف گلے بگلے اس میں در آ گیا۔

چار دن گزر گئے اسے اپنے خوف پر یقین ہونے لگا۔ پانچویں دن امان کی کل آئی۔

”آپ کہاں تھے۔“ اس نے پرسا سوال ہی کیا۔
 ”میں جیل میں تھا۔ وہی جا رہا ہوں۔ وہاں سے آگے بھی جاسکتا ہوں۔ کسی سے کوئی رابطہ نہیں کر سکوں گا۔“ جلدی جلدی کہا۔ اتنی ساری باتیں سن کر وہ سمجھ گئی کہ بس اب وہ جا ہی رہا ہے۔
 ”چھوڑ رہے ہیں مجھے؟“ روتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں جیل میں تھا اتنی۔ ایک سیل منٹ ہو گیا تھا مجھ سے کسی کا۔ کل باہر آیا ہوں ضمانت پر۔ آج شام کو وہی جا رہا ہوں۔“ وہ چلایا۔ اتنی سمجھ گئی۔
 ”نہ جاؤ امان!“ اس نے سمجھ کر بھی یہی کہا۔
 ”تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ وہ جلدی میں تھا۔ فون بند کرنا چاہتا تھا۔
 ”پاگل ہو جاؤں گی نہ جاؤں۔ مجھے اکیلے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ اتنی باقاعدہ رونے لگی۔
 ”میں جیل میں نہیں سڑ سکتا۔ تمہیں حالات کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ حالات بہتر ہوئے تو تم سے رابطہ کر لوں گا۔“
 ”ایسے نہ جاؤ امان۔“ سب جان کر بھی اس کی ایک ہی ضد۔
 ”تو پھانسی لگ جاؤں؟“ اسے پہلی بار اس پر شدید غصہ آیا۔
 ”کیوں ہو گی پھانسی؟“ وہ ڈر گئی۔
 ”میں جا رہا ہوں۔“ وہ فون بند کرنے لگا۔
 ”نہ جاؤ۔“ پھر وہی بات وہی انداز۔
 ”تو مر جاؤں؟“
 ”میں مر جاؤں گی۔“ وہ حیرت آواز میں رونے لگی اب یہ جا رہا ہے نجانے کب آئے، آئے بھی کہ نہ آئے۔ ”کچھ بھی نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ یس روئے روتے روتے بھی اس نے یہی کہا۔
 ”تمہیں نہیں پتا۔ کیسے ہو جائے گا سب ٹھیک۔“ امان جھنجھلا گیا ساتھ ہی ذرا سانچہ نرم کیا۔
 ”میں دعا کروں گی۔“ میں بہت اچھی دعا کرتی ہوں۔ بہت دل لگا کر۔ اب بھی کہہ رہی۔

”وہا۔۔۔ امان کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کیا بک رہی ہو۔“
 ”جا رہا ہوں میں۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اتنی نے دوبارہ نمبر لپایا تو فون آف تھا۔ وہ خوب ہی روئی۔ امان نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔
 ”کیا ہوا اتنی؟“ ٹی میں صرف سر کر بلا کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ کتنی دیر ہاتھ روم میں پتکیاں مالتی رہی۔
 ”وہ جا رہا ہے۔ وہ جا رہا ہے۔ وہ جا رہا ہے۔“ اسے صرف یہی یاد تھا۔
 باقی معاملات کے بارے میں اس نے نہ سوچا نہ ہی ان پر غور کیا۔ حادثہ کیسے ہوا کب اور کیوں ہوا۔ حالات کیسے اتنے بگڑ گئے کہ اسے بھاگنا پڑ رہا ہے۔ ٹھیک کہتا ہے امان کہ اس کے پاس عقل ہے ہی نہیں، وہ موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی تھی اپنی ہی بات کیے جا رہی تھی اور ایسے وقت جب امان کو جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا بھلا وہ یہ سوچتا کہ اتنی کا کیا ہو گا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ دو روز کہہ دیا ہو گئی، فیکٹری سے لہلہ نے ایک ماہ کی رخصت لے لی امان سمجھیں اسے چور بخار ہے رات کو آتا ہے دن کو چلا جاتا ہے اسی بخار میں شاید اتنی مر جاتی لیکن امان کا فون آ گیا۔
 ”کب مل رہی ہو؟“ اس نے چمک کر پوچھا۔
 جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگی۔
 ”کب مل رہی ہو؟“ سوال پھر کیا۔
 ”بکھی نہیں۔“ رندھی آواز لے کر۔
 ”واپس جیل چلا جاؤں۔“ وہ بہت خوش تھا۔ وہ خاموش رہی۔
 بہت چھپ کر یس بدل کر امان دہی جا رہا تھا لیکن ایرپورٹ پر پکڑا گیا۔ اور اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس سے ایک بڑے بزنس مین کے چھوٹے بھائی کا لیکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ڈرائیونگ لہن کر رہا تھا۔ رات گئے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک بارٹی سے واپس آ رہا تھا، حادثہ سرسرا جاتا تھا لیکن اسے حادثاتی مانا نہیں جا رہا۔ انہیں ڈی ایچ اے سے رات

مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ امان کا موقف تھا کہ ان سب نے ڈرنک کی ہوئی تھی۔
 حادثے میں لڑکے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ کافی زخمی ہو گیا تھا، امان کے والد اور دوسرے تینوں لڑکوں کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ کیس عدالت تک نہ جائے وہ جرمانہ بھرنے کو تیار تھے۔ لیکن وہ مان نہیں رہے تھے۔ ناچار ان کے ارادے دیکھتے ہوئے ان سب کو ایک ایک کر کے مختلف ملکوں کی طرف بھگانا چاہا۔ مگر یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔ وہ پھر جیل چلے گئے۔
 وہ سب مقدمہ بھی لڑ سکتے تھے اور سالوں بعد ہی سی انہیں سزا سے بھی بچا سکتے تھے لیکن اس سب میں ان کا حلی جہاد ہو جاتا، وہ ایک گھنہ جیل میں رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے، کمال سالوں گزارتے۔
 ”اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہوتا ہے امان اس نے میری دعا قبول کی۔“
 جدید صدی کے جدید بچے کے لیے دعا جیسی چیز بہت پرانی اور فرسودہ سی تھی۔ جیسے اونٹوں پر سفر کرنا۔ جیسے ستاروں سے راستہ معلوم کرنا۔ جیسے طبیعت سے علاج کروانا۔
 ”گھروں میں بیٹھی لڑکیاں اور کر رہی کیا سکتی ہیں سوائے رونے اور گڑا کر دعا مانگنے کے۔“
 اس نے جیسے کھلا تسخیر اڑایا۔ جس بات پر اسے یقین نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وہ مذاق ہی اڑاتا تھا سب ایسے ہی کرتے ہیں وہ بھی یہی کرتا تھا۔ دعا اس کے لیے محض ایک رسم تھی۔
 ”ہاں! میں ضرور گھر میں بیٹھی تھی لیکن جس سے مانگا تھا اس پر ہر ممکن اعتقاد رکھ کر مانگا تھا۔“
 امان نے اس کے فلسفے کو مانا نہیں لیکن بات اور انداز اسے یاد رہ گیا۔
 اسے ہی چند لمحوں کے لیے اسے خیال آیا کہ امان کیسے وہ بزنس مین پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے فیصلہ واپس لے لیا اور جیسے جھٹ سے سب بگڑ گیا تھا ویسے ہی سب جھٹ پٹ سنور بھی گیا۔

اس نے پہلی بار خود سے اتنی کو دعا کے لیے اس وقت کہا، جب اس کے دادا پرچے اس کی پسند کے مطابق نہیں ہوئے تھے۔
 ”میں دعا کروں گی کہ تم پاس ہو جاؤ۔“
 روایت زندہ رہی امان ٹاپ کر گیا۔
 ”میں جانتا تھا۔“ اس نے اس انداز میں اطلاع دی جیسے بادشاہ تو میں ہی تھا نا۔ تو کج پوشی بھی میری ہی ہوتی تھی۔
 اتنی احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ ایک وہ تھی ہر معاملے میں پیچھے تھی اس نے ایف اے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور حقیقتاً اس نے بہت محنت کی تھی۔ اس نے اسے گریڈ لیا تھا۔
 اس بار بھی امان کو یقین تھا کہ وہ بہت اچھے نمبر لے گی، اللہ کا فضل ہو گئی تو یہ جو عورت ہے وہ اس مرد کو اور مرد کی محبت کو اتنا سر پر کیوں سوار کر لیتی ہے کہ قیل ہی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی عورت تھی اور کسی کام کی نہ ہوئی نا۔ یہ سب سوچنے کا اس عورت کے پاس وقت نہیں ہوتا جو ناکام ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔
 اتنی سب سے انجان ہو گئی۔ جیل سے اس سے اپنی امان سے۔ ان کے کام کر دیتی۔ ان سے بات کرنے کا وقت رہا نہ ڈھنگ۔ کم گو پہلے ہی تھی۔ اتنی کم گو بھی نہیں تھی اور باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ خون کا تعلق رکھنے والوں کے بڑے خوبی حقوق ہوتے ہیں۔ وہ حقوق نہیں جو کتابوں میں لکھ دیے گئے ہیں۔ کچھ غیر مرئی حقوق بھی ہوتے ہیں جنہیں انسانی رشتے اور تعلق قائم کرتے ہیں۔
 جب وہ دونوں اسے فیکٹری تک چھوڑنے جاتے تو اتنی باتیں کرتے اور وہ ہوں ہاں بھی نہیں کرتی۔ چھٹی والے دن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہے۔ اتنی کرے میں ایک طرف بیٹھی رہتی۔ کتاب کھلی ہوئی۔ امان سوچیں ٹیل ہونے کا صدمہ لے لیا ہے۔ ماموں زاد کلج جاتی ہیں، یونیورسٹی جاتی ہیں یہ ٹیوشن بھی نہیں جاسکتی، الٹا فیکٹری جاتی ہے۔
 ”تم فیکٹری چھوڑ دو اتنی!“ لہلہ نے اس کا سر

سہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم تھک جاتی ہو اور تمہیں پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔“

”میں تھک ہوں۔ اہل! اس نے کہہ دیا۔

گھر کے لیے تمہارے ماموں سے تھوڑا قرض لیا تھا مجھے صرف اس کے اترنے کا انتظار ہے۔ تمہارے بھائی بڑے ہوتے تو میں کبھی تمہیں اتنا کام نہ کرنے دیتی۔“

”میں جانتی ہوں اہل!۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”مجھ کو دکھ ہوتا ہے۔“

”ایسے نہ کہیں اہل!۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کے رویے سے اہل نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کما کر ان پر بہت بڑا احسان کرتی ہے اور انہیں پال رہی ہے جبکہ وہ سب تو ایک ساتھ ایک دوسرے کے لیے محنت کر رہے تھے۔

”تمہیں ٹوشن رکھوا دوں۔ معلوم کروں کسی کوچنگ سینٹر کا۔“

اس بار میں اچھی تیاری کروں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”مجھے تمہاری بہت فکر ہے افق۔“ وہ آنکھیں صاف کرتے لگیں۔ ان کے بچوں نے کبھی انہیں روئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں ان کے بچے انہیں روئے دیکھ کر خود بھی روئیں۔

”آج آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔“

”افق! نہ جانے کیوں۔ تمہارے لیے میں اندر ہی اندر ڈرتی رہتی ہوں۔ کوئی وجہ بھی نہیں۔ کچھ ہوا بھی نہیں۔ لیکن بہت دھم آتے ہیں۔“

اس کا جی چاہا کہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر انہیں اہل کے بارے میں بتا دے تاکہ اس کی ماں بے فکر ہو جائیں اور وہ ہم کرنا چھوڑ دیں۔

اہل انہیں تو وہ بھی اٹھ کر عصر کی نماز پڑھنے لگی۔ آج کل وہ ایک وظیفہ کر رہی تھی اہل کی کامیابی اور ترقی کے لیے پھر تجویز اٹھ کر ایک اور وظیفہ کرتی۔ اہل نے کہا کہ اس کے والد کی فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ الثابیرہ اپنی نے ہی مقدمہ کروا دیا ہے ان

پر۔ وہ بہت بری طرح سے پھنس گئے ہیں۔ بہت سے حالات سے گزر رہے ہیں۔

”اہل! برے حالات سے گزر رہا ہے۔“

افق کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ رات دن وہ ٹانگ کرتی رہتی نہ چاہتے ہوئے بھی نہ مانتے ہوئے بھی اہل اسے کہہ دیتا کہ دعا کرنا۔

کئی بار وہ کہتا کہ اسے اس سے ڈر لگتا ہے کہ وہ اسے بددعا نہ دے۔

”کوئی خود کو بددعا دیتا ہے؟“ افق پر اہل جاتی۔

”ہو مل جا رہا ہوں دعا کرنا۔ ٹیبل مل جائے خالی ورنہ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”کب سے کار بک کروا لی ہے۔ ابھی تک نہیں آئی۔“

”ایک پریشانی ہے بتا نہیں سکتا۔ پر بہت پریشان ہوں۔“

”ایک آرٹیکل لکھا ہے اقوام متحدہ کے لیے دعا گو آؤٹ اسٹینڈنگ رہے۔“

آرٹیکل آؤٹ اسٹینڈنگ ہو جاتا ہو مل میں جانے ہی ٹیبل مل جاتی کار آئی۔ کتب مل گئی۔ مقدمے سے جان چھوٹ گئی۔ ان کی پریشانی دور ہو گئی۔ یہ سب اتفاق ہو سکتا ہے لیکن افق نے یقین کر لیا کہ وہ دل سے دعا کرتی ہے اس لیے اس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف اہل اسے کہتا کہ وہ اس کے لیے اچھا سامان ہے جیسے بخوبی کسی خاص پتھر کو پہننے کے لیے کہتے ہیں اور وہ پتھر اچھا رہتا ہے۔ سب تھک ہو گئے لگتا ہے۔ اہل کے لیے وہ اب وہی پتھر بننے لگی تھی۔ ایسا ہی شخص تھا جو نہیں مانتا تو خدا کو بھی نہیں مانتا اور ماننے پر آتا ہے تو ہر انسان کو خدا اہل لیتا۔

وہ انجانی ترکیب کا عجیب انسان تھا ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ نرالا تھا۔ ایسے ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کسی پتھر کے ماننے بیٹھ کر مختلف بلاگز پر اپنا پریشانی لکھ کر ان کا حل مانگ لیتے ہیں۔ اپنے مسائل کے لیے گوگل پر بار بار ٹائپ کرتے ہیں لیکن ایک بار

بھی اللہ کے پاس نہیں جاتے۔ اللہ تعالیٰ۔ اللہ میاں بہت احترام سے کہتے ہیں مگر معلوم نہیں ہو تاکہ لٹا احترام کیوں۔

عجب اور نرالا ہونا برا نہیں ہے ہاں انجان اور لاعلم ہونا بہت ہی برا ہے۔

☆ ☆ ☆

اچانک بیٹھے اٹھائے افق کو جو خوف گھیر لیتے تھے ان کے زیر اثر ایک دن اس نے خوفزدہ ہو کر اہل سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچا۔“ جواب میں اس نے ایک بلند بانگ تہقید لگایا۔

”میں مر جاؤں گی۔ ایسے سوچنا بھی مت خدا کے لیے۔“

”کوئی نہیں مرتا۔ خدا کے لیے تو مر بھی جاتے ہیں انسان کے لیے بالکل بھی نہیں۔“

”میں مر کر دکھاؤں گی۔“

”میں دیکھوں گا۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی۔“

”میں بھی مذاق نہیں سمجھ رہا۔“

اور میں مر جاؤں تو کوئی فکر نہیں؟

”یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“

”بعد کی۔ میرے مرنے کے بعد کی؟“ یہ کہتے ہوئے ہی وہ مرنے والی ہو گئی۔ دوسری طرف لوٹ پوٹ ہوتا تہقید بلند ہوا۔

”افق! ایسی باتیں کرو گی تو میں تمہیں اٹھا لاؤں گا اسی وقت۔“

سارا امر نامارنا اڑ چھو ہو گیا۔ ڈر خوف دامن باتیں نکل گیا۔ افق چپ ہو گئی۔

”اب بولو نا۔ اب بولتی بند۔ تو میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آہم! بابائی کو یہ بھی معلوم ہو گا کب۔ ہو لیے بابائی۔“

”میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں۔“ رونے کی تیاری ہونے لگی۔

”مذاق نہیں ہیں اہل کی جان۔ مختلف ہیں بخوبی ہیں عجیب تر ہیں مذاق نہیں ہیں مجھے یقین نہیں آتا لیکن جھوٹ بھی نہیں سمجھتا۔“

”پھر ایک بات سن لو اہل!۔ اگر افق کو چھوڑنا ہی پڑے تو عزت سے چھوڑنا اہل! مجھ سی بے کار لڑکی کی محبت بے کار نہیں ہے۔ اسے اتنا رتبہ تو ملنا چاہیے کہ عزت سے رکھا اور چھوڑا جائے۔“

”تم یہ سب باتیں کیوں سوچتی ہو؟“

”کیوں کہ میں غریب ہوں۔ یم ہوں۔ چھوٹے سے ایک گھر میں رہتی ہوں۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ کیا ہے میرے پاس۔ سب کچھ تو تمہارے پاس ہے۔“

”اور جس دن تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہارے پاس کیا کچھ ہے تو مجھ سے انسان کو تم اپنے قدموں پر گرالو گی۔“

”ہر بات مذاق۔“ اتنی سنجیدہ بات پر بھی ایسا جواب دہ چڑ گئی۔

”میں یہ سب نہیں جانتا افق! نہ ہی میں اتنی گہرائی میں جا کر سوچتا ہوں۔ بس ایک بات معلوم ہے کہ تم مجھے پسند ہو اور رہو گی۔ آج بھی زندگی میں ہو کل بھی رہو گی۔ دوبارہ ایسی فضول باتیں نہ کرنا۔“

اور اس نے دوبارہ ایسی فضول باتیں کی ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی وہ ہمیشہ اسے عزت ہی دے گا۔ شادی کا وعدہ بھی اسی نے کیا تھا۔ اگر یہ وعدہ نبھانے سکا تو وہ تنگ سچ بولنے والا اسے صاف صاف کہہ دے گا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اتنا سچا ہے تو وعدے کا پکا بھی ہو گا۔ اہل اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

اہل نے کہا کہ اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرے تو اس نے بھی اچھے نمبروں سے ایف اے پاس کر لیا۔ خبر سنتے ہی اس نے ضد پکڑ لی کہ اب تو اسے اس سے ملنا ہی ہو گا۔ ساری رات شش و پنج میں گزار کر صبح نماز کے بعد دعا مانگ کر اور اہل پر مکمل یقین رکھ کر وہ فیکٹری سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل آئی اور اہل کے ساتھ

گاڑی میں آٹھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ دنیا کا ہر کام آسان ہے اس طرح امان کے ساتھ بیٹھنے سے۔ وہ بیٹھ گئی اور گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو بھی دیکھتی رہی امان نے کئی بار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ گود میں رکھے ہاتھوں سے نظریں بھی اٹھانے کے لیے تیار نہ تھی اور امان بھی چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی بیٹھی رہے اور وہ اسے دکھائے۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

مشکل ہے اس نے صرف نہ میں سرپایا۔

”اتنا نہیں چاہتی تھیں۔“

سرناں میں ہلانہ ہاں میں۔ نظر اٹھا کر نہ دی۔

جولالی گالوں پر آجاری تھی وہ شرم بھی تھی اور شرمندگی بھی۔ خوشی بھی اور پچھتاوا بھی۔ من چاہا بھی اور زبردستی بھی۔

یہ ملاقات اس نے امان کی ضد پر کی تھی اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زندگی بھر ایسی ملاقات دوبارہ نہ کرے۔

”تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے افق؟“ امان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ برف کابت بن گئی۔ ہمت جاتی رہی اور جی چاہا کہ چلا کر کہے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مجھے جانے دو خدا کے لیے۔“

ہاتھ وہیں رہا۔ جی بھی اندر ہی رہی۔ اس نے امان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جیسے فاختہ ڈار سے پھڑک کر سردبارش میں بھیگ گئی ہو۔

کشمیری حسن کے اس طرح بیٹھے رہنے پر اور نظر اٹھا کر ایسے دیکھنے پر ہر رنگ و نسل کی عورت کو دیکھ چکے، پرکھ چکے، مل چکے، جانچ چکے، ڈانس گور کے شہزادے کو اس اوپر کمال کا پیار آیا۔

جن کے ساتھ وہ دوستی کے نام پر قلمب کرتا تھا۔ وہ تو اس کے گلے میں جھول جاتی تھیں یہ تو محبت کی فہرست کی لڑکی تھی۔ شادی کے خانے میں نام درج۔

”چلو میں تمہیں واپس چھوڑ دیتا ہوں۔“

اس بار اس نے تائید میں سرپایا۔ کہیں وہ یہ بھی سمجھ بیٹھے کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتی۔

”میں یہاں رہتا ہوں افق! امان نے گاڑی ہونے کر ایک بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ لایا تو وہ اسے اندر سے جانے کے لیے تھا لیکن مشکل ہی تھا۔

وہ اسے اس کے گھر پر چھوڑ گیا۔ وہ اس کے لیے چند تحائف لایا تھا اس کے پاس ہونے پر۔ پہلی بار ملنے پر۔ امان سے اس نے ہلانہ بنا دیا کہ فیکٹری کی ایک فہیل اس کے ساتھ انارکلی بازار خریداری کھانے آئی تھی۔ سلمان زیادہ تھا تو کچھ شہر زاسے رکھنے کے لیے دے دیے۔ امان نے لمحے کے ہزاروں حصے پر بھی اس کی طرف ایسے نہ دیکھا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سچ کہ جھوٹ۔

اس نے سب کچھ اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ دیکھا بھی نہیں۔

امان نے کہا کہ وہ اسے کلج میں داخلہ دلا دیتا ہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اگر وہ کلج جائے گی تو فیکٹری کولن جائے گا اور پھر گھر کیسے چلے گا۔

”میں تمہیں استنبیہ دے سکتا ہوں۔“

”میں امان سے اتنے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی۔“

”میں چاہتا ہوں افق! تمہارے پاس ایک انجی ڈگری تو ہو۔“

”لی اے کے بعد میں یونیورسٹی ضرور جاؤں گی۔“

”اگر نہ گئیں۔“ وفداق نہیں کر رہا تھا۔

”میں جاؤں گی۔“

”تم نہیں جاؤ گی۔“ بے انتہا سنجیدگی سے کہا۔

میل۔

”تم ایسے کیسے۔“ دکھ ہو رہا تھا۔

”دیکھ لیتا۔ تم زندگی میں کبھی کبھی کر سکتی۔“

لوگ ناکام ہوتے ہیں یا آخری نہیں ہوتے۔

ہیں۔ تم وہاں تک بھی نہیں جاسکتیں۔ تم جیسی لڑکیاں

افق گھروں میں ہی رہ سکتی ہیں۔ اچھا ہے گھر میں ہی

رہو لیکن اگر ضرورت پڑے اور مستقبل بنانا ہو تو تم جیسی لڑکیاں بے کار ہیں۔ ہر سال میرا ایک لڑکی کے ساتھ ہی مقابلہ ہوتا ہے اور میں ہر بار اسے ہرا کر ٹاپ کر جاتا ہوں پر اس لڑکی کی محنت کی دلوں ہوں۔ کمال کی لڑکی ہے اگر میں اس کی فکر نہ ہوتا تو اسی کے نام کے ڈنکے بجے اور اگر تم اس لڑکی کی جگہ ہو تیں۔ فرض کیا صرف۔ نہیں یہ فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔“

امان رنگ بچ بولا تھا۔ وہ یہ جانتی تھی لیکن اس سچ نے اس کی آنکھیں نم کر دیں۔ چار سال جو اس نے دن رات محنت کر کے فرمایا اور چھ گھنٹے جو وہ فیکٹری میں کھڑے ہو کر کام کرتی ہے۔ ایک دن بھی کسی کو اس کے کام سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ فیکٹری کے چھ گھنٹے اور فرمایا نے کے سولہ گھنٹے اگر وہ کتاب پر لگاتی تو پاکستان بھر کے طلباء کو پیچھے چھوڑ دیتی۔ جو شخص سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدتا ہے اور جن کتابوں میں بہت سے ختمے پھٹے ہوئے ملتے ہیں اور انہی صفحات سے کوئی سوال آجاتا ہے تو ایسے شخص کے گریڈ کتنے ہوئے اس کی مشکلات بھی ضرور گنتی چائیں۔ اگر وہ کلج جائے اور گھر آتے ہی اسے تین وقت کا کھانا ملے تو وہ بھی امان جیسے ہر طالب عالم سے گھر لے سکتی ہے۔ جو بھی ہو اسے خود پر شرمندگی ہوئی۔

پہلی بار اس نے اپنی زندگی کو شکوے کی نظر سے دیکھا۔ اس نے غصے میں گلاس زمین پر دے مارا اسے فحشہ آیا کہ اس کے پاس وسائل کیوں نہیں ہیں۔ وہ کیوں غریب ہے۔ فیکٹری گئی تو سارا کام الٹا پلٹا ہو گیا۔ کہتے ہیں جس اناج میں حرام کا ایک دانہ آجائے وہ سارے اناج کو جلا کر دیتا ہے۔ پہلے افق کے مزاج بدلے وہ ہر وقت چمچڑی رہنے لگی بات بات پر غصہ کرتی، امان حیران ہو تیں پھر ریشٹن رہنے لگیں ایک دو بار پوچھا پر اس نے ایک لفظ نہ کہا۔ امان انجانی سوچوں سے شرمندہ ہوتی رہیں۔ اسی پچھلے دنوں ماموں کے چھوٹے بیٹے کی مگنی کی

خبر لگی تھی۔ بھی مامی میں ماموں نے کہا تھا کہ وہ کشمیر کی گلی کو اپنے اس بیٹے کے ساتھ ہاتھ دیں گے۔ امان بھی شاید اندر ہی اندر اس کی آس متحور درخت بن گئی۔ اب کلے نہیں کٹ رہی مگر معلوم پسند کرتی ہو اسے۔ بچپن تک اچھی ہی دوستی تھی دونوں میں۔ شاید۔ شاید۔ کچھ اور بھی ہو۔

”اس نے صرف امان کی گود میں سر رکھ دیا۔ میرے لیے دعا کیا کریں امان۔! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

اس دوران ایک اور واقعہ ہوا۔ جس فیکٹری میں افق جاتی تھی ان کے بارشیز کے درمیان لیبر کی کٹوتی کوٹنے کر جھگڑا ہوا۔ کبھی کسی کو فارغ کر دیا جاتا کبھی واپس بلا لیا جاتا۔ جھگڑا بڑھا اور فیکٹری غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی۔ افق حقیقتاً بہت ریشٹن ہو گئی۔ باقی کاموں میں اتنے میسے نہیں بنتے تھے اور کوئی کام وہ کر نہیں سکتی تھی۔ کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کرتی تو بمشکل ہی دو ڈھائی ہزار ملتے۔ اس نے امان کو آرام کرنے اور خود ان کی جگہ جانے کے لیے کہا پر وہ نہیں مانتی۔

امان اپنے شہر گیا ہوا تھا، کبھی کبھاری اس سے بات ہوتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس بار پلٹا سے افق کی بات کرنے جا رہا ہے۔

وہ نہیں مانتی گے۔ وہ افسردہ ہو گئی۔

”ہے تو ایسا ہی۔“ اس نے بھی تسلی نہیں دی۔

”پھر؟“ اس کی سوال پوچھ سکتی تھی۔

”وہ مامی کے نہیں یہ سچ ہے پھر ظاہر ہے کہ مجھے

خود ہی اسٹینڈ لینا ہو گا اکیلے ہی۔“

”کیلئے کیسے۔“

”پاگل لڑکی! تم لوہ میں۔ میرے اکاؤنٹ میں

پیسے ہیں اور میرا مستقبل روشن ہے۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔“

”وہاں جائیں تو کتنا اچھا ہو۔“ ایک طرف افق کو یہ

سن کر خوشی ہوئی کہ امان اسے اپنے دل بوتے پر پالے گا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی ماربل کوالٹی، کپریٹڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

☆ ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مے جو درد سر بنے گا اس کا سر پھوڑ دیں گے
تو اس ایگل گروپ کے ہر رکن نے ہر وہ کام کیا جو
ان کے جی میں آیا۔ ہاسٹل کے ہی ایک دو حصے
گروپ کے ساتھ ان کی گرما گرمی ہو گئی، انہوں نے
ان کے کمروں میں ڈرگ اور شراب چھپادی اور چھپے
پڑا دیا۔

ان ہی دنوں جب وہ زخمی ہو کر بستر پر تھا اس نے
افتخار کو ڈھونڈ نکالا۔

جیسے کالے سیاہ آسمان پر پہلی تاریخ کا چاند ساری
توجہ کھینچ لیتا ہے۔ ایسے ہی افتخار کی آواز اور انداز نے
اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے ”جی“ کے نام سے نمبر
محفوظ کر لیا۔ مختلف چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان چیزوں میں
ایک بد نما یا عجیب سی رکھی ہوئی مل جائے تو طے
چلتے قدم رک ہی جاتے ہیں۔ ذرا سادہ لگنے کے لیے
کہ یہ ہے کیا۔ اسی طرح افتخار کو ذرا سادہ لگنے کے لیے
امان رک گیا۔

کسی لڑکی پر وہ اتنا وقت برباد نہیں کرتا تھا۔ جن
لڑکیوں کو اس نے فون کالز کی۔ اس کی دلکش آواز
سننے ہی دوسری بار انہوں نے خود کل کی بھر اس لڑکی
نے فون ہی بند کر دیا۔ اسے وقتی حیرانی ہوئی۔ بھارت
انا اور ذاتی ریکارڈ پر آگئی کہ یہ کون لڑکی ہے جو دوسری
لڑکیوں کی طرح نہیں۔ فون نہیں سنی۔ مسج کا
جواب نہیں دیتی۔۔۔ ہے کیا یہ لڑکی۔ اتنا تو وہ اس کے
انداز سے سمجھ ہی چکا تھا کہ اس بے چاری کے لیے
”امان“ پہلا تجربہ ہے۔ امان کا یہ ذاتی ریکارڈ افتخار جیسی
لڑکی توڑ رہی تھی۔ بات وقت گزاری سے آوازی
پسندیدگی تک آئی۔۔۔ ریکارڈ سے دل لگی تک جانے
لگی۔

دل لگی سے بات ذرا سنجیدہ ہو گئی۔ امان نے سوجا
کہ بے چاری حد سے زیادہ شریف ہے۔ اور غلط کو غلط
ہی سمجھ رہی ہے۔ وہ غلط کو غلط سمجھنے والی اسے ٹھیک
لگی۔ اتنی لمبی فہرست میں کوئی ٹھیک بھی ہونا چاہیے۔
وہ بے چین تو نہیں ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب اس

چھوڑے گا نہیں اپنے خاندان کو جانتا ہے اسی لیے
فیصلہ کر چکا ہے۔ دوسری طرف وہ اسی فیصلے سے گھبرا
گئی۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ پلان کر لیا
ہے۔“ وہ ایسے ہی آرام سے ”اطمینان سے انتہائی
سنجیدہ باتیں کیا کرتا تھا“ جیسے چیونٹم چبا رہا ہو یا مووی
دیکھ رہا ہو اور اپنے ملازم سے کہہ رہا ہو ”ہاں ہاں اور ج
جوس ہی۔“

”امان کا مستقبل روشن ہے۔“ افتخار بے فکر ہو گئی
خاندان کی مخالفت اپنی جگہ۔ امان کی حمایت۔

”یہاں سے“ ملا سے بات کروں گا۔ ہر طرح سے
انہیں راضی کروں گا۔ وہ مان جائیں گے۔ میری مان
ہی جاتے ہیں۔ تمہیں دیکھیں گے تو اور مان جائیں
گے۔“

”مجھ میں ایسا کیا ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر مان جائیں۔“
افتخار کے آگے اس کا چھوٹا سا گھر گھوم گیا۔

”دیکھیں گے تو ان ہی سے پوچھ لیتا۔ جب وہ اپنی
پلیس بھی نہیں جھپک سکیں گے۔ بت بن جائیں
گے۔“ افتخار مسکرا اٹھی۔

”ایسی بھی بات نہیں ہے۔“
”مجھے تو لگتا ہے کہ تم انہیں مجھ سے زیادہ اچھی لگو
گی۔“



وہ ہر طرح کی تعلیمی سرگرمی سے تین ماہ پہلے ہی
فارغ ہو چکا تھا۔ یہ عرصہ اس نے پارٹیاں کرنے اور چند
دوستوں کی شادیاں اینڈ کرنے میں گزارا تھا۔ اس
دوران وہ دوبار گھر ہو کر آچکا تھا لیکن افتخار کو نہیں بتایا تھا
یہاں چھپانا مقصد نہیں تھا عادت وجہ تھی ”ایگل
گروپ کے سب ہی کارکنوں نے ساریاں بتیاں بچھا کر
سگریٹ لائٹر جلا کر مشترکہ حلق لیا تھا کہ وہ اپنی تعلیم
کے دوران کے اس عرصے کو ہر رنگ سے سجادیں گے۔
کوئی ٹینشن نہیں لیں گے۔ جوتی میں آئے گا کریں



نے سوچا کہ بھاڑ میں جائے تو سوچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ پھر سے اسے مسیج لکھ رہا تھا اور انتظار بھی کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی ایک رگ اس خاموش لڑکی کے ساتھ جھڑک رہی ہے۔ اس نے ایک جھوٹا سا ڈرامہ کیا اور اس کا جواب آگیا۔ اسے اچھا لگا۔ خوش ہوئی۔ اسے اتنی پسند آگئی۔ اس نے اتنی کو بلی ٹکریں سے الگ ہی رکھ لیا۔ اس سے اپنی ذاتی باتیں شیئر کر لیتا جو کسی اور سے نہیں کرتا تھا۔ اسے بھی باہر لٹنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ اسے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر ڈسکس نہیں کرتا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک آنکھ دھا کر اس کا کوئی دوست "کیسی ہے وہ" کہہ کر اتنی کے بارے میں پوچھے۔

ننانہ جدید کے لوگوں میں نانہ قدیم کی اتنی پر اس کا دل آگیا۔ وہ اسے بے حد پسند تھی۔

وہ اس سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ پہلی بار صرف اسی سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اتنی کے معاملے میں وہ کھانے میں نہیں رہے گا۔

اس کے جیل جانے پر بہت سی لڑکیوں نے فون کر کے اپنی پریشانی ظاہر کی۔ اپنی مدد پیش کی لیکن جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد جو آواز اس نے اتنی کی سنی تھی اس نے اسے حیران کر دیا۔ اسے اس پر پیار آیا۔ وہ اسے اور اچھی لگنے لگی۔

پلیا خود ہی لاہور ڈی ایچ اے آگئے۔ اپنے دوست کی آمد کے بارے میں بتانے کے وہ منتظر رہا۔

"تمہارا دھیان کہیں اور ہے؟" انہوں نے پرانا۔ وہ سنبھل کر بیٹھا۔ "کب آرہے ہیں انکل؟"

"وہ تو آتا جاتا رہتا ہے۔ اس بار خاندان کے ساتھ آ رہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کے انتظار میں ہیں اس بار۔"

"ضرور ہوں گے۔" وہ ابھی بھی متوجہ نہیں تھا۔

"تم مجھ سے اپنی بات نہ کرو۔" بائیری سن لویا مجھے وقت دے دو لکھ کر کہ اس وقت بات کریں۔" کواز تختی اور فیسے سے تن گئی۔

"مجھے کرنے دیں بات۔" وہ جان چکا تھا کہ اس دوست کے بارے میں کیوں بتایا جا رہا ہے۔

"ایک لڑکی ہے۔" بیس سے مناسب لگا بات شروع کرنا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ "آگے۔"

اس سوال آگے نے اس کی جراث کو پیچھے ہی کر دیا۔ کیونکہ آگے پیچھے اور کچھ بتانے کے لیے تھامی نہیں۔

"اتنی۔۔۔ وہ مجھے پسند ہے اور بس۔" کواز سب انہیں جانتا نہیں تھا۔ انہیں جو جانتا تھا وہ بتا کر شرمندہ ہی ہو گا۔

"وہ میرے کل لڑکے سے نہیں ہے۔"

"اس شہر سے تو ہے نا۔" ان کے انداز میں گہری تاثر تھی۔

"آپ چلیں گے میرے ساتھ۔" اور تفصیل اور کیا بتاتا۔

"ضرور چلیں گا لیکن تم جانتے ہو کہ جیل میں پہل میں نہیں کرتا۔ تم انہیں سب ملو۔"

"وہ ایسے نہیں آسکتے۔" بات پھر وہیں آگئی تھی۔

"پھر کیسے آسکتے ہیں وہ۔"

اسے لگا کہ اس کا باپ ایک اچھا وکیل منگلی بھی ہے وکیل استغاثہ بھی اور جج بھی اعتراضات بھی دیتی تھیں گے اور فیصلہ تو کرنا ہی انہیں ہے۔

وہ جھنجھلا گیا وہ جان گیا کہ پلیا کیا سمجھ رہے ہیں انہیں لگ رہا ہو گا کہ وہ آگے پیچھے چلتی چلتی کارڈل میں ان کے فارم ہاؤس پر آئیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ گالور اسی دور ان سب معلوم ہو جائے گا کہ کون کس کے ہم پلہ ہے۔

"ہماری کلاس کے نہیں ہیں وہ۔"

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ پھر وہ ایسے غصے جیسے پہلے سے جانتے تھے۔

انکل کی شکل پر آنے والے تاثرات دیکھنے لائق تھے۔ وہ بھی کواز کی آنکلی سے نکلتے تھے نہ ہی سیدھی

ہے۔ وہ پیٹھے میں سوراخ کر دیتے تھے۔ پیش کے زرا پاس رکھ دیتے تو پھل کر نچوڑ لیتے تھے۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ تم ایک مسئلے میں کس بری طرح سے پھنس گئے تھے۔ وہی کار ایڈکسٹنٹ ڈیلا مسئلہ۔"

"یاد ہے۔" حیران ہوا۔

"جانتے ہی ہو گے کہ میں نے کیسے تمہیں اس مسئلے سے نکالا۔ کس کس سے رابطے کیے میں نے۔ سب تو میں نے اپنے پیٹے کے لیے کیا۔ وہ اپنے دلدادہ تھے۔ لے لے کیا کر سکتے ہیں۔ اگر تم کسی مسئلے میں پھنس جاؤ۔ تم سے کوئی مل ہو جائے، تم جیل چلے جاؤ یا نہیں اور دھر لے جاؤ۔ کسی دشمن کی پکڑ میں آ جاؤ تو کسی گورنر کے قریب جرح منسٹر کو فون کر دیتے ہیں۔ یا چلو کسی چھوٹے سے ایس پی کو ایم پی اے کہہ کر تمہارا لہو ہو جاؤ تو کسی بینک سے تمہیں چند کروڑ کا لون دلا سکتے ہیں؟"

اس کے باپ نے تین فیکٹریاں رات سوتے میں بنے دیکھتے دیکھتے ہی نہیں لگال تھیں۔ وہ تو فیکٹری میں کام کرنے والے جو کیداروں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اس کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے اپنے باپ کی ہر بات کو درست مانا۔

"مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔" محبت کا لفظ اس نے استعمال نہیں کیا اور اسی کا سہارا لیا جس سہارے سے اسے ہر چیز مل چلا کرتی ہے۔

"تمہیں کیا اچھا نہیں لگتا سن۔ چند سال پہلے تم ایک ہلی ووڈ کی ماڈل کے بارے میں بہت باتیں کرتے رہے ہو اور تم یہ دعویٰ بھی کرتے رہے ہو کہ تم اسے ضرور حاصل کرو گے۔ تم نے اپنے کمرے کی دیواروں کو اس کی تصویروں سے بھر دیا تھا۔"

"نہ بچپن تھا۔" اسے وہاں یاد آگئی۔

"تو یہ سب کیا ہے؟"

"میں سنجیدہ ہوں۔" اس نے پہلو بدلا۔

"جیسے تم خلائی سفر جانے کے لیے سنجیدہ تھے۔"

"وہ مشکل تھا۔" اپنے پلیا کی یادداشت پر وہ عیش

عیش کر اٹھا۔

"یہ بھی مشکل ہے سن۔ بہت مشکل بلکہ ناممکن۔"

"مجھے اتنی سے ہی شادی کرنی ہے پلیا۔ آپ ان جانیں گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔ بہت آرام سے درخواست کی۔"

"فیصلہ کر چکے ہو؟" آرام سے ہی پوچھا گیا۔

وہ خاموش ہی رہا۔

"ٹھیک ہے کرو۔ تعلیم تو مکمل کر چکے ہو۔ شادی بھی کر لو۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ پھر میرا تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا۔"

"پلیا پلیز۔"

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔

"کتنے مل لو۔"

"میں ان سے مل چکا ہوں کئی بار۔" کتنا کا تذکرہ اسے برا لگا۔

"پھر ملو۔"

"ماریہ مجھے پسند نہیں ہے۔" اس کے اعصاب تن گئے۔

"تم اسے ایک بار پو پو کر چکے ہو۔ واپسی پر تم کافی ڈسٹرب رہے تھے اس کے انکار پر۔" وہی مکمل کی یادداشت۔

"اتنی اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔"

"صرف خوب صورتی پر ہی فدا ہو گئے ہو۔ تو پھر ڈبل ڈبل کرو نا۔ ڈبل فائدہ لو۔ ماریہ خوب صورت بھی ہے۔ آٹا کی بیٹی بھی۔" دے تلی والا انداز تھا۔

"پلیا! اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔"

"سن۔" انہوں نے آنکھوں کو گہرا زاویہ دیا اور آواز میں غرور اور تنبیہ بھری۔ "اگر میں تمہیں کسی جھوٹے مقدمے میں جیل کروا دوں تو تم یا کوئی کیا کرے گا۔ باہر آ جاؤ گے۔ شادی کر لو گے پھر اس لڑکی سے۔ تو سن۔ اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو جو وقت بڑھنے پر چھلکے۔ بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکل لے۔ یہ ہاتھ تمہیں خود بخود

”جہاں“
 اپنے آپ کے دلائل کے سامنے ابھی بچہ تھا۔
 ”تمہارے جیسے لڑکوں کی پسند، محبت، عشق سے
 میں خوب واقف ہوں، چند دن پہاڑوں پر چڑھتے ہیں
 پھر سمندروں سے عشق کرنے لگتے ہیں پھر غاروں میں
 جا چھپتے ہیں، چند دن جنگل جنگل۔ پھر شہر شہر گاؤں
 گاؤں، تم ایک جنس ہو اور کئی دوسری جنسوں میں
 حلول کرتے ہو، جڑتے ہو ٹوٹتے ہو اور پھر واپس خود
 میں آجاتے ہو۔ تو میں تمہارا باپ ہوں۔ خود میں
 جھانک کر دیکھو۔ تم چاہتے کیا ہو۔ کیا صرف وہ لڑکی
 ہر چیز ہر رتبے سے بالاتر صرف وہ لڑکی۔؟ وہ لڑکی
 نہیں پسند ہے ہمیشہ رہے گی یہ جانتے بھی ہو کہ میں
 ”کنڈے پر چھلکے ہوئے گروہ چلے گئے۔
 زبردستی گئے وہ قائل نہیں تھے ہاں ترکیب عمل
 کے بہت بڑے مداح تھے اگلے ہی ہفتے اسے ساتھ
 لے کر امریکا آگئے کہ انہیں شرمندہ نہ گردانے اور آتما
 سے صرف مل لے پھر بے شک انکار کر دے۔
 آتما ان کے دوست تھے لیکن دولت نے ان میں
 چار پانچ پر زیادہ ہی لگا دیے تھے اسی لیے ان کی پرواز
 سب میں اونچی تھی دوستی میں جیسے ہوئے گئے عتاو
 اور بغض کو غلام علی ہی بھلاتے تھے کسی اور طرح تو آتما
 کی دولت ہاتھ آتی نظر نہیں آرہی تھی انہوں نے
 بہت بار کوشش کی کہ وہ ان کے پارٹنر بن جائیں مگر بار
 امریکا بڑے بڑے منصوبے لے کر گئے لیکن وہ سگار
 پیتے سنتے رہتے سب سن کر آخر میں سر ہلا کر دیتے۔
 ”ضرور کرو۔ ضرور کرو۔ بیسٹ آف لک۔“
 ان کی اتنی باریک بیسٹ آف لک کے باوجود غلام
 علی نے ان کا پتہ چھوڑا۔ کھوٹے سکے اور کھوٹے
 بیٹے کی طرح انہیں یقین تھا کہ یہ آتما بھی ضرور کام
 آئے گا۔ غلام علی کو یقین تھا کہ وہ رشتہ داری پر اتنی
 جائے گا۔
 ہوئی سے یہ لوگ پہلے ان ہی کے پاس گئے۔
 ماریہ نے شاید شوق شوق میں پاکستانی لباس پہنا تھا۔
 سفید شیفون کی ٹیبل اور سفید ہی چوڑی دار پاجامہ

۔ دوپٹا لگا کر لندن تھا اور ستاروں جیسا جھلکا رہا تھا۔
 عدنان نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے تین انگلیوں سے
 اس کے ہاتھ کو چھو کر ہائے کا جواب دیا۔ وہ پٹا جو اس
 سے سنبھلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ کبھی کنڈے سے دھمکتا تو
 کبھی گردن سے۔ وہ اکٹھا کر کے گردن میں جن دھڑکیں
 بھی ذرا سا ہلتی تو وہ دھمکتا کر گرنے کو آجاتا۔ تو وہ اسی
 مشغلے میں مشغول تھی۔
 عدنان ٹھیک آٹھ سال بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ اور
 اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ لوگ بدل جاتے
 ہیں لیکن کیا وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور سے اور خوب
 صورت ہوتے جاتے ہیں۔ ایک بار خوب صورت پیدا
 ہونے والے پھر بس کیوں نہیں کرتے۔ مصری
 حسیناؤں کی فرعونیت سی ادا ہے وہ لا تعلق سی ایک
 طرف بیٹھی تھی۔
 عدنان کی بہن شائل نے اس سے باتیں کرنے کی
 کوشش کی مگر وہ چند ایک بار ہونٹ کھول کر بکریاں
 بیٹھی رہی یہی کام عدنان نے کیا تھا اور اس کا جواب بھی
 یہی ملا تھا۔
 ڈنر کے لیے انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ اس کے پیلا
 اور ماریہ کے ڈیڈ پھلے سے ہی وہاں موجود تھے عدنان کی
 ملا ماریہ کی ملا سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
 ڈنر کے لیے وہ باہر جانے لگیں تو ماریہ جو ٹانگ پر
 ٹانگ رکھے بیٹھی تھی، مٹی تو وہ پٹا پھر پھسل کر اپنی
 قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ عدنان ذرا سا جھکا اور دوپٹے کو پکڑا
 وہ خود جھک کر اٹھانے والی نہیں تھی وہ بنا دوپٹے کے
 ہی نکل جانے کے ارادے سے تھی۔ اتنے غم سے اس
 نے کبھی انسانوں کے نہیں اٹھائے تھے کہاں ایک
 کپڑے کے اٹھائی۔
 شیفون کے جھلک کرتے دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں
 لے کر عدنان نے ایک کنڈے سے دوسرے کنڈے پر
 جمایا۔ اور دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔
 ”آسمان سے اتر کر سیدھی بیٹیں آ رہی ہو؟“
 اس نے جیسے سنا ہی نہیں قدم بڑھائی گئے ملنے
 گئی۔ عدنان بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ چند قدم

آگے چل کر اسے خود سے دو قدم پیچھے محسوس کر کے
 اس نے گردن موڑی۔
 ”ابھی تک ویسے ہی ہو۔“
 عدنان نے اپنا جائدار قہقہہ اس کی پشت پر چھوڑا۔
 جب وہ انیس سال کا تھا تو تیسری بار امریکا ان کے پاس
 گیا تھا۔ پہلی بار وہ صرف چھ سال کا تھا دوسری بار
 صرف نو سال کا اور تیسری بار میں نے نئے جوش اور
 نئے خیالات سے بھرا انیس سالہ عدنان تھا۔ پلاٹو
 آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ صرف تین بار ہی گیا۔
 پلاٹو نے اس سے بار بار کہا تھا کہ وہ ماریہ سے دوستی کر
 لے۔ اس کے ساتھ کھوٹے پھرے۔ اس کے
 دوستوں سے ملے۔ لیکن ماریہ کا ذکر اتنی بار سننے کے
 باوجود وہ اس بات کے لیے بالکل بھی راضی نہیں تھا
 وہ اپنی مرضی سے بولتا تھا، دوست بنانا تھا اور لڑکی نام
 کی چیز کو اس نے اب تک صرف زچ ہی کیا تھا۔ ماریہ
 کے ساتھ بھی وہ یہی سب کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔
 لیکن ہوا کچھ یوں کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس نے
 گھنٹوں تک اسکرٹ گلاٹنگ شوز اور لمبے بالوں کی پونی
 ٹیل میں ایک حورا سپورٹس کار میں بیٹھتے دیکھ لی اور
 کمرے کھڑے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اسی
 سے شادی کرے گا بلکہ ساتھ ہی لے کر جائے گا۔
 وہ دن سے لوگ ان کے یہاں تھے لیکن ماریہ سے
 ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی مام نے بتایا تھا کہ وہ
 کسی انجینس کے ساتھ پیرس ملا ٹانگ کے لیے گئی ہے۔
 اوہراوہر گھومنے پھرنے کے لیے جانے کے بجائے
 وہ سارا دن ماریہ کا گھر میں ہی انتظار کرتا رہا۔ لہجہ ہو گیا،
 ڈنر ہو گیا، رات گہری ہو گئی لیکن وہ نہیں آئی انتظار
 کرتے کرتے وہ کھڑکی کے پاس ہی کرسی پر اونگھنے لگا۔
 کار کے ہارچہ جانے کی آواز پر وہ جاگا جب تک
 گردن نکال کر دیکھا۔ اس کی پشت ہی نظر آئی، چڑ کر
 عدنان بیڈ پر جاسویا شادی کا ارادہ کر کے اسے اپنی بیوی
 ہی سمجھ بیٹھا تھا اور اس کی بیوی اتنی دیر سے گھر آئی
 گی رات دیر تک جاگنے کے باوجود وہ صبح جلدی اٹھا کہ

وہ پھر نہ چلی جائے، لیکن وہ دیر تک سوئی رہی سچ نام پر
 ناشتا کیا۔
 ”ہائے۔“ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ نامناسب سا
 لباس پہنا تھا شیشے کی میز پر ٹانگیں رکھی تھیں اور ان ہی
 ٹانگوں کی سیدھ میں کاؤچ چروہ آکر بیٹھا تھا۔
 ”اوپہائے!“ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ ”کیسے ہو۔“
 کب آئے۔؟
 ”ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔“ اس نے جیسے شکوہ
 کیا۔
 ”کنڈ۔ دیکھ لیا امریکا؟“ ہر پاکستانی کو امریکا میں
 ایسے سوالات سے ہی کیوں نوازا جاتا ہے۔
 ”میں امریکا دیکھنے نہیں آیا۔“
 ”تو۔؟“ براؤن بریڈ کا پیس اس نے ادا سے کترا۔
 ”اکیلے کیسے دیکھ لوں۔“ اسے نئی ترکیب
 سوچھی۔
 ”تمہارے مام ڈیڈ بھی تو آئے ہیں۔“ فریش جوس
 کا گھونٹ لیا۔
 ”اگر تم پاکستان آؤ تو میں تمہیں خود سارا پاکستان
 گھماؤں۔“
 وہ ہنسی۔ جوس کا ایک گھونٹ لیا ”پاکستان گھومنا
 کون چاہتا ہے۔“
 پاکستان سے تو عدنان کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بے عزتی
 اسے اپنی آفر کے لیے مذاق اڑائے جاتے پرزہوئی۔
 گلاس میز پر رکھ کر وہ اٹھ کر چلی گئی، عدنان منہ دیکھتا
 رہ گیا۔
 اگلے تین دن وہ اس کامنہ دیکھنے کا انتظار کرتا رہا
 لیکن وہ رات گئے آئی۔ صبح سویرے ہی چلی جاتی۔
 بہانے سے اس نے پوچھا تو مام نے بتایا کہ کج کل
 سہر سلا چل رہی ہیں۔ پتالے کر وہ اسٹوڈیو ہی آگیا۔
 کسی گھر شل کے لیے سہر سل کی جاری تھی، سو کے
 قریب لوگ تھے عدنان نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔
 اسے دیکھ کر وہ صرف مسکرائی اور اپنا کام کرتی رہی۔
 ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔
 عدنان سچ نام کا انتظار کرنے لگا۔ لہجہ نام آیا۔

”کیونکہ میں تمہارے لیے پر لکھت ہوں۔“
گروں کو اٹھا کر خر سے کھلا
وہ اتنی دور سے تھی کہ اس کی ہیزوں پر بیٹھے
لوگ گروں میں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔
(باقی آئندہ ماہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بہاول	آمنہ خان	500/-
درد دوم	راحہ جبین	750/-
دعائی اکہ دوشی	رعنا نگار رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رعنا نگار رحمان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جوں	آسیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فاطمہ انوار	500/-
بہول بھلاں حیرتیں بھلاں	فاطمہ انوار	600/-
بھلاں دے سنگ کالے	فاطمہ انوار	250/-
یہ گلیاں یہ چہرے	فاطمہ انوار	300/-
محبت سے محبت	غزالہ عزیز	200/-
دل اسے صاف دلا	آسیہ رزاقی	350/-
نکھرنا ہائیں غراب	آسیہ رزاقی	200/-
دل کو بندھی سمائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
لادوں کا چاند	ہزری سمیرا	200/-
رنگ خوشبو بہا ہا دل	انصاف الزہری	500/-
صدا کے قافلے	رجہ جمیل	500/-



میں یونیورس تھی تو وہ مسٹر پاکستان تو ضرور ہی تھا۔
ایک پوائنٹ یہ ہوا۔ دونوں کے والد آپس میں
دوست ہیں، دو سرا پوائنٹ۔ دونوں اس رشتے پر
خوش ہوں گے تیسرا پوائنٹ اور سب سے اہم پوائنٹ
کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرے گا
امریکیوں کی طرح نہیں کہ چند دنوں میں چھوڑ جائے۔
امریکا ایسے دھوکے باز معاشرے میں عدنان جیسے
بہرے کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ یہ پوائنٹ
زبردست تھا۔ بیٹھے بیٹھے عدنان اس نے اپنے اندر بے
تحاشا خوبیاں کھوج لیں۔ اور اسے اپنی ذات اعلا و
ارفع نظر آنے لگی دنیا کا ہر شخص ماریہ کے لیے بے کار
اور ناکارہ نظر نہ آئے لگا اور ماریہ اسے اپنی محبت کا دم
بھرتی نظر آئی۔

”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔“ اس نے مسکرا کر
اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔
کافی کالم اس نے سامنے میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ
پیٹ کی طرف باندھ لیے۔ ”سنگی؟“ اس کی ہمت
بندھی اور اشیائے میں سر ہلایا۔

”اتنی اچھی کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“
اپنی طرف سے اس نے دھماکا کیا۔
”گڈ!“ وہ اسی انداز سے بیٹھی رہی۔

”تم سے محبت کرتا ہوں ڈیر۔“ دوبارہ اس لیے کہا
کہ اسے اچھی طرح بتا دے کہ یہ کوئی عام بات نہیں
ہے ایشیا کے مرد کی محبت بہت بڑی چیز ہے۔
”مجھ سے تو ہر دوسرا لڑکا محبت کرتا ہے۔“
”مجھ میں اور لن میں فرق ہے۔“ اب وہ دلا تل پر
اتر آیا۔

”کیا فرق ہے؟“ اب وہ دلا تل لینا چاہتی تھی۔
”میں تجھی محبت کرتا ہوں۔“ اسے صرف یہی بات
سمجھ میں آئی کہنے کے لیے۔

”تجھی محبت کے کتے ہیں؟“
”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اسے یہی
جواب مناسب لگا۔
”میں تم سے شادی کیوں کروں؟“

بات شروع کی۔
”وہ ڈر تل!“
”قائم ہو؟“ وہ اپنی بات کی طرف آگے لگا۔
اس نے کچھ دیر سوچا ”تقریباً۔“
”باہر چلیں۔“ اس کا مٹی چاہا کہ اجازت سمجھو لے۔
اسے اٹھا کر گاڑی میں بٹھائے اور نکل جائے۔
”ٹھیک ہے چلو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں
نے ایک ساتھ سینما میں سوئی ہوئی کرسی پر بیٹھے
لیے ایک اوپن ریٹورنٹ میں آگئے۔
”تم ایسے ہی سب کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہو؟“
بے حد دھمکانک ماحول میں سنجیدگی سے کی گئی یہ بات
عدنان کو اچھی نہیں لگی لیکن وہ اپنا موڈ خراب کرنا نہیں
چاہتا تھا۔

”سب کو نہیں صرف تمہیں۔“ عدنان نے ہمت
پیار سے کہا۔
اس نے سارس سی بی گروں کو اسے ہلکے سے
دیا اور کرسی کی پشت سے لگ کر دائیں ہاتھ کو دائیں
گل پر رکھ کر اسے دیکھا۔ وہ الفاظ سے ہی ٹھکرنا نہیں
جانتی تھی۔

”میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔“ وہ اصل بات کی
طرف آگے لگا۔

”جیسے تم ہو۔“ کلنی بیٹھے جواب دیا۔
”کیسا ہوں میں۔“ اس کا دل لڑکھن کی طرح
دھڑک رہا تھا۔

”دم کہاں ہے تمہاری۔“ سر کو ذرا سا اٹھا کر
بیچھے اس کی طرف دیکھنے کی لڑاکاری کی نئے نئے محبت
کے غبارے سے بھرے عدنان کے ایک اور چائنا آکر
لگا۔

”کیا مطلب۔“ یہ سوال اس نے اس لیے کیا
کہ شاید وہ مطلب نہ ہو جو وہ سمجھ رہا ہے۔ اس نے
کندھے اچکائے اور کلنی کا کالم اٹھا کر منہ سے لگا لیا
جیسے سناپی نہیں اس نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔
اتنے دنوں سے عدنان بہت جواز توڑ کر چکا تھا اگر
بے حد خوب صورت تھی تو وہ بھی کم نہیں تھا۔ اگر

نیل ہوئی اور وہ ایک لڑکے کے ساتھ ایک طرف چلی
گئی۔ وہ ایک طرف کرسی پر ہی بیٹھا رہ گیا۔ وہ بارہ جب
وہ نظر آئی تو بیچ بریک ختم ہو چکا تھا۔ درمیان میں اس
نے ایک بار اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور لب کر ہا ہر
آگیا۔ اگلے دن اس سے ملاقات ہوئی تھی تو جیسے اسے
یاد ہی نہیں تھا کہ وہ اسٹوڈیو آیا تھا۔

”نچ کے لیے چلیں ماریہ۔“ اس سے پہلے کہ وہ پھر
نکل جائے اس نے اسے دیکھتے ہی آفر کی۔
اس نے صرف ہونٹ سکیرے یعنی نہیں۔
”ڈنر کے لیے؟“ اس بار اس نے سر بھی ہنسی میں ہلا
دیا۔

”کیوں؟“ غصہ دیا کر وہ بولا۔ عدنان کو انکار کیا جا رہا
تھا۔

اس نے کلانی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے
کہا۔
”میں شوٹنگ پر جا رہی ہوں۔ تم چاہو تو ساتھ
آجاؤ۔“

وہ جانتا تھا ساتھ لے جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک
کیا جاتا۔
”اپنے مہمان کے ساتھ تمہیں ایک وقت کا کھانا تو
کھانا ہی چاہیے۔“

”تم میرے مہمان نہیں ہو۔“ اس نے بات ہی
ختم کر دی۔ ماریہ کے ہاتھوں پہلا پتھر عدنان کے گل پر
آگیا۔

”تمہارا مہمان نہیں ہوں دوست تو بن سکتا ہوں نا؟“
پتھر کھا کر بھی عدنان نے ہمت نہیں ہاری
اس نے رد عمل میں ایک ایرو اچکائی اسے دیکھا اور
اٹھ کر چلی گئی۔ چونکہ وہ اسے شادی کر کے اپنے ساتھ
لے جانے کا پکا ارادہ کر ہی چکا تھا سو اسے انگریزی
الفاظ سے نہیں نواز سکا خاموشی سے اس کی لڑاکوئی
گیا یعنی کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کس قدر خوب صورت
ہے اسی لیے ایسی لڑائیں سیکھ لی ہیں۔
چند دنوں بعد اسے لان میں بیٹھی مل گئی۔
”کیسا رہا شوٹ؟“ اس کے پسندیدہ موضوع سے

محبت سحر

جیل لگے کانوں سے اوپر کی طرف کھڑے بال چمکنا دیکھا
منہ ہونٹوں پر بلا سنڈ پنک لپ اسٹک میاں آئے سے
پیلے گھنٹہ تو اس نے ہاتھ روم میں ہی گزارا تھا اگلا ایک
گھنٹہ ڈرننگ روم میں۔ پھر پھر یہ سب کیا ہو گیا؟
وہ سب وہاں ہلی ووڈ کی فلموں کے ہیرو ہیروئن لگ
رہے تھے۔ خود کو مسٹر پاکستان سمجھنے والا صرف
”مسٹر“ بھی نہیں لگ رہا تھا۔
جس پیلے لڑکے سے ماریہ نے اسے ملوایا اس نے
پیلے رنگ کی اسکن ٹائٹ پیٹ پہن رکھی تھی۔ سفید
مٹل کی طرف کے پیرے کی شرٹ جو پیچھے گھٹنوں سے
اوپر تھی اور آگے سے پیٹ تک۔ اور جب وہ حرکت
کرتا تو وہ ذرا سا پیٹ پر سے اوپر اٹھ جاتی۔

”آج رات میرے ساتھ چلو گے میرے فرینڈز
نے ایک پارٹی دی ہے۔“ سارس سی لمبی گردن تن
گئی۔ اتنی سی بات پر وہ یہ سمجھا کہ وہ اسے اب سب
سے ملوانا چاہتی ہے۔

”کیوں نہیں۔“ اس نے بہت جوش سے ہائی
بھری۔
جس وقت وہ اس کے ساتھ پارٹی میں گیا اس کی آن
بان شان کی ہوا نکل گئی۔ پارٹی لور وہاں موجود لوگ
اتنے ہائی فائی اور ہائی فیشن ایبل تھے کہ ان سب میں وہ
ٹائٹ کا پیوند ہی لگ رہا تھا۔ اس نے بھی برائنڈ ڈیوئرس
ہی پہنی ہوئی تھیں۔ جینز۔ سوٹ پنڈ پنڈ۔

مسکمل ناول



بیشتر لاشائے فنی تھلا شوز سرخ تھے گلے میں
ریساں سی پمن رکھی تھیں۔ اس سب لٹے پٹے میں
وہ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہر لڑکی لڑکا اپنی
جگہ پر ایک الگ برائڈ بنا کھوم رہا تھا۔ سب کے اشارے
مختلف تھے۔ کچھ کے عجیب تھے۔ کچھ کے عجیب تر اور
اس سب میں ایک ہی چیز مشترک تھی کہ وہ سب نیلی
سبز بھوری آنکھوں والے ایک سے بڑھ کر ایک شان
دار لگ رہے تھے۔

اس کے چہرے پر درد آنے والے تاثرات کو ماریہ
نے طنزیہ نظروں سے دیکھا بھیسے پوچھا
”کیا واقعی تم میرے لیے پرفیکٹ ہو؟“
اس نے بھی اس کی نظریں پڑھ لیں۔ ”سیکھ جاؤں
گاہی سب بھی۔“

کچھ دیر تو ماریہ اس کے ساتھ رہی۔ پھر عتاب
ہو گئی۔ وہ اکیلا ہی ادھر ادھر اٹھتا بیٹھتا رہا۔ پارٹی فائیو
اشار ہوٹل کی چھت پر تھی۔ کچھ ہی دیر میں تمام
روشنیاں گل کر دی گئیں۔ خوب ہوا ہوئی۔ آسمان
برفائزورک سے پہلے پھول بنے۔ پھر دس سے انٹی گنتی
لکھی جانے لگی۔

”تائن۔ ایسٹ۔ سیون۔“ سب یک زبان کلن
پھاڑنے لگے۔
”سکس۔ فائیو۔ فور۔“ ہر نمبر الگ رنگ سے
آسمان پر جگمگا تا اور پھر پھیل کر معدوم ہو جاتا۔
”تھری۔ نو۔ ون۔“

”ف۔ اٹا شور۔“ عدن نے کاتوں میں انگلیاں بوسے
لیں۔ ”ون“ کے ساتھ ہی ڈانس فلوور کی لائٹس روشن
ہوئیں۔ صرف وہ ڈانس فلوور سے ذرا ہی دور تھا اس کا
فلور مختلف روشنیوں سے جل بجھ رہا تھا اور فلوور کے
عین اوپر لگا بڑا گلوب روشن ہو گیا۔ وہاں دس جوڑے
کھڑے تھے۔ وہ مختلف پوزیشنوں میں پوز بنائے جلد
کھڑے تھے لڑکیوں نے گھٹنوں تک اونچی فراک
پمن رکھی تھی۔ اونچی ٹیل اور ہیل بہت اونچی پمنی
تھیں۔ فلوور کی لائٹس روشن ہوتے ہی شور کچھ دیر کو
تھما۔ میوزک بجنا شروع ہوا۔ میوزک کے نبضے ہی

ایک ایک کر کے ہر جوڑے نے اپنا اپنا جلد پوز لیا
ناچنا شروع کر دیا۔

”وہ“ عدن کا منہ کھل گیا۔ جوڑے بڑے بڑے گل
فلور پر اس کی نظر ماریہ پر پڑی۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ
تھی اس کی شخصیت کے سحر کے سامنے وہ خود محو
گئی تھی۔

دو گھنٹے تک اس فلوور پر ڈانس ہوتا رہا۔ ہلے
والے ساتھ ساتھ نکتے رہے۔ دس سے چھ اور چھ
چار رہ گئے۔ تیسرے نمبر ماریہ بھی باہر آ گئی۔ اس کا
سانس پھولا ہوا تھا اور وہ کپینے سے کھلی ہو رہی تھی۔
پلکے نیلے رنگ کی فراک اس کے جسم کے ساتھ چپک
گئی تھی۔ دونوں نے اتنے مکمل کا ڈانس کیا تھا کہ عدن
حسد سے جل کر خاک ہو گیا۔ یہ امر کی ہر کام میں آئے
آگے کیوں ہوتے ہیں اور اتنے بے مکمل۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد ریکس نے ڈانس فلوور
پر مون واک کی اور مون واک کرتے وہ مائیکل
جیکسن کا باب لگ رہا تھا۔ ایک طرف کھڑی ماریہ
جوش سے ”ہاؤ وائو“ کرتی رہی۔ اگر عدن اس سے لڑا
حسد نہ کر رہا ہوتا تو وہ بھی تلی مار تا اور ”واؤ وائو“ ضرور
کرتا اس کے ایسے شان دار بے عیب ڈانس پیش
کرتے رہے۔

عدن کو اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اسی لیے اسے
پارٹی میں لائی تھی۔ اب اگر مذاق میں ہی سہی نہ
دونوں کا ڈانس مقابلہ کر دیتی تو سب عدن کا ڈانس دیکھ
کر فیس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بہت کچھ یاد
مکمل انداز سے ماریہ نے اسے جواب دیا تھا۔ امریکن
ہیرو کے سلئے تو وہ زبردی تھا تا اپنے گروپ میں وہ
بے شک با مکمل تھا۔

چند مہینے وہ ماریہ کے عشق میں گھٹا رہا۔ کبھی ٹیشن
میں آ جاتا کہ ماریہ کو ضرور مڑا چکھائے گا۔ یہ اس کی
پہلی بھر پور بے عزتی تھی جو کسی نے کی تھی۔ خاص کر
کسی لڑکی نے۔ وہ بھولا تو نہیں، لیکن یاد کر کے نیکلف
بھی ہوتی۔ جب بلیا پوچھتے
”ماریہ کو فون کیا۔ ہائے پلو کیا اس سے؟“ تو وہ

نہیں آ جاتا۔
پھر بھی امریکا نہیں گیا۔ یہاں ہی اسے لے کر جاتے
تھے۔ سب بعد جب وہ جانے لگے اور اسے بھی ساتھ
لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اگلے
پہلوں میں انہیں بھی اندازہ ہو گیا کہ ماریہ نامی چیز ان کے
سے جدا نہیں کی جاسکتی اور اب یہ ماریہ نامی چیز ان کے
مگر ٹی تھی مہمان بن کر۔ ہمیشہ کی طرح کم گو تھی۔
اپنے آپ میں ہی تھی۔ کلن میں ڈنر کے دوران اس
کے ڈیڑھی اس کی پلیٹ بھرتے رہے۔ منہ اس کے
کلن کے پاس لے جا کر کچھ کہتے تو وہ مسکراتے لگتی۔
عدن کو محسوس ہوا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔ اس
کے انداز سے دھماکہ خیزی عتاب تھی۔ وہ جو اسے اپنے
انسان اور ماریہ ہونے پر غر تھا۔ آج وہ غر اس کی ذات
میں سے نہیں جھٹک رہا تھا۔ اسے غر تھا کہ اس کی مام
از پاکستان کی ہیں اور وہ ازبک بیوی ہے۔

”کتنی بار سرجری کروا چکی ہو؟“ اس نے موقع ملتے
فی اس کے کلن میں سرگوشی کی۔
اس نے سوالیہ انداز لے لیا۔
”بھب تو شاہکار بن چکی ہو۔“

ایک دم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور یہ
پہلی مسکراہٹ تھی جس میں طنز اور تمسخر نہیں تھا۔
”فکرت کر رہے ہو؟“ آنکھیں تر چھٹی گئیں۔
”آٹھ سال پہلے ایسا صدمہ ملا تھا کہ اس قاتل بھی
نہ رہا۔“ ماریہ کی آنکھوں میں سوچ سی درد آئی۔ جیسے وہ
ڈاکٹر بنا رہی تھی کہ اس نے کیا کیا تھا۔
”تو صدمہ تھا؟“

”صدمہ سے بڑھ کر۔“ اسے دیکھتے ہی سب کچھ
ان کی زبان سے نکلا ہی چلا گیا۔ اس نے خود کو نہیں
پہچانی کای سی ریکارڈ کو خراب نہیں ہونے دیتا
تھی۔ ایک بار وہ اس میں مبتلا ہوا تھا۔ ایک بار تو
ماریہ کو بھی اس میں مبتلا ہونا چاہیے تھا۔
”گو سکس میں جانا چاہوں گی کیا تھا؟“
”تم نے کے لیے تو مجھے ساری عمر چاہیے ہے۔“

تمہارے پاس اتنا وقت؟ ساتھ ساتھ بتا جاؤں گا۔“
وہ اتنی ندر سے ہنسی کہ گردن موڑ کر اس کی مام اور
ڈیڈ نے اسے دیکھا اور یہی کام عدن کے منہ پلانے کیا۔
فلام علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ منظر بے حد حسین لگا
انہیں اور اس منظر سے ہنسا پس منظر بھی۔
”مکمل ہو جائے گا۔“ دل میں سوچا۔ ”مکمل ہی
ہو جائے گا۔“

ڈنر کے بعد ان کے اصرار کے باوجود وہ ان کے گھر
نہیں ر کے اگلے دن عدن ہوٹل چلا گیا۔ ماریہ کو لے
کر مختلف جگہیں گھمائیں اور وہ ساتھ ساتھ رہی۔
ہنس بھی دیتی تھی۔ بول بھی لیتی تھی۔ چند دن وہ اسے
ایسے ہی لے گھومتا رہا۔ دوسرا اس کے مام ڈیڈ پھر ان کے
گھر آ گئے۔ عدن سے بھی کبھی باتیں نہیں۔ ادھر
ادھر کے کئی سوال پوچھے۔

”اب آگے کیا کرو گے؟“ انداز ایسا تھا کہ کتنے پانی
میں ہو میاں؟
”اپنا اسپتال بناؤں گا۔ اسی کے لیے پلاننگ کر رہا
ہوں۔“

”سرجن نہیں بننا؟“
”اس کے بارے میں چند سال بعد سوچوں گا۔“
”یعنی ابھی میسے بنانا چاہتے ہو۔ اپنے باپ پر گئے
ہو۔“ عدن کو برا تو لگا۔ لیکن ان کے مقام (دولت کے
مقام) کو دیکھ کر خاموش ہی رہا۔
”شادی کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟“
”کوئی نہ کوئی تو مجھے پسند کر ہی لے گا۔“ بہت
بھونڈے انداز سے انکساری دکھائی گئی۔

”تمہاری بھی کوئی پسند ہوگی؟“ سگار کو منہ میں لیا
اور تیز نظروں سے اسے دیکھا۔
”جو بھی اسے بتا دیا تھا۔“ آنکھوں کا زلویہ ذرا دور
بیشی ماریہ کی طرف موڑا۔ وہ دونوں اریو میں بات
کر رہے تھے اور ماریہ اریو بہت کم سمجھتی تھی۔
انہوں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور مکمل
انداز سے نظریں واپس موڑیں کہ وہ جان نہ سکے کہ وہ
اس کی نظر کے تعاقب میں گئے ہیں۔

”کلج کے نلے میں تمہارے باپ کے بہت معاشقے چلے تھے۔“ اتنا کہہ کر وہ جتنی قہقہہ لگا کر ہنسے۔

”اپنے بارے میں بتاؤ! کیا کیا کیا کلج میں؟“ اتنا کہتے انداز سرگوشی جیسا ہو گیا۔ جیسے وہ دوست آپس میں بیٹھ کر ازداری کی باتیں کرتے ہیں۔

عدن کو اندازہ ہو گیا کہ اس انسان نے امریکا میں اسٹورز کی چین کیسے بنائی۔ نظری کی نظر رہی ان کی۔

”چلو احوالی میں سب چلا ہے۔ کیا خیال ہے؟“ بہت عقل والے انسان تھے۔ سیدھی طرح بات بھی نہیں کر رہے تھے اور سب سیدھے جواب بھی لے رہے تھے۔

اس نے ناچار سر ہلا دیا۔ ماریہ سے متعلق اشاروں میں بھی ابھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خود سارے اشارے اکٹھے کر رہے تھے۔

”تمہاری ایک بات مجھے پسند ہے۔ تم میں عقل بہت ہے۔ میری اور غلام علی کی بہت بار لڑائی ہوئی۔ لڑائی بھی کیا۔ صرف میں ہی لڑا۔ لیکن غلام علی نے جی جان سے دوستی نہ کی۔“ پھر جتنی قہقہہ بلند ہوا۔ ”وہی عقل مجھے تم میں نظر آ رہا ہے۔“

نہ جانے یہ تعریف کا کون سا انداز تھا۔ عدن خوش نہیں ہو سکا۔

اس رات وہ واپس گئے تو غلام علی غلام نے عدن کو بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔

”دیر سن۔ مبارک ہو۔“ وہ سمجھائی نہیں۔

”تم نے کیا جلاو کیا ہے اتنا پر؟ وہ خود کہہ گیا ہے تمہارے اور ماریہ کے لیے مجھے امید تو تھی لیکن اس طرح کی بہت سی امیدیں وہ دلائے رکھتا ہے۔ بہت بار میں نے اسے اپنا بار نثرینے کے لیے کہا۔ لیکن بتا نہیں۔ اس باب مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ کہہ رہا تھا امریکا میں ہی اسپتال بن جائے گا۔“

جو کچھ ہو رہا تھا وہ عدن کے سامنے ہی تھا۔ لیکن اس اچانک خبر پر وہ بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریہ کبھی

نہیں مانے گی۔ اب وہ کیسے مان گئی، کس وجہ سے؟ ”ہو سکتا ہے انہوں نے ماریہ سے نہ پوچھا ہو۔“ ”یہاں ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنا کہے کلام گرا گیا۔“

عدن بہت سی کیفیات کا ایک دم شکار ہوا۔ یہی کیفیت حیرانی کی تھی۔ خود پر حیرانی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ تو ماریہ کے بغیر وہی نہیں سکتا اور اتنے سال عدن کو ہی وہ سری لڑکیوں میں ڈھونڈتا رہا ہے۔ وہی اس کی پہلی پسند اور محبت تھی۔ ٹھوڑی بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے عورتوں کے لیے مقررہ گئے معیار سے ذرا آگے پیچھے تھی۔ لیکن اتنا تو ہلکا سا جانا ہے اور پھر اس سے زیادہ نادر موقع کمال ملے گا۔ ماریہ کو اپنے آگے پیچھے گھمانے کا اس سے بدلہ لے گا، اسے اپنی محبت میں جکڑا کر ”کا“ شوہر بن کر اسے ہر اے لک۔

دوسری کیفیت میں اسے افق یاد آئی۔ آج کل اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک آدھ مہینہ پہلے تھا۔ افق سے متعلق کیفیت بہت عجیب تھی۔ ات اب احساس ہو رہا تھا کہ افق دراصل ماریہ کا ہی ہم البدل تھی۔ ماریہ جتنی ہی حسین، لیکن افق صرف حسین تھی۔ ساریہ سب کچھ تھی۔ ساریہ تو اتنا کچھ تھی کہ وہ اس کے سامنے خود کو بوٹا سمجھتا تھا۔ ماریہ ہی اس کی فکر کی لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جسے دھکا دے کر نہ کہا جاسکے کہ ”جاؤ! مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔“ جس کا فون نہ اٹھایا جائے ایک ایسی لڑکی نہیں ہو سکتی ہے۔ رلاتی ہے۔

کھڑے کھڑے عدن، ماریہ اور افق کو اوپر نیچے کہا تھا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کا مزہ ایک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ ہے جو غلطی بھی کرے۔ ناراض بھی خود کا ہو جائے اور کان پکڑ کر ”مسوری“ بھی کہلوائے۔ لیکن نہیں کہ وہ خود ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگے۔

عدن بہت ذہین تھا۔ ایسے ہی نہیں وہ وہ دن تھا ایک کتاب ہضم کر کے ٹاپ کر جاتا تھا۔ تبدیلی کو نہ کرتا تھا۔ خاص کر کسی کو جواب نہ نہیں تھا۔ اس نے

اپنی کھوپڑی سے دوستی کی تھی اور سب ہی اچھی باتیں لیکن افق ان سب میں اچھی تھی اور اچھے نہیں تھے۔ زندگی کے ضامن نہیں ہوتے وہ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ برے لوگ انہیں روند کر ان کی لاشیں اپنے محل بنالیتے ہیں۔ تو ایسے روندے جانے والے کے ساتھ کون زندگی گزارے۔

غلام علی غلام نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ اپنا باپ خود نہیں ہے۔ وہ اپنے خون کو جانتے تھے جس محبت، محبت کی رٹ اس نے لگائی تھی۔ ایسی رٹ تو وہ آئندہ زندگی میں بھی بہت بار لگائے۔ محبت تو اسے بہت بار ہوگی۔ ہر محبت کو وہ حاصل کرنا چاہے گا اور ہر محبت کو بھول بھی جائے گا۔ یہ محبتیں معاملہ پر قدموں کے نشانات سے بھی کم وقتی اور کتر ہوتی ہیں۔ بظاہر پاؤں رست میں بری طرح سے دھنسن کر پورا مکمل نشان بناتے ہیں۔ اور۔ اور۔ سمندر کی ایک معمولی لہر اس معمولی نشان کو اس کی اوقات دکھا جاتی ہے۔

تھک رہے کوڑنر کے لیے لے گیا اور جس وقت وہ ماریہ کو لگاؤ تھی پستار ہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت افق روتی ہوئی

”ماریہ جی!“ وحاشا سے ان کا دروازہ کھول کر وہ

”ماریہ جی! امل۔“ ”ٹنگے پاؤں بنا دے کے وہ لڑکی تھی۔ وہ سب فوراً“ اٹھے۔ اس کے ساتھ لگے لگے بچن میں چولہے کے پاس بے ہوش پڑی تھی۔ افق زارہ قطار رو رہی تھی۔



افق کے ساتھ جاکر اماں نے سرکاری اسپتال میں میسٹ کرواتے تھے میسٹ ٹھیک نہیں تھے یا نہیں کرے اور بڑھنے والے ڈاکٹر۔ سرکاری اسپتال سے ہی انہیں واپس مل گئیں۔ وہ کھاتی رہیں۔ درد بھر گئی ٹھیک نہیں ہوا۔ جیسے تیسے اسکول چلی جاتیں۔ اور ہوجاتیں۔ نہ ظاہر کرتیں۔ نہ ہی بتاتیں کہ کتنا درد

ہے۔ بس دو اکھا لیتیں۔ درد کو چھپائے رکھتیں۔ ”ماریہ جی ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہو جائے گا۔“ کرتے کرتے انہیں باور چلنے میں چولہے کے پاس پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں اٹھا کر اسپتال لے جانے تک وہ سرا ہوا۔ جمل اور اسد پریس گئے تھے۔ افق ہاتھ پیر مسکتی رہی۔ بھابھی گود میں سر رکھے بیٹھی رہیں۔ جھاگ سی ان کے منہ سے نکلنے لگی۔ بے جان سی ہو گئیں۔

”امل۔“ وہ پانچلوں کی طرح انہیں پکار رہی تھی۔ اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں آگ کیسے لگتی ہے۔ جسم سے جان کیسے نکلتی ہے۔ بے سارا ہ جانے کا اصل مطلب کیا ہے۔ قیامت کے کہتے ہیں۔ ایمر جنسی میں تیسرا اٹیک ہونے سے ڈاکٹر ز نے انہیں بچالیا۔ بھابھی کے شوہر اور ان کے سر ماتھے سے ہینڈ صاف کرتے اور اوپر بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ وہ ہچکچوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ بھابھی خود حالات کے پیش نظر بری خبر کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ دو دن اماں لہر جیسی میں رہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کھری کھری سن رہا تھا۔

”جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو لے آتے ہیں۔ تیسرے اٹیک سے کیسے ہم نے بچایا ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں۔ ابھی بھی ان کی حالت بہت پیچیدہ ہے۔ نہ معلوم کن ڈاکٹروں کے پاس ان کا علاج ہو رہا ہے۔“ بھابھی اور ان کے شوہر سر جھکائے سنتے رہے۔ ماموں کو فون کر دیا تھا۔ وہ ایک دو دن میں آنے کا کہہ رہے تھے۔ چچا وہ گھنٹے گزار کر جا چکے تھے۔ اکلوتی پھوپھی ملکن میں رہتی تھیں۔ فون کر کے انہوں نے بھی حال چال پوچھ لیا تھا۔ جمل اور اسد کو بھابھی نے ناشتا کرا دیا اور اس کے لیے بھی بنا کر ان کے ہاتھ اسپتال بھیج دیا۔ دوپہر کے بعد بھابھی بھی آجائیں۔ شام کو ان کے شوہر آجائے۔ ڈاکٹر سے بات کرتے۔ ضروری دوائیاں لا دیتے۔ اسد اور جمل کے پریس کے مالک نے پیسوں سے کچھ امداد کی تھی۔ وہی پیسے استعمال میں آ رہے تھے۔ تین دن سے وہ سن بھالی

سہمے سہمے آنے والے وقت سے ڈرتے رہے کہ اب کیا ہو۔ اب کیا ہو جائے۔ ان کی پیاری صورتیں مرجھا گئیں۔ ان کی اماں ایمر جنسی میں تھیں۔ زندگی اور موت کے درمیان۔ زندگی کو جھیلنے کے لیے وہ تین اکیلے تھے۔ کم تھے۔

اسد اور جمل اپنی ماں کے ہمت اور حوصلے کے سکھائے سارے سبق بھول گئے اور الفت کے سینے سے لگ کر خوب روئے بار بار اس سے پوچھتے۔
 ”ماں ٹھیک ہو جائیں گی نا۔ باجی! تاؤ نا، کب ٹھیک ہوں گی؟“

باہمی خود سرہلا کر روتی رہتی۔ ان تین دلوں میں اس
 نے بار بار اپنے سر پر آسٹن کرتے دیکھا۔ خود کو بھرے
 بازار میں بے یار و مددگار کھڑے دیکھا۔ جنگل میں گم
 ہوتے دیکھا۔ اس پر دکھ کا ہر احساس ہو ہو کر گزرا۔ ہر
 احساس نے اسے چیخ و پکار ڈور کے مارے اس کا انہدام
 نکل گیا۔ اس نے دلی سے یہ خواہش کی کہ کاش اپنی
 ماں کی جگہ پر وہ ہوتی۔ تین دن اور تین راتیں وہ
 احساسات کے لیے لیے سقوں سے ہو کر آتی۔ دعا میں
 لگتی رہی۔ گزر گزرتی رہی۔

آس پاس کے چند دور و نزدیک کے رشتے دار آکر دیکھ کر چلے گئے۔ امی کے اسکول کی پرنسپل آئیں۔ اسٹاف آیا۔ ان سب کے اس طرح آنے پر الحق اور رور گئی۔ تین دن بعد امی کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد وہ گھر آ گئیں۔ ان سمیت گھر میں سب کو چپ لگ گئی۔

ہاموں فیصل آباد سے ایک اور بار ہو کر چلے گئے۔
اس کا جی چاہا کہ ہاموں کے قدموں میں گر جائے۔
”خدا ارادہ ہماری مدد کیجئے“ ڈاکٹر نے اتنی خطرناک
پاتھیں کی ہیں اور نہیں تو آپ زیادہ بڑھے لکھے ہیں۔
چل کر ڈاکٹر کی بات اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ وہ تو نہ
جائے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا واقعی سچ کہہ رہے
ہیں؟“

اتنے سوال تھے افق کے پاس۔ اس نے چند ایک پوچھے ساموں نے اسے اچھے سے تسلی دے دی۔

☆ ☆ ☆
”کچھ بتاؤ؟“

اس نے نقی میں سر ملایا۔ سر پھر گھٹنوں میں ملے۔

”ماموں کیا کہتے ہیں؟“

”کہہ کہتے ہیں۔ علاج سے اچھا پرہیز ہے۔ اچھی
خوراک کھائیں۔ دوائیں۔ ورزش کریں۔ ڈاکٹر کی
تو عادت ہوتی ہے کہ اس کرنے کی۔“ کہہ رہے ہوئے
انداز میں بولی۔

”وہیچا۔؟“ نہیں بلاؤ یہاں۔“

۳۱۔ انہوں نے کہا کہ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو میں انہیں یہاں بلا لوں۔ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔

”اب کیا ہو گا افتخار؟“ وہ بے چاری بہت گھبرائی اور پریشان تھیں۔ افتخار کی ماں اپنی منہ بولی خالہ کے لیے افتخار کی طرف دیکھ کر رو گئی۔ پھر رونے لگی۔

”بھابھی جی! کچھ کر دیں۔ میری ماں کو۔ کچھ ہونے دے۔“

بھابھی بے چاری خود سفید پوش گھرانے سے
 تھیں۔ اس سب کے دوران ان کے بھی چند ہزار لگ
 گئے تھے۔ مزید اور بھی چند ہزار ہی دے سکتی تھیں۔
 انہوں نے ہی اپنے بھائی سے اسلام آباد بات کی۔ لا
 ہاں سی ایم ایچ میں ملازم تھا۔ اس نے اپنے بی ہنس پر
 موڑے بہت ڈسکاؤنٹ کی بات کی۔ لیکن اس سب پر
 می انہیں بالی پاس سرجری کے لیے کلنی پیسے چاہے
 تھے۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہا تھا کہ اگر مریض کو بار بار
 ہے تو انتظار کرو۔ چند ماہ ہی لگیں گے۔ اگر زندگی
 پہنچے ہو تو فوراً "بالی پاس کروالو۔ یہ بات بھابھی کے
 دہرنے اپنے گھر ملا کر گئی تھی۔ رپورٹس ان کے پاس
 میں۔ انہوں نے اسلام آباد اپنے سالے سے کہا
 ت کی تھی۔ وہ جتنی مدد کر سکتا تھا۔ کرنے کے لیے
 ار تھا۔ اپنے گھر رکھنے، خدمت کرنے، باقی بھاگ دلا
 نے کے لیے تیار تھا۔

باقی مسئلہ صرف پیسہ تھا۔ اسکول کی میڈم اور
انھیں ملے ہی چند ہزار روپے چکے تھے۔ ان کا علاج
ایک نیم سرکاری اسپتال سے ہوا تھا۔ بہت سے
افراہیات انہیں خود اٹھانے پڑے تھے۔ اسد اور جمل
پندرہ ہزار روپے لائے تھے اپنے استاد سے۔ ان کے
خود کے پاس تو صرف تین ہزار روپے تھے۔ اب کوئی
ایسا شخص نہیں بچا تھا جس سے وہ پیسے لے سکتے تھے۔
اپنی اسکول کی میڈم کے پاس ہی گئی۔ انہوں نے
دس ہزار روپے دیے تھے۔ جو دہ کرنے والے تھے۔
بچے نہیں ہٹ رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان
کی اپنی چادریں محدود تھیں اور جن کی محدود نہیں
تھیں وہ دہ کرنے والے نہیں تھے۔ ان کے پاس
سوتے کے تھام پر ایک چھلا بھی نہیں تھا کہ جسے بیچ
سکتے تھے۔ مگر کام محدود سامان تھا۔ محدود تعلقات تھے اور
پیسہ۔ ان کی سڑکی ہو کر رہ گئیں۔

ایک ایک روپیہ بچانے کے لیے وہ تین تین بھائی
ایک ہی وقت کی روٹی پر آگئے۔ وہ مجھ کے بھی رہ سکتے
تھے۔ انہیں اپنی جان سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ پیٹ تو
اکل بھی نہیں تھا۔ اماں کے لیے ڈاکٹر نے ایک
چارٹ دیا تھا۔ خوراک کا۔ انہیں ہر صورت وہی دینا
تھا۔

رات گئے اہل سو جائیں تو تینوں بسن، بھائی باورچی
 غلام پنہ کر چکے حکمے اتر کر تے۔

”اُنی باقی! کچھ کرونا۔“ جمال کو ڈاکٹری ہسپتال پر بڑا
 حسین قتلہ اس نے چھ مہینے ہی کہا ہے تو ایسا ہی ہو گا۔
 محبت اور غناہ کے نام کے اکلوتے سہارے کے
 لاپسے میں اگر کوئی ایسی پیش گوئی کر دے تو کیا ہوتا
 ہے۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔ بس وہ نظر نہیں آتا۔ جن
 ہتھیاروں کو گزرنا ہے انہیں ہی معلوم ہوتا ہے۔
 ”میں دعا کرتی ہوں۔“ نسلی کے نام پر اس کے سر
 پر لفظ تھیر

”قاتلو میں بھی کرتا ہوں۔“ اسد بولا۔
 قاتلوں کی طرح نظر آتے تھے۔ جیسے تینوں کا بالشی بالشی
 بھر خون نکال کر رہا دیا گیا ہو۔

”جاؤ! سو جاؤ تم۔“
”مجھے ڈر لگتا ہے“ انق باجی! ”انار کلی کی سنسان
سڑکوں اور گلیوں سے رات گئے اکیلے آنے والے کو
اب ڈر لگ رہا تھا۔“

”مجھے بھی لگتا ہے۔“ جمل بھی بولا۔
 ”مجھے بھی۔“ افس نے سوچا۔ بولی نہیں۔

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہ بار بار اٹھ کر اٹھ کر
 اہل کو دیکھیں گے کہ ان کی سانسیں چل رہی ہیں یا۔
 وہ کچن میں ہی چوکی پر بیٹھی رہ گئی۔ فون اس کی گود میں
 تھا۔ اس نے عدنان کا نمبر پھر سے ملایا۔ فون بند جا رہا تھا۔
 جب اہل ایمر جنسی میں تھیں تو تین دن بعد اس نے
 فون کیا تھا۔ فون تب بھی بند ہی ملا تھا۔ فون اس سے
 ایک ہفتہ پہلے سے ہی بند مل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس
 کے ایک دو میسجز آگئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ
 ”وہ آج کل بہت مصروف ہے اور نہ جانے کب تک
 فاسغ ہو۔ وہ خود رابطہ کرے گا۔“

جس وقت ابق باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ اس وقت تک وہ اپنے نکاح سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کی چند دوسری دوست لڑکیوں تک اس کی شادی کی خبر پہنچی تو وہ اسے فون پر فون کرنے لگیں۔ یہ وہ چند لڑکیاں تھیں۔ جن کا خیال تھا کہ وہ ان سے شادی کرے گا۔ وہ اسے اپنی فیملی سے بھی ملوا چکی تھیں۔ عدنان کے پاس ایک برسل نمبر بھی تھا جو صرف فیملی اور چند قریبی دوستوں کے لیے ہی تھا۔ دوسرے نمبر پر اس کے ہر طرح کے رابطے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان لڑکیوں نے پرسل نمبر تک بھی رسائی حاصل کر لی۔

ان کے نمبر حاصل کرتے ہی اس نے برسل سم کس جس سے وہ اتفاق سے بات کیا کرتا تھا۔ اس نے کمرے کے ہاتھ روم کے فلیش میں بہا دیا۔ وہ نیا اکلوتا نمبر استعمال کرنے لگا۔ پہلے اس نے ایک بار سوچا کہ وہ اتفاق کونوں کرے اور اسے بتائے کہ اس کے پیلا میس میں رہے بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی صحت کی خاطر وہ ان کو کہیں دے شادی کر رہا ہے۔

پھر اس نے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ ایک تو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ دوسرا اتنی کے لیے تو بالکل نہیں تھا اور پھر اس نے اتنی کے ساتھ کیا ہی کیا تھا؟ ہاتھ تک تو کبھی اسے لگایا نہیں تھا۔ صرف بات ہی کی تھی۔ تاہم کبھی ڈیٹ پر لے کر گیا۔ یہ سب سوچتے اس کے اندر کہیں ایک ہلکی سی خلش ضرور تھی۔ بے حد معمولی اور یہ معمولی سی خلش بھی دلہن بنی ماریہ کو دیکھ کر جاتی رہی۔ شادی کے دوسرے ہی دن وہ لوگ وہی آگئے۔ اتنی کی بات تھی۔ اس سب میں نہ کوئی نقصان ہوا نہ ہی گھانا۔ جب ہم کسی ایک چیز سے دور ہوتے ہیں تو کسی دوسری چیز کے قریب ہو جاتے ہیں۔ یقین جانئے یہ فلسفہ بالکل سچا ہے۔ جیسے رات کے بعد دن کا آنا۔ یہ فلسفہ عدن جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ ان ہی پر صادق آتا ہے۔

اتنی کے پاس اب کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں بچا تھا جس کے پاس جا کر وہ میسے لے آئی۔ عدو اور سہارے کے نام پر اس کے پاس ایک ہی انسان تھا۔

اپستال سے آئے اہل کو تین ہفتے گزر گئے تھے۔ ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سفید رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اس دوران وہ ایک بار پھر چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے پرانی ہی بات کی اتنی سے اتنی کا منہ لٹک گیا۔

سرکاری اسپتال والوں نے تو پہلے ہی اہل کو مار دیا تھا۔ "سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" کہہ کہہ کر وہ نہ درد کو پکڑ سکے۔ نہ ہی مرض کو۔ اب وہ کیا کریں گے۔ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اتنی ہاتھوں کی طرح اہل کو فون کرتی رہتی تھی۔ سبج لکھتی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ وہ خود اتنی پریشان تھی کہ اس نے سوچا ہی نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا فون اتنے دنوں سے کیوں بند ہے۔

چوتھے ہفتے اہل کے سینے میں درد اٹھا۔ بھانجی کے ساتھ حواس پختہ وہ ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ فون کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "اب بھگتو۔" رات بھر اہل درد کو برداشت کرتی رہیں۔ آٹھ گھنٹے کی گزری تھیں۔ لیکن ان کا خود بخود ہاتھ ان کے اندر کیا چل رہا ہے۔ وہ بیٹوں دم سادھے ان کے پاس بیٹھے تھے۔ اسد اور جمال ان کی ٹانگیں دیا رہے تھے۔ اتنی کبھی ہاتھ سہلاتی، کبھی سینہ۔ رات ان سب نے سولی پر گزار دی۔

صبح ہوتے ہی اتنی بڑی سی چادر میں لپٹ کر ڈی ایچ اے آئی۔ یہ خیال اسے پہلے بھی آیا تھا۔ لیکن چاہ کر بھی جانہ سکی۔ ہر دن کی سوچتی آج تو اہل ضرور ہی فون کرے گا۔

آج آج کرتے کئی ہفتے گزر گئے۔ اس کے گھر سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ کوئی دوست مل جائے گا۔ ورنہ کوئی ملازم تو ضرور ہی ہو گا۔ کوئی پیغام دے سکتی ہے وہ انہیں۔ رکشہ کروا کر وہ عین اس گھر کے باہر کی۔ نل دی سبھو ٹاور واہ کھولا گیا۔ "السلام علیکم" وہ اہل ہے؟ "چوکیدار کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"اہل۔" اس نے سوچا۔ "گور صاحب۔" گور اتو وہ بہت تھا۔ اتنی نے سر ہلادیا۔ "وہ ہیں؟" "نہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟" "وہ صاب لوگ ہیں۔ نہ ہمیں بتاتے ہیں۔ نہ ہم پوچھتے ہیں۔" خان نے غصہ نہیں کیا، لیکن چڑ گیا۔ "ان کا کوئی فون نمبر ہو تو مجھے دے دیں جی اہل بہت پریشان ہوں۔"

اتنا کہتے اس کی آواز بھگ گئی اور اس کے ساتھ ہی پورج میں تھوڑا سا شور ہوا۔ چوکیدار نے جھٹ پڑ کر گیٹ کھول دیا۔ طویل پورج سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کار پر نظر پڑتے ہی اتنی چوکیدار سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ "کار میں کون ہے۔ کیا اس کا کوئی دوست۔" لیکن چوکیدار اندر کی طرف دوسرے

دوسرے کے پاس کھڑا تھا اور وہ گیٹ کے باہر چھوٹے دھڑلے کی طرف۔ کسی شان دار کار باہر نکلی۔ پچھلی جٹ پر جیسے ساہ سفید، گھنٹی اوپر کی طرف اٹھی۔ موٹوں والے شخص کی نظریے ہی ایسی سی چادر میں لپی لپی پر رہی۔ اس نے نظر پڑتے ہی کار کو روکنے کا اشارہ دیا۔ چوکیدار بھاگا کھڑکی تک گیا۔

"کون ہے یہ؟" "گور صاحب کا پوچھ رہی ہے جناب۔" "مہلن کا؟" یہ کہتے ایک اور نظر اس پر ڈالی۔ دراصل جو پہلی نظر پڑی تھی وہی واپس مشکل سے پھرتی تھی۔ اس نے نالے میں وہ رنگین مزاج مشہور تھے۔ آج بھی اکثر اٹھی نظریں اس خطاب کی گواہی دے جاتی تھیں۔ سیاہ چادر میں پریشان صورت حسن پر وہ مری نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ کون ہے۔ اس نے طنز کو جلتے تھے۔ اگر وہ اس پر فدا ہوا تھا تو غلط نہیں ہوا تھا۔

دارا پور نے کار واپس پیچھے کر لی۔ کار سے اتر کر وہ اندر چلے گئے۔ اتنی کو لے کر چوکیدار اندر آ گیا۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا "آؤ ہمارے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ صاحب کون ہیں۔

ڈرائنگ روم کے چوڑے لکڑی کے منقش دروازے کے لیے عین سامنے بڑے سفید رنگ کے صوفے پر وہ موٹوں والا دونوں ہاتھوں کو صوفے کی پشت پر دائیں بائیں پھیلائے، دائیں پیر کو بائیں گھٹنے پر بٹے شان سے بیٹھا تھا۔

نظر پڑتے ہی اتنی نے چادر سنبھالتے سلام کیا۔ ان کی طرف اس کی پہلی نظریں تو دوبارہ ان کی طرف پڑتے رہنے کی اس کی ہمت جاتی رہی۔ "چوکیدار؟" سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہاں اس بار اسے بچے تک نہ کھا۔

اہل کے سامنے رکھے ایک صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔ "گلب بولو۔" اس انداز پر وہ گھبرا گئی۔ کیا بولے کہ اہل کہاں ہے؟ اپنے باپ کی عمر کے شخص کے سامنے۔

کیسے؟ "کون ہو تم لڑکی؟" لمبے میں اس سوال سے ہی اتنی ہتک نمائیاں کر دی گئی کہ اس کی رہی سہی ہمت جاتی رہی۔ "اتنی۔" وہ بمشکل بولی۔ نظریں لکڑی کے چمکتے فرش پر تھیں۔

"نام سے مجھے مطلب نہیں ہے۔ کام بولو۔ کون ہو؟ کیا ہو یہاں کیوں آئی ہو؟" اہل کے فنکار بنے تھے اس وقت۔ جان بوجھ کر ہتک آمیز انداز اپنا رہے تھے۔ وہ بالکل ہی نفس ہو گئی۔ جی چاہا بھاگ جائے۔ "مجھے اہل سے ملنا تھا جی۔" جب وہ کمزور سی نالا اتنی کی ہو جاتی تو بہت سی جی گرتی۔

"اہل کون؟" وہ جانتے تو تھے کہ ان کے سیا لکھوٹے بیٹے نے ایک حدو فیشن اہل نام رکھا ہوا ہے اپنا گلاہور شہر میں۔ لیکن انجان بن گئے۔

اب وہ شٹائی۔ اسے لگا۔ سامنے بیٹھا شخص ضرور ہی اہل کا باپ ہے۔ ورنہ کوئی انکل ہو گا۔ اس کے گھر میں اس کے جاننے والے ہی ہوں گے نا۔

"عدن۔" اس نے گھگھکا کر اس کا نام لیا "اہل نے اسے اپنا اصل نام بتا دیا تھا۔ ساتھ ہی مع بھی کیا تھا کہ وہ اسے کبھی اس نام سے نہ پکارے اور اصل نام اس نے اسے دیکھنے کے بعد بتایا تھا۔ ورنہ اکثر لڑکیاں تو اس کا اصل نام جانتی ہی نہیں تھیں۔

"عدن؟" حیران ہونے کی اداکاری کی۔ "تمہارا کیا لکنا ہے؟ کیسے جانتی ہو تم اسے؟"

وہ جینز کی شرٹ میں کٹے بالوں اور بناوٹے کے آئی ہوئی تو اس سے یہ سوال نہ پوچھے جاتے اور ایسے حلیے میں آئی کوئی بھی لڑکی بہت مزے سے کہہ جاتی۔ "ہو دا ہیل آریو نو آسک۔" (تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔)

الفاظ کو اس انداز سے ڈھالا گیا۔ جیسے عدن کوئی سات برسوں میں رہنے والا مرد ہے۔ نظریں نیچی رکھنے والا، آنکھوں سے اونچی شلوار پہننے والا اور سامنے بیٹھا شخص کوئی گدی نشین ہے اور کسی نامحرم لڑکی کے منہ

پیشانی پر آئے بھل بیٹھے کیے۔
 ”گھر سے یہاں کیوں آئی ہو؟“ وہ تو اسے ایسے
 ہٹھائے ساری زندگی فریج کر سکتے تھے اور کتنے مزے
 میں گزرتی ایسی زندگی۔

ان کا اصل مقام ہے اب وہ نظرس نہیں جھٹکاری

کے اوپر کرم سیال انڈیا جارہا ہے اور سچے اس کے

ہاتھ پاؤں بندھے پڑے ہیں۔ منہ کو سوئی دھاگے سے سی رہا گیا ہے۔ دو مردانہ ہاتھوں میں ہاتھ کے آتے ہی وہ اس ساری کیفیت سے باہر آگئی۔ لیکن اگلی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ قبر میں زندہ گاڑے جانے کی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ یہ سب اور ایسے۔ جسے وہ سرہانہ رہی تھی۔ وہ اسے عورت سمجھ رہا تھا۔ صرف "عورت۔"

ذرا سے جھٹکے سے اس نے ہاتھ آزاد کر دیا۔ خوف زدہ اور بزدلانہ انداز میں اٹھی اور صرف دو قدم ہی چلی گئی۔

"میسے نہیں چاہئیں؟" آواز میں لگاؤ بھی تھی اور دھمکی بھی۔ دلار بھی تھا اور پیکار بھی۔ پیسوں کے نام پر اسے امان یاد آگئی۔ ان کی تکلیف یاد آگئی۔ آنے والی ان کی موت یاد آگئی۔ وہ رک رہی قدم نہیں بڑھائے۔

"اپنی ماں کو مارو گی کیا؟" وہ اس کی پشت کی طرف صوفے پر بیٹھ بول رہے تھے۔

افتی نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا کہ شاید یہ شخص وہ نہیں جو وہ سمجھ رہی ہے۔ شاید امیروں میں تسلی ایسے ہی دی جاتی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر گلے سے لگا کر اس نے سوچا۔ وہ کم عقل ہے۔ یہ سب نہیں جانتی آخر کو وہ عدن کا باپ ہے۔ اسے ایسے نہیں سوچنا چاہیے ان کے بارے میں۔

دوسری طرف غلام علی غلام سوچ رہے تھے کہ لڑکی پیسوں سے تو شاید ہی قابو آئے۔ کم بخت مارے ان غریبوں میں عزت نفس بہت ہوتی ہے۔ عزت۔ عزت کو روٹے پھرتے ہیں۔ چاہے اڑیاں رگڑتے مر جائیں۔

"دھوکا دیا ہے ناعدن نے تمہیں۔ ہے نا۔ تم جیسی معصوم سی پیاری سی لڑکی کا قاتل اٹھایا ہے نا؟" اتنی سی سچائی سے افتی کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔ "میں جانتا ہوں اسے۔ بہت روکا بہت منع کیا۔ کالج میں نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ وعدہ کر چکا تھا۔ لیکن شادی اسے صرف ساریہ سے ہی کرنی تھی۔"

اسی کے باپ کے منہ سے عدن کے بارے میں ایسی حقیقت جان کر وہ حواں ہو گئی۔

"تمہیں اس کے لیے روٹے اور آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی۔" اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

"یہ چیک لو اور اپنی ماں کی زندگی بچاؤ۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔"

افتی نے ایک نظر کھنی مومچوں والے کی طرف دیکھا۔ اس نے بے نام اشکوں کو پیچھے دھکیلا اور چار قدم کے فاصلے پر رکھی بیٹھنے کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ عدن کے دھوکے کے باوجود وہ اس کے باپ سے یہ بے لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اس احسان کو لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی یا اپنی انا اور خوداری کے بارے میں؟

جیسے ہی وہ میز کی طرف جھکی وہ ہاتھ اس کی پشت پر آئے۔

"مخوش رکھوں گا تمہیں۔ اور تم۔"

اس کا وجود کانپ کر سمندر کے ریلے میں بننے والا پتھر بن گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" چیک نیچے کر گیا۔ سب کچھ صاف اور واضح ہو گیا۔ مکمل تصویر اس کے ہاتھ میں آگئی۔

"کیا کر رہا ہوں؟" کندھوں سے پکڑ کر اسے سیدھا اپنی طرف کیا۔ غرا کر کہا۔ "تمہیں نہیں بتا گیا کہ ہاں ہوں؟" سچی ہو۔ عدن کیا کرتا رہا ہے تمہارے ساتھ؟ اس سے زیادہ محبت دلوں گا تمہیں۔"

یہ انداز یہ الفاظ۔ افتی کی ساری عزت بہہ کر اس کے پیروں میں آگئی۔ عزت کا جانا کیسا وہ تو اتنے پرغا چلی گئی۔

"چھوڑ دو مجھے۔" پہلی کوشش میں اس نے ڈر کر کہا۔ آواز جھجھکی ہی نکلی۔ دونوں کندھوں پر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

"پاکل مت بنو لڑکی۔ سمجھ داری کا ثبوت دے۔ تمہیں دولت میں نسلوں کا۔"

اس وقت پر افتی کا جی چاہا کہ اس شخص کو آگ لگا کر جلا دے۔ اس کی گردن لوج لے۔

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ اتنی زور سے چلائی کہ آواز گھر کے آخری کونے تک پہنچی ہوگی۔ مجھ بخش منقش ہواؤں کی ادھ میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اندر کے منظر پر ایک نظر ڈالتے ہی سب سمجھ گیا۔ تیز قدم اٹھانا اور کیدار کے پاس گیا۔

غلام علی غلام کا منہ اس کے منہ کے قریب آتا جا رہا تھا۔ پشت کے بل میز پر جھک رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ غلام علی غلام کو خود سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہاتھوں میں سے دائیں ہاتھ کو اس نے اوپر اٹھا کر ایک زوردار پھینک غلام علی غلام کے منہ پر دے مارا۔ اب تک کی اپنی ساری قوت کو جمع کر کے۔

پتھر پڑنے ہی وہ باؤلے کتے کی طرح ہو گئے۔ اسے نیچے چلا۔

میز کے قریب۔ نیچے کرتے اس نے جھٹ میز پر دھکائی کا گل دان اٹھا کر اسے دے مارا۔ گل دان۔ غلام علی کی ناک پر لگا۔ خون کی ایک لکیر بہہ نکلی۔ گل دان مارنے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر میز کی دوسری طرف سے گھوم کر باہر بھاگی۔

منقش۔ صوفی۔ "ناک پر ہاتھ رکھے وہ دھاڑتے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

دراپور صوفی وہاں موجود نہیں تھا۔ بخش خان کے ساتھ گیت کے پاس کھڑا ازداری سے باتیں کر رہا تھا۔

خان کے بیٹوں کا باپ تھا۔ خان کے ساتھ وہ جلدی کر رہا تھا۔ اسے اندر کی صورت حال ظاہر تھا۔

اسے خان کے پاس آئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ لڑکی بوسج سے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ خان نے جھٹ چھوٹا گیت کھول دیا۔ پیچھے غلام علی کی شکل نکلا رہی تھی۔

"بھگوان اسے۔ بخش۔ چو کیدار۔ حرام زادو! پکڑو اسے۔"

دونوں بوکھلائے منہ اٹھائے غلام علی کو دیکھنے لگے۔ ناک پر ہاتھ رکھے وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

"کیا ہوا جناب آپ کو؟" بخش ایک کر اپنے صاحب کی طرف آیا۔ چو کیدار نے لڑکی کی طرف بھاگنے کا ڈر اٹھایا۔ جبکہ لڑکی بجلی کی طرح کھلے گیت سے نکل گئی۔

"کتے اس کے پیچھے بھاگ۔" غلام علی دھاڑا۔

بخش گیت سے نکلا۔ چو کیدار بھی نکلا۔ لڑکی سڑک پر دوڑ جاتی نظر آئی۔

دونوں نے اس کے پیچھے بھاگنے کی مکمل اداکاری کی اور لڑکی دور سے دور ہوئی گئی۔ دونوں غلام علی کے ملازم تھے۔ اس کے غلام نہیں تھے۔ انسانیت رکھتے تھے۔ اپنے مالک سے تنخواہ لیتے تھے۔ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے ایمان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ مالک کی خصلت کو جانتے تھے۔ چو کیدار نے تو اس سے زیادہ ڈراے دیکھے تھے۔ جب یہاں باج لڑکے رہتے تھے۔ جس وقت بخش جوس کا گلاس رکھ کر گیا تھا۔ وہ اسی وقت سے ذرا اوٹ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کوئی اپنی ہی باگنی دھاڑتی جس نے افتی کو بچا لیا تھا۔ کیا وہ واقعی بچ گئی۔ یا یہ وقت ہی طے کرے گا؟

ڈی۔ ایچ۔ اے کی کشادہ سڑک پر بھاگتے ہوئے اسے بہت شرم آئی۔ اس کی چادر اب اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ بالوں کی کئی ٹیس گردن اور پیشانی پر پھیل گئی تھیں۔ اس کا وجود ہری طرح سے کانپ رہا تھا۔ وہ ایک قدم تک نہیں اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اسے بھاگنا تھا۔ اپنی عزت کے لیے اسے بھاگنا تھا۔ سڑک پر قیمتی کاریں رواں دواں تھیں۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ وہ بڑے بڑے پھاٹکوں اور بنگلوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ سانس اتنی پھول چکی تھی کہ اب دم ہی نکل جائے گا۔ بہت دیر تک ڈر کے بھاگتے بہت سی سڑکیں پار کرتے وہ فٹ ہاتھ نما جگہ پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ وہ وہاں اکیلی تھی۔ بچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

وہ اپنی عزت بچا کر وہیں سے نکلی تھی۔ نہیں۔
دراصل وہیں تو اس کی ساری عزت اتر کر رہی تھی۔
عدن جس سے وہ محبت کرتی رہی وہ اسے چھوڑ گیا اور
اس کے باپ نے اس سے بڑھ کر کیا۔ آئندہ زندگی میں
جتنے بھی دن وہ زندہ رہے گی کیا وہ اس طرح اپنا تار تار
کیا جانا بھول جائے گی۔ اگر وہ وہ دن بھی زندہ رہ پائی
تو۔ اور پھر یہ زندہ رہتا نہیں ہوگا۔

افتخار کو بہت ترس آیا اپنی ماں پر۔ اپنے مرے ہوئے
باپ پر جس کی اس جیسی بیٹی تھی۔ جسے اس طرح
بھانپا رہا تھا۔ جسے اس طرح دھوکا دیا گیا تھا۔ جو اس جگہ
پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جس کی چادر اتر کر رہی تھی۔ جس
پر صاف صاف سامنے سے حملہ کیا تھا۔ جس کے
سامنے پہلے پیسے پھینکے گئے تھے۔

تو یہ تھا وہ حسن جو اتنے غضب کا تھا کہ غضب ہی
کر دیا تھا۔ حسن اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ لیکن
آج تو وہ اپنا آپ دکھائی گیا۔ لیکن اگر وہ حسین نہ بھی
ہوتی تو قریب قریب ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ
کس کس بات کے لیے ماتم کرتی۔ اپنے لیے۔ ماں
کے لیے یا ابھی جو ہوا اس کے لیے۔ اسے صرف ایک
بی چیز کے لیے ماتم کرنا چاہیے۔

اپنے ”کم عقل“ ہونے کے لیے
بہت دیر تک وہ وہاں ایسے ہی بیٹھی رو رہی تھی۔ اس
کا جی چاہا کہ اب وہ مر کر ہی گھر جائے۔ کاش! آج ہی
قیامت کا دن آج پہنچے۔ حشر ہو۔ یوم حساب ہو اور
وہ لوگوں کے گریبان پکڑے۔

”ہے (Hey) آواز افتخار کے قریب ابھری۔ ساتھ ہی
کندھے پر ہاتھ آیا۔ ڈر کر افتخار نے سر اٹھایا۔

”کیا ہوا؟“ اس کی دھواں دھواں شکل پر نظر پڑتے
ہی ایک ہاتھ میں کیونس پورڈ پکڑے لڑکی چونک گئی۔
لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا ڈیر۔“ سرخ ہستی آنکھوں سے افتخار نے
لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی نے بیگ میں سے ٹشو نکال کر آگے کیا۔ افتخار
نے ٹشو نہ پکڑا۔ لڑکی نے ہاتھ برہا کر اس کی آنکھیں

صاف کیں۔

”بتاؤ نا۔ کیا ہوا۔ میں دس منٹ سے تمہیں دیکھ
رہی ہوں۔ وہ دیکھو۔ وہاں ہے۔“ لڑکی نے ہاتھ
سے اشارہ کیا ایک طرف۔ افتخار سے ذرا سا دور اپنی
سرخ گاڑی کی طرف۔ افتخار نے اٹھنا چاہا۔

”میں تمہیں ڈراپ کروں۔ کہاں جانا ہے
تمہیں؟“

افتخار نے نہ میں سر ہلایا۔ دنیا کا پتھر دل انسان بھی
اس وقت اسے دیکھ لیتا تو موم ہو جاتا۔ کیونس پورڈ
پکڑے اس لڑکی کو بھی بہت ترس آیا۔

افتخار نے کچھ قدم آگے چلی۔ لڑکی نے اٹھ کر اس
کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”او! میرے ساتھ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتی
ہوں۔“ لڑکی نے ہاتھ نہ چھوڑا اور ساتھ لے کر کار
تک آئی۔ قطار در قطار وہاں کئی کاریں کھڑی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ پلیز۔“ لڑکی نے دروازہ کھولا۔ افتخار ہونٹ
نی لڑکی کی طرف دیکھے گئی اور پھر بیٹھ گئی۔

لڑکی نے کار اشارت نہ کی۔ ”اب بتاؤ کیا ہوا
ہے؟“

افتخار نے لڑکی کی طرف الجھ کر دیکھا۔ کیا بتائے کیسے
اور کیوں۔؟

”نام کیا ہے تمہارا۔؟“ لڑکی بہت پار سے بول
رہی تھی۔ اس کی آواز اور انداز دونوں ہی نرم تھے۔

”افتخار! اس نے آنکھیں پھیلی کی پشت سے
صاف کر کے بتایا۔

”افتخار! وہاں ایسے بیٹھی کیوں رو رہی تھیں؟
مجھے۔ ہو سکتا ہے میں کچھ کر سکوں۔ کچھ ہوا ہے
تمہارے ساتھ؟“ افتخار جب بیٹھی رہی۔

”جب تک تم بتاؤ گی نہیں۔ میں تمہیں جانے
نہیں دوں گی۔“

”ماں مر رہی ہیں۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ عدن
اور اس کے باپ کا نام بھی زبان پر لانا اس نے حرام
جانا۔

”ہسپتال میں ہیں وہ؟“

فتی میں سر ہلایا۔ ”گھر میں ہیں۔ میرے پاس پیسے
نہیں ہیں۔“ نئے سرے سے اس کی ہانگی بندھی۔

”پتلا گھر چلتے ہیں۔“ لڑکی نے کار اشارت کی۔
اس نے گھر کا پتہ بتایا۔ لڑکی نے پانی کی بوتل اس کے

ہاتھ میں دی۔ ٹشو ہاتھ میں پکڑا۔ ایک ہاتھ اس
کے ہاتھ پر رکھا۔ تسلی دیتی رہی۔

”بہت پیار ہیں وہ۔؟“

”جی۔ اگر ان کی سرجری نہ ہوئی تو وہ مرجائیں
گی۔“

”تم ایسے مت دوؤ پلیز۔ ان کی سرجری بھی
ہو جائے گی۔ بی بی پرو (پرو) بنو۔“ ساتھ ساتھ وہ اس

کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے چھلی دیتی رہی۔ ماں کی
پٹائی کی نوعیت ہو چھتی رہی۔

کار پارک کر کے وہ افتخار کے ساتھ اس کے گھر
آئی۔ افتخار نے لڑکی کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ ماں کو

اس کے رونے اور اس جگہ بیٹھنے کے بارے میں مت
بتائے۔ ماں دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ بھابھی کو

بچھڑ گئی تھی گا۔ بگا ہے انہیں اگر دیکھنے رہنے کا۔
لڑکی پورٹس لے کر چلی گئی۔

جس جگہ افتخار بیٹھی رو رہی تھی وہ ایک پرائیوٹ
ہسپتال کی پارکنگ تھی۔ وہاں ریش نہیں تھا۔

کاریں اس سے ذرا سے فاصلے پر پارک تھیں۔
سڑک میں لڑکی جس کا نام دانیہ تھا۔ اپنی دوستوں

کے ساتھ آئی۔ باہران کا ڈرائیور بھی تھا۔ انہیں
ڈرائیور کے ساتھ جانا تھا اور ہر طرح کے اخراجات

کے لیے ڈرائیور سے کہہ سکتی تھی۔ وہ تین دوستیں
تھیں۔ ان کی ماں کی سرجری کروا رہی تھیں۔

پتہ ان کے لیے آسمان سے اتاری گئی امداد تھی یا
پتہ انہیں گئی تھی لیکن افتخار اندر تک اللہ کی مشکور

تھی۔ اس جیسی گناہ گار پر یہ بہت بڑا کرم تھا۔
اللہ کے ساتھ افتخار اسلام آباد آئی۔ بھابھی کا بھائی

ماں لڑکی کے لیے موجود تھا۔ اسد اور جمل بھابھی کے
بچے کھیل رہے تھے۔ نئے سرے سے ماں کے ٹیسٹ

ہونے لگے۔ انہیں چیک کیا گیا اور پھر ماں کی سرجری

کا دن آگیا۔

اگر دانیہ جیسا کوئی اس کا رشتہ دار ہوتا۔ اگر دانیہ
جیسا اس کے پاس کوئی اور ہوتا تو اس دن اس کی اماں اور

عزت کا کٹورا ایسے خالی نہ ہوتا۔ اماں باپ انسان کو لے
کر وہ اندر ہی اندر بہت کھٹی۔ راتوں کو چھپ چھپ

کر وہ بہت روٹی۔ اپنا ہی منہ لوج لینے کو اس کا جی
چاہتا۔ خود کو مار لینے کا۔

ان کی اماں نے زندگی میں انہیں بہت سے سبق یاد
کروائے تھے۔ محنت کرنے کے، نہ رونے کے، حوصلہ

رکھنے کے، کسی سے کوئی امید نہ رکھنے کے، خودداری
کے، وفاداری، زندگی کے سامنے ڈٹے رہنے کے۔ دنیا

کو پرکھنے کا کوئی سبق وہ نہیں دے سکتی تھیں۔
بھینٹوں کی۔ بھینٹوں کی شاخت کا اور انسانوں

کی۔ بھینٹوں کی۔ بھینٹوں کی۔ بھینٹوں کی۔
”مہورت جانتی کم اور سمجھتی زیادہ ہے۔“

یہ مقولہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ لیکن عورت کو
اس مقولے کو ہر اہمیت چاہیے۔

”مہورت جانتی زیادہ اور ہارتی کم ہے۔“
معاشی میدان میں انہوں نے بھوک کو ہرا دیا تھا۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بھوک پیٹ سے مارتی ہے اور
انسان روح سے۔ جن انسانوں کی روحیں دوسرے

انسانوں کے ہاتھوں مرنے ہیں ان انسانوں کو بڑی کرب
ناک سزائیں ملتی ہیں۔ اندر ہی اندر۔ کھٹی کھٹی۔

چھپی چھپی۔



”میں نے تمہیں پروپوز نہیں کیا تھا۔ تم نے مجھے
کیا تھا۔“ فرزام نے یاد دلایا۔

”میں نے انکار نہیں کیا۔“ دونوں کندھے اچکائے
گئے۔

”اب جب میں تمہارے بغیر نہیں رہنا چاہتا تو تم یہ
کیا کہہ رہی ہو؟“

”کیا۔؟ میں نے کچھ کیا؟“ بالوں کو جھٹک کر پوچھا
گیا۔

دن بعد باہر ہوتا۔ کیا وہ مجھے ایسے چھوڑ دیتے؟
 ”تمہیں کلج سے ایسے ہی نہیں نکالا گیا۔“
 ”کلج نے اپنی ساکھ کے لیے یہ کیا۔“
 ”میں اپنی ساکھ کے لیے کر رہی ہوں۔“

رومی نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور اسے سن کر بھی وہ اس سے ملنے کے لیے بار بار کہنے لگا۔

دونوں بعد وہ اسے ملی اور اپنی مرضی کا فیصلہ بنا کر چلی گئی۔ جس شخص کا مستقبل پہلے روشن تھا اب وہ تاریک ہو چکا تھا جو انسان پہلے اچھا لگ رہا تھا اب برا لگ رہا تھا۔ اب سے اٹھارہ دن پہلے وہ اس کے ساتھ مودی دیکھنے سینما گئی تھی اور اٹھارہ دن بعد وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹھیک ہے! تعلقات ٹوٹ ہی جاتے ہیں، لیکن اس طرح۔ ایک دم سے۔ کیا تعلق توڑنے کے لیے لوگ اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں؟ جلالی الیکٹرک ٹرین سے بھی زیادہ؟

وہ چھٹی جماعت میں تھا جب یہاں آیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی احرار ایف ایس سی کرتے ہی برطانیہ گیا تھا وہ اسٹوڈنٹ ویز پر آیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے آتے ہی ایک پاکستانی ہوٹل میں اچھی جاب مل گئی تھی اور پھر اسے اپنی ہونے والی بیوی تانیہ مل گئی کلج میں۔

احرار کی جاب اچھی تھی۔ اس نے صرف ایک سال کی کورٹ شپ کے دوران ہی تانیہ سے شادی کر لی۔ دونوں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ پاکستان میں احرار کسی غریب خاندان سے نہیں آیا تھا۔ اس کی ماما کڈز گارمنٹس کا ایک اسٹور چلاتی تھیں۔ گلبرگ میں ان کی ایک کوچھی تھی۔ کار بھی۔ تھوڑا بہت بینک بیلنس تھا۔ احرار کے برطانیہ آنے سے چھ ماہ پہلے شہر ان کے ڈیڑھ کی وفات ہو چکی تھی۔

صرف ڈیڑھ سال میں ہی احرار نے ملا اور فرزام کو برطانیہ بلوایا۔ وہ برطانیہ میں اپنا بزنس کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے پیسے چاہیے تھے۔ اس نے ملا کو راضی کر لیا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یہاں اس کے پاس آجائیں۔ وہ مل کر ایک جگہ رہ بھی لیں گے اور وہ

کاروبار بھی کر لے گا۔ ملا نے سب کچھ بیچ کر پیسے اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس نے اپنے سرکارو سالے کے ساتھ مل کر ٹریڈنگ ایجنسی کھول لی۔ فرزام نے اسکول میں ایڈمیشن لے لیا اور وہ اور ملا مل کے احرار کے ارنج کیے گئے ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔

یہاں تک سب ٹھیک تھا۔ احرار کو ہر ماہ ایک مہوار رقم دے دیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی اس کا کاروبار سیٹ نہیں ہوا۔ پھر وہ اپنی بیوی کے ساتھ لاہور کے فلیٹ سے ایک بڑے اور کشادہ فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ اس پر اس کا کہنا تھا کہ یہ فلیٹ تانیہ کے گھر والوں کی طرف سے تانیہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ ان کی ماں مسز گوہر پاکستان میں اپنا چلتا ہوا کام چھوڑ کر آئی تھیں۔ صرف اپنے دونوں بیٹوں کے مستقبل کے لیے اپنے بیٹے احرار کی خوشی کے لیے۔ درنہ اہم اپنے کام سے ہٹ لگاؤ تھا۔ احرار نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ انہیں دسایں کاروبار یہاں کروادے گا۔ حالات ٹھیک ہو رہے تھے۔ لیکن صرف احرار اور تانیہ کے دونوں نے الگ الگ کاریں لے لی تھیں۔ ان کے گھر کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی۔ ان کے شاپنگ ملز دیکھنے کے لائق تھے۔

ایک کاروباری عورت کو یہ سب باتیں سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں سکتی تھیں۔ پاکستان میں کچھ بچا نہیں تھا۔ یہاں اٹانے کے نام پر ان کے پاس صرف فرزام تھا اور فرزام چھوٹا تھا وہ اپنے یہ سب باتیں بتا کر احرار سے باہر نہیں نکلتا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ فرزام اپنی ڈگری مکمل کر لے اور ایک جاب حاصل کر لے۔ ابھی فی الحال احرار ہی اس کے سب اخراجات پورے کر رہا تھا۔ وہ احرار سے کوئی بھی بات کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جتنے پیسے احرار نہیں دیتا وہ پیسے وہ خاموشی سے رکھ لیتیں۔

پاکستان میں وہ ایک فعال زندگی کی مالک تھیں یہاں فی الحال وہ چند گورنرز کر رہی تھیں۔ وقت کا نبض پر ہاتھ تھا۔ جانتی تھیں۔ کسی بھی وقت خد

ملنے کی قوت آسکتی ہے۔ بیٹے، ہو اور ان کے وہاں ایک مجرم کلر تھا۔ کسی بھی وقت وہ چاکر تھا۔ لیکن اس سب میں ایک گڑبڑ ہو گئی تانیہ نے اپنے تانیہ کی چھوٹی بہن رومیہ فرزام کی دوست بن گئی۔ پھر کلج میں بھی ساتھ ہو گئے۔ رومی فرزام کے ساتھ بہت خوش ہوئی تھی۔ تانیہ یہ سب پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے میاں کے بھائی کو اپنے میاں کے بیٹے کے گھر کا روپار میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اگر رومی اور فرزام میں رشتہ استوار ہو جاتا تو اس کی والدین فطین بہن ضرور اس کا روپار میں سے فرزام کا حصہ نکال دیتی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی اپنا حاشیہ دیا۔ لیکن رومی نے کسی کی نہیں سنی اور فرزام سے ملنے کو اگر ہی چھین لیا۔

مکمل سے پہلے تانیہ کے پاس کوئی ایسی ٹھوس وجہ نہیں تھی جو وہ اپنی بہن کو جاتی اور وہ فرزام سے دور رہتی۔ لیکن فرزام کے پکڑے جانے اور برطانیہ میں اس کی موجودگی پر باہری سے اس کے ہاتھ بہت کچھ لگتا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے اپنی بہن کا ذہن صاف کر دیا تھا۔

مکمل میں ان دونوں کے مشترکہ دوست طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ چھوٹی سی خبر تھی۔ اخبار میں بھی آئی۔ مقامی ٹی وی چینل پر بھی۔ کلج میں ہر کسی نے اس بارے میں باتیں کی تو فرزام کے ساتھ پکنک پکنک کیے والی اس کے چنگلوں پر ہنسنے والی اس چھ فٹ کے لڑکے نے ہنسنے کے ساتھ فخر سے چلنے والی رومی کی باتیں کی۔ یہی گرم ہوا برداشت نہیں کر سکی۔ جو تانیہ سے لگی کہتی تھیں۔ وہ اب فرزام کے متعلق باتیں نہ کرے گی تھیں۔ اس کی بہن اور گھر والے الگ الگ آسارے تھے۔ ساری جمع تفریق کر کے اس نے احرار کی اتار کر اس کی ماں کے ہاتھ میں دی۔ برطانیہ میں تو فرزام کا مستقبل تھا۔ لیکن پاکستان میں کیا تھا۔ گلا دھرنے ملک میں قدم جمانے کے لیے اسے بدعنوانی اور مشقت درکار ہوگی اور اسے اس لفظ سے بچنا پڑے گا۔

”ملا! یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟“ وہ مسز گوہر کی گود میں سر رکھ کر لپٹا۔ رو دینے کے قریب تھا۔
 ”شاید کسی اچھے کے لیے۔“ مسز گوہر اچھا اچھا ہی سوچتی تھیں۔

”اس میں کیا اچھا ہے۔ ہر بار ایک ہی فلسفہ۔ جب میں یہاں نہیں آتا چاہتا تھا۔ آپ مجھے زبردستی یہاں لے آئیں اور اب میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا تو پوری کی پوری حکومت ہی مجھے نکال باہر کر رہی ہے۔ یہ کون سی قوت ہے ملا! جس نے حکومت کو یہی حرکت دے دی کہ نکالو اس فرزام کو یہاں سے۔ اور پھر آپ کا یہ فلسفہ۔ کچھ اچھا نہیں ہے اس میں۔ کچھ بھی۔“
 ”تمہیں آنے والے وقت میں ملے کرنا ہے فرزام!“

”آپ ہمیشہ ایسے ہی سوچتی ہیں۔“
 ”جبری سوچ تو نہیں ہے یہ۔“
 ”کچھ ایسی فائدہ مند بھی نہیں ہے۔ میں مت پریشان ہوں۔ رومی کو ایسے نہیں کرنا چاہیے۔“
 ”آنے والے وقت میں شاید وہ سمجھ جائے۔“
 ”شاید۔ کاش! ایسا ہی ہو۔“
 ”تم اسے بہت پسند کرتے ہو؟“
 ”صرف اسے ملا!“

”تمہیں اس میں کیا پسند ہے بیٹا؟“
 مسز گوہر نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کی پسند کو ہی پسند کیا تھا۔ تانیہ کی بار بھی احرار نے صرف ایک تصویر بھیج دی تھی اور فون پر بات کرنا اپنی شادی کی تاریخ بتا دی تھی اور انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی تھی۔

”تمہیں اس میں کیا پسند ہے؟“
 یہ سوال وہ پہلی بار فرزام کی کسی بھی پسند کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ اب انہیں لگتا تھا کہ انہیں اپنے بچوں کی پسند پر مسکرا کر ”ہاں“ نہیں کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ انہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ جن چیزوں کو انہیں پسند کر رہے ہیں وہ پسند کیے جانے کے لائق بھی ہیں یا نہیں۔ چیزوں کی تو خیر بدلی جاسکتی ہیں، پھینکی

جاسکتی ہیں۔ لیکن لوگوں کا کیا جائے ان کے بیٹے نے نامیہ پسند کرلی۔ برطانیہ میں ہمیشہ کے لیے رہنا پسند کر لیا اور اس کا نقصان ابھی تو انہیں ہو رہا تھا۔ آنے والے وقت میں شاید اسے بھی ہو۔

”یہ کیسا سوال ہے! اس سے مجھے پسند ہے۔“
”تم اپنے جوتے پکڑے، موبائل، لپ ٹاپ اور ایسی ہی دوسری چیزیں کو الٹی دیکھ کر لیتے ہو؟ تو چیزوں میں کو الٹی، ساخت اور انسانوں میں۔ تم نے اپنے دوست بناتے وقت بھی یہی غلطی کی اور اس غلطی کی تمہیں اتنی بڑی سزا ملی۔ خودکے ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ خود کے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔“

”محبت میں یہ سب نہیں دکھا جاتا ماما۔ یہ غیبی۔ یہ خالی۔ یہ سب محبت میں نہیں چلتا۔“
انہوں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ”میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری ہر خوبی اور خالی کو تسلیم کرتی ہوں۔ رومی کا کہنا بھی یہی تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ پھر اس نے صرف تمہاری خوبیاں ہی کیوں قبول کیں؟ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ وہ تمہارے ساتھ خوشی میں رہی اور دکھ پریشانی میں چھوڑ گئی۔“
”اٹھ کر بیٹھ گیا اور چونکے کی کیفیت لیے انہیں دیکھنے لگا۔ جیسے بچے چونک جاتے ہیں۔“ آسمان پر تو کوئی بڑھیا نہیں۔“

”تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اس بڑے وقت کا۔ یہ وقت تمہیں بہت کچھ بتا رہا ہے فرزام! جو وقت بتا رہا ہے اسے سنو۔ وقت کبھی برا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان بہت برا ہوتا ہے۔ وقت تو بہت اچھی کتاب ہے۔ اسے پڑھو۔ سمجھو۔“

”صوفیہ پر اسے سوچنے کے لیے چھوڑ کر وہ کوٹ پہننے لگیں۔“
”میں احمر کی طرف جا رہی ہوں۔ تم کھانا کھا کر اپنی پکنگنگ دیکھ لینا۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔“



”وہ یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اسے اس کا حصہ دے

”وہ۔“
”کون سا حصہ؟ وہ جو اتنے سال یہاں رہا ہے۔ میں نے اس کے اخراجات پورے کیے۔ اس کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی۔“ اپنی ماں کے اس مطالبے پر اسے بہت غصہ آیا۔ ابھی نامیہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔
”حمزہ! اگر میں حساب کتاب کرنے لگی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اس کے باپ کی پر اپنی میں اس کا حصہ بھی تھا۔ تمہارے برابر سب میں نے تمہارے حوالے کر دیا۔ غلط کیا۔ اس کے حصے کے پیسوں کا منافع صرف تم نے استعمال کیا اور میرے ہاتھ پر تم صرف چند ہزار پونڈ رکھتے رہے۔“ بھرم کا یہ سن کر فرزام نے چاک کیا اور صاف صاف حساب پر آ گئیں۔ فرزام کے ساتھ وہ زیادتی کیسے ہونے لگی۔

”اس پیسے سے کاروبار میں نے شروع کیا۔ اٹھارہ گھنٹے کام میں نے کیا ہے اور آپ دونوں کو میں بہت پیسے دیتا رہا ہوں۔ اتنا تو کما کما کر دیا ہے میں نے۔ ماما! آپ ایسے کیسے حساب اور حصے پر اتر آئیں؟ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنے سالوں سے کتنی محنت کر رہا ہوں؟“ احمر کو پہلے سے ہی خدشہ تھا کہ ماما ایسا کچھ کہیں گی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اب تم صرف یہ کرو کہ جو میرا چوتھا حصہ ہے۔ وہ تم اپنے پاس رکھو۔ تم فرزام کو اس کے حصے کے پیسے دے دو۔ تم اسی قدر دے دو جتنے تمہیں ملے تھے۔“ وہ محل سے بولیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بات کرنے کی دیر ہوئی اور وہ چہنچہ چلائے پر آجائے گا۔ واطلا کرے گا اور وہ یہی نہیں چاہتی تھیں۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں ماما! آپ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ میری محنت آپ کو نظر نہیں آ رہی۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا آپ دونوں کے لیے۔“

”میں نے تمہاری ہر بات مانی احمر۔ اپنا کادیا۔ تک تمہارے لیے چھوڑ دیا۔ سب کچھ بچ دیا۔“

”جو کیا میں نے آپ کو یہاں نہیں بلایا؟ آپ کے اخراجات نہیں پورے کیے؟ آپ کا خیال نہیں دیکھا؟“
”حمزہ! انہوں نے کڑی نظروں سے اسے گھور۔“ صرف فرزام اور اپنے حصے کا پیسہ میں کبھی بھی نہیں لگا دیتی تو مجھے اس سے کئی گنا زیادہ منافع ہوتا۔ جو مجھے دیتے ہو اور میں کسی بھی وقت اپنا پیسہ واپس نکال سکتی تھی۔ فرزام کے ساتھ میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں اس کے حصے کے پیسے واپس کرنے ہوں گے۔“

”اور جو رات دن میں محنت کرتا رہا ہوں؟“
”اس رات دن کی محنت کا پھل تم نے خوب کھایا ہے۔“ انہوں نے گھر پر ایک نظر دوڑائی۔ اس بات اور انداز پر احمر تھلا کر رہ گیا۔

”کون سے پیسے اور کیسے پیسے؟“ نامیہ زیادہ دیر تک اس گفتگو سے الگ نہیں رہ سکی۔
”ہم دونوں بات کر رہے ہیں۔“ سن کر فرزام نے سختی سے کہا اور نامیہ کو آگ ہی لگ گئی۔

”آپ پوچھ لیں احمر! ماما سے کہ یہ کن پیسوں کی بات کر رہی ہیں۔ ایسے ہی اتنی لمبی گفتگو میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ وہ صاف صاف جتا رہی تھی کہ فرزام کی بھی؟ اچھا! تو کوئی ثبوت ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے۔ کیا ہے۔ کیا ثابت کرو گے؟

احمر نے اپنی ماں اور سوٹ ہارٹ کی طرف دیکھا۔ سوٹ ہارٹ کا پیش کیا گیا خیال اسے پسند آیا۔
”ماما! آپ کن پیسوں کی بات کر رہی ہیں؟“
”حمزہ! سن کر فرزام ہر کو یقین نہیں آیا۔
”نامیہ ٹھیک کہہ رہی ہے ماما!“

نامیہ نے اپنی سانس کی طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”اور کچھ ماما جی؟“
”تم ایسے نہیں کر سکتے۔“ اتنا کہتے ان کی آواز کانپ گئی۔ وہ پیسے دینے میں تامل کرے گا ان کا خیال تھا مگر وہ حوصلہ نہ کر رہی رہا تھا۔
”آپ اس گفتگو کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہیں؟“

”وہ یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اسے اس کا حصہ دے

”سن کر فرزام نے اپنے بڑے بھائی سے اپنی بڑی کھلی بیٹی کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی یہ الفاظ لاؤنج کی طرف آتے فرزام نے بھی سنے۔ وہ ماما کو لینے کے لیے آیا تھا۔ اکیلے کھانا کھانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ماما کو لے کر وہ باہر کہیں جا کر کھانا چاہتا تھا۔

”اپنے بھائی کو لفٹ کا کہہ رہے ہو؟“ سب باتوں سے بڑھ کر انہیں اس بات کا زیادہ صدمہ ہوا۔
”تو جیل میں کون لوگ جاتے ہیں۔ کالج سے کن کو نکالا جاتا ہے۔ اس کا تو دیرنا بھی متسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں بد معاش لوگوں کی؟“
”بد معاش لوگوں کی کچھ اور نشانیاں بھی ہوتی ہیں۔“

”وہ سروں کے بال ہضم کر جاتے ہیں۔“
”ماما پلیز! آپ جائیں یہاں سے۔“ احمر نے اتنے ہلکے آواز پر کہے کہ فرزام نے چکر آگئے۔ فرزام لپک کر اپنی ماں کے پاس آیا۔

”یہ کیسے بات کر رہے ہیں آپ ماما؟“ دونوں بھائیوں نے بھی ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ فرزام کی آواز یہ کہتے کافی بلند ہو گئی۔

”یہ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟“
”اس سے اچھے انداز میں ہی بات کی ہے جس انداز میں آپ نے ماں سے کی۔“
”سن کر فرزام نے میرے اور احمر کے درمیان کی بات سنی۔ تم آؤ میرے ساتھ۔“ وہ کبھی بھی نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں بھائی آئے سانسے آئیں۔

”آپ کی آپس کی بات میں یہ مجھے بد معاش کہہ رہے تھے۔“
”تو جی جی تو کہا ہے احمر نے۔“ احمر کی سوٹ ہارٹ بولی۔

ان سب کے تعلقات اس نوعیت پر پہنچ چکے ہیں۔ اس کا اندازہ فرزام کو اپنے اکلوتے بھائی کے انداز سے اب ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے لمحوں میں حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن یہ رشتوں پیاروں اور لوگوں کو کیا ہو جاتا

”وہ یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اسے اس کا حصہ دے



ہے کہ وہ لمحوں کا وقت بھی نہیں لیتے۔ میں۔ مسز کوہر کو تانیہ کی یہ بات اگ لگا گئی۔

"ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے نا تمہارے خاندان والے؟ فرزام کے پیسوں سے ایک بڑا گھر انہیں بھی نصیب ہو گیا۔"

تانیہ کا منہ ایسے سرخ ہو گیا۔ جیسے دائیں بائیں گل پر زور زور سے تین چار پھڑکے ہوں۔

"فرزام کے پیسے۔ مائی فٹ۔ اوقات ہے اس کی اتنی؟ اب تک تو اپنے بھائی کے پیسوں پر پل رہا ہے۔"

"اب تک تم اس کے پیسوں پر پل رہی ہو اور دو سروں کو بھی پال رہی ہو۔"

مسز کوہر اب پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ فرزام کو ان پیسوں کے معاملات کے بارے میں نہیں معلوم تھا اب تک اس نے ایک بے فکری کی زندگی گزاری تھی۔ مسز کوہر اسے کسی بھی معاملے کی ہوا لگنے دیتا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بھائی سے متنفر ہو جائے۔ لیکن اپنی احتیاط کے باوجود ان سے برائی ہوا۔

احمر اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ بات واقعی بڑھ گئی تھی۔

"آپ کو جو کرنا ہے کر لیں ماما جی! تانیہ نے "لما جی" کو کچھ کر کہا۔" یہاں سے جائیں اب۔"

مسز کوہر کی زندگی بھر کسی نے اس طرح بے عزتی نہیں کی تھی جو اب ہو رہی تھی۔

"اپنا لہجہ اور الفاظ سنبھال کر بات کریں مسز احمر۔ پلیز۔" فرزام نے یہ بات عقل سے ہی کی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے دو لوگ بہانے اور بھڑکنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے اس لیے احمر فوراً بھڑک اٹھا۔

"تم اپنی زبان سنبھالو اور لنگو یہاں سے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔"

وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرزام گھبرا گیا۔ جو بھی تھا وہ احمر سے ڈرتا تھا۔ اس کا احترام تو بہت ہی کرتا تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا وہ۔

مسز کوہر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ پیسے مانگنے کی دیر تھی کہ یہ سب ہو گیا۔ اب پاکستان میں وہ کیا فٹ پاتھ

پر رہیں گے۔ ان کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں اور نہ حالات اب بن گئے تھے۔ اگر وہ یہاں رہیں تو کچھ اور انہیں سپورٹ نہ کرنا۔

"چلو آؤ فرزام! میرے ساتھ۔" انہوں نے اسے لے جانا چاہا۔ لیکن اس انداز پر فرزام کو جس صدمے نے آن گھیرا تھا وہ اس کی بات بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مسز کوہر اسے چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"پلیز ماما! دوبارہ میرے گھر ایسے لڑائی بھڑائی کرنے مت آئیے گا۔" احمر یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا۔ مطلب گھر آئیے گا ہی مت۔

"کیا لاما آپ سے لڑ رہی ہیں؟ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟" فرزام جانتا چاہتا تھا۔ مسز کوہر نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

"تم اپنی جگہ اس بند کرو۔"

"میں جگہ اس کر رہا ہوں؟"

"فرزام! چلو میرے ساتھ۔"

"ایک سیکنڈ ماما۔ ذرا کلیئر کر لیتے دیں۔ آخر یہ سب ہو گیا رہا ہے۔ آپ ایسے بات کیوں کر رہے ہیں؟"

"مجھے تمہیں ایک روپیہ نہیں دینا۔ سن لیا لاما آپ نے بھی؟ یہ سب میں نے رات دن کی محنت سے بنایا ہے۔ آپ ایسے ہی میرے ساتھ یہ سب نہیں کر سکتیں۔" فساد کی جڑ وہی پیسہ۔

"ماما! کوئی پیسوں کا مسئلہ ہے؟" فرزام اپنی مام کی طرف دیکھنے لگا۔ مسز کوہر نے خود کو بویکے سے روک لیا۔ اب تو لڑائی اور ہی بڑھتی نظر آرہی تھی۔

"یہ مجھ سے میرے پیسے مانگ رہی ہیں، جنہیں دینے کے لیے۔" احمر نے زیادتی اور جھوٹ کی حد پار کر لی مزے سے۔ جب اس نے حد پار کر لی تو مسز کوہر نے بھی سوچا کہ کم سے کم فرزام کو اب تو ج معلوم ہوا ہی چاہیے۔

"پاکستان میں جو ہماری پر اپنی تھی۔ اسے میں نے احمر کے کہنے پر بچ دیا اور سارے پیسے اسے دے دیے۔ اب اصولاً "اسے تمہارے حصے کے پیسے نہیں دے

چند ماہ تو رہیں یہاں۔"

رات گئے تک ان کی ہواک جاری رہی۔

اگلے دن فرزام نے گتے کے ایک بڑے ڈبے میں کارڈز، کچھ شرٹس چند کھلونے اور چند اور مختلف چیزیں رکھیں۔ ڈبا اٹھا کر ٹوب سے وہ اپنے کالج گیا اور گیٹ کے باہر ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

"روٹی! بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ایسے آواز دی۔ وہ اپنی تین دوستوں کے ساتھ باہر آرہی تھی۔ وہ ان تین دوستوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ انہیں دور سے ہی ہاتھ ہلا کر "ہائے" کہا۔ انہوں نے بھی ہاتھ ہلایا اور وہیں کھڑی رہیں نہ چاہتے ہوئے بھی روٹی کو اس کے قریب آنا پڑا۔ منہ بنائے کھڑی رہی کہ بولو کیا بات ہے۔

"یہ تمہاری چیزیں لایا ہوں۔" اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

روٹی کا منہ اور بگڑ گیا۔ "گھر تو تم ملتیں نہیں۔ سوچا یہیں دے جاؤں۔"

"اس ڈراے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جیسے تمہیں "محبت" کا ڈراما کرنے کی ضرورت تھی۔"

"کانی غصے میں لگ رہے ہو۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔

"ٹیک اٹ اپری۔"

"اب ہی تو غصے میں نہیں ہوں۔ پھر تو تم سے کبھی ملاقات ہوگی نہیں۔ تم میری دی ایک ایک چیز واپس کر دینا۔" وہ کہہ کر جانے لگا۔

"اپنی اگلی گرل فرینڈ کو دے، میری استعمال کی گئیں چیزیں۔" وہ ہنسی۔

"اسے دکھاؤں گا اور بتاؤں گا کہ چیزوں سے محبت کرنے والوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ سچی بنی محبت کرنے والوں سے ساتھ۔ صرف ہنسنے گانے، مزے کرنے والوں سے۔ جب تک اسکول کالج کی ہر لڑکی کا مجھ پر کرش رہا۔ اس وقت تک میں تمہیں عزیز رہا کہ "میں نے جیت لی فرزام ماما کی لڑائی۔" جب اسی کالج میں میرے خلاف بائیں کی گئیں تو تم نے لڑائی کو

اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔
 ”ہو نہ ہو۔ اب تو تم پاگل بھی ہو گئے ہو۔“ ہو ہوا
 وہ اپنی بہن تانیہ جیسی لگ رہی تھی۔
 ”بہت وقت پر پاگل ہوا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیوں
 لگ رہا ہے۔ میرے ساتھ بہت بڑا معجزہ ہوا ہے۔ مجھے
 اتنا کچھ معلوم ہو گیا۔ اتنا سب کچھ تو کوکل بھی نہیں بتا
 سکتا۔ ورنہ میں تو ہر سٹڈے تمہارے ساتھ موویز پر ہی
 جاتا رہتا۔“

”معجزہ تو میرے ساتھ ہوا ہے مسٹر فرزام! میری
 زندگی بچ گئی۔“ بالوں کو جھٹک کر کوٹ کی دونوں جیبوں
 میں ہاتھ دے کر اس نے کہا۔
 ”اور میرا دل۔ تمہاری زندگی نہیں بچی۔ صرف
 تمہاری پلاننگ محفوظ رہی ہے۔ ایک بڑا گھر، خوب
 صورت شوہر ہو، ویک اینڈ پر پارٹی ہو، آؤنگ ہو۔
 اس برائٹ پلاننگ میں تمہیں مشقت نامی چیز گوارا
 نہیں تھی۔ مشکلات تمہیں پسند نہیں اور پاکستان میں
 ایک تھوڑا کلاس زندگی کا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“
 ”اب تم جو چاہو سوچو۔ میں تمہیں فارغ کر چکی
 ہوں۔“ بھرپور طنز کیا۔ اسے طیش دلانا چاہا۔
 ”اس پر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ جھٹک کر وہ
 کورنش بجالایا۔ روی پلٹ کر آگے چلنے لگی۔
 ”روی!“ اس نے پیچھے سے آواز دی۔ روی
 نے صرف گردن موڑ کر دیکھا۔

”نہ جانے مجھے یہ بھی کیوں لگتا ہے کہ تمہاری
 زندگی میں آنے والے بھی تمہیں بار بار فارغ کریں
 گے۔ اگر ان میں تھوڑی سی بھی عقل ہوگی تو۔“
 ”ہو نہ ہو!“ کی شکل بنائے روی ڈبے کو وہیں چھوڑ
 کر چلی گئی۔ اس محبت کا اختتام بہت آرام سے ہو گیا
 جس کا روی صرف چند ہفتے پہلے تک بہت دھوم دھام
 سے جشن مناتی رہی تھی۔

چھ ماہہ پاکستان میں جھنگ میں پایا کے ایک دوست
 کے پاس رہا۔ وہ کمپیوٹر سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کلج

سے وہ نکلا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی
 اور پاکستان میں ابھی کسی بھی کلج میں ایڈمیشن نہیں
 لے سکتا تھا۔ کیونکہ سیشن شروع ہو چکے تھے۔
 اسے سیشن ختم ہونے کا ہی انتظار کرنا تھا۔ انکل ہائی
 کی مدد سے اتنا ضرور ہوا کہ اسے ایک کوچنگ سینٹر میں
 انکش۔ ٹیچر کی جاب مل گئی۔ ایک اس کی انکش۔ ٹی
 اچھی تھی اور وہ بھی پڑھا سکتا تھا۔ مانا ہے اسے آگے
 ہوئے پیسے دیے تھے۔ پیسوں کا اسے مسئلہ نہیں تھا
 لیکن اب وہ فارغ نہیں رہتا چاہتا تھا۔ زیادہ وقت
 کوچنگ سینٹر میں ہی رہتا۔ استقبالیہ پر بھی بیٹھ جاتا۔
 جب وہ فر فر انگریزی میں بات کرتا تو انکش کے لیے
 ٹیوشن کا پوچھنے آئے لڑکے لڑکیاں ایڈمیشن لے لیتے
 کوچنگ سینٹر کا مالک اس سے بہت خوش تھا۔ اچھے
 پیسے دے دیتا تھا۔

چھ ماہہ جھنگ میں اس کا اچھا ہی وقت گزر گیا۔ پھر
 مسز گوہر بھی پاکستان آ گئیں۔ ان کا آبائی شہر لاہور تھا۔
 یہیں سے وہ برطانیہ گئے تھے۔ ان کے باقی رشتے دار
 بھی مختلف ملکوں میں سمٹل تھے۔ ماموں دینی میں
 رہتے تھے اور احمر کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ نہ ہونے
 کے سلسلے میں ناراض تھے۔ اتنے ناراض تھے کہ بات
 ہی نہیں کرتے تھے۔ خالہ کینڈا میں تھیں اور ان کے
 شوہر قدامت پسند نہ ہی تھے۔ انہیں گوہر خاتون کے
 کئے ہوئے بال پسند نہیں تھے اور فرزام کے چچا کے
 ساتھ بھی وہی معاملہ درپیش تھا جو ان کا احمر کے ساتھ
 تھا۔ برسوں پہلے انہوں نے بھی ان کے جیسے کی گاؤں
 کی زمین اپنے نام کروالی تھی۔

چند دن جھنگ میں وہ کر وہ دونوں لاہور آ گئے۔
 انکل ہاشمی نے ان کے لیے ایک کرائے کے گھر کا
 انتظام کر دیا تھا۔ یہ گھر ایم او کلج کے قریب تھا۔ بمشکل
 چار مرلے کا ہو گا۔ تین کمرے تھے۔ دو کمرے لوہے
 تھے۔ انہوں نے ایک سہل کالڈوائس کرایہ دے دیا۔
 ان چھ مہینوں میں مسز گوہر نے کسی نہ کسی طرح سے
 احمر سے کچھ پیسے لے لیے تھے۔ کچھ ان کی اپنی بچت
 بھی تھی اور پاکستان میں بنائے گئے سونے کے

نارنگ۔ چند زیورات انہوں نے تانیہ کو دے دیے
 تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے ڈیزائن بدلو کر دے
 دیں گی۔ لیکن آنے والے وقت میں وہ جب اسے کچھ
 دیکھ کر حیرت منہ انہوں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔
 زیورات بھی انہوں نے بچ دیے۔ دو ہینڈ روم اوپر
 بیٹ کر لیے۔ سینکڈ ونڈ فرنیچر مناسب اور اچھی حالت
 میں انہیں آرام سے مل گیا۔ ان دونوں کو زیادہ سامان
 کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لاہور شہر میں اب بڑھنے والے کم ہی ہوں گے۔
 لیکن پھلنے والے جگہ جگہ اڈے بنا کر بیٹھ گئے۔
 فرزام کو اس کا بہت فائدہ ہوا۔ وہ شام سے رات تک
 خن مختلف اکیڈمیوں میں ایک ایک دو دو پریڈز لینے
 لگا۔ دن میں وہ مسز گوہر کے ساتھ ان کے کام کرتا۔

برطانیہ جانے سے پہلے مسز گوہر اپنے گھر میں بچوں
 کے روایتی ملبوسات بنانے کا کام کرتی تھیں۔ ایک
 اچھی لوکیشن میں ایک اسٹور کرائے پر لیا تھا۔ جس
 میٹرل تیار ہونے کے بعد فروخت کیا جاتا تھا۔ ساتھ
 ساتھ دوسرے اسٹورز میں بھی ٹھہرے کیا جاتا تھا۔
 گوہر کی کے نیچے والے پورشن میں یہی کام ہوتا تھا۔
 وہیں ان کا چھوٹا سا آفس بھی تھا۔ احمر سے جب بار بار
 سامانوں نے اپنے ٹھیک ٹھاک چلتے ہوئے کام کے
 بارے میں کہا تو احمر نے ہزار مثالیں دیں۔ انہیں
 سمجھایا کہ وہ یہی کام یہیں بھی کر سکتی ہیں۔ بلکہ یہیں تو
 ان کے کام کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ انڈین اور
 پاکستانی تو ترستے ہیں کہ انہیں روایتی پہناوے مل
 جائیں۔ اتنی یقین دہانیوں پر بھی سب بچ باج چلی گئیں
 اور آخر میں ان کے ہاتھ گھٹا ہوا آیا۔

انہوں نے رائے کار میگوں سے رابطے کیے۔
 لیکن جس معاوضے پر وہ لوگ اب پاکستانی اینڈسٹری میں
 کام کر رہے تھے۔ وہ اتنا معاوضہ انہیں دے نہیں سکتی
 تھیں۔ اب انہیں کم معاوضے پر لیکن اچھے کام کرنے
 والے چاہیے تھے۔ کنگ کا کورس تو وہ برطانیہ سے کر
 آئی تھیں۔ ساتھ ہی دوسرے چھوٹے بڑے کٹس
 گھاسی لیے اب انہیں کنگ ماسٹر کہنے کی ضرورت

نہیں تھی۔ وہ ماسٹری رکھے سلائی کے لیے۔ ایک
 کاریگر مینینی کڑھائی کے کام کے لیے اور ایک کاریگر
 فریم ورک کے لیے۔
 ایک مہینے سے وہ شاہ عالمی بازار جا جا کر میٹرل اکٹھا
 کر رہی تھیں۔ پہلے انہیں یہ سہولت تھی کہ ان کے
 پاس کار تھی اور مخصوص دکان داروں کے ساتھ ان
 کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں کسی کے بھی ہاتھ
 میٹرل کی فہرست بھیج دیتیں اور پھر جا کر چیک کر کے
 لے آتی تھیں۔ رنگ ساز کے ساتھ ماہانہ حساب
 کتاب تھا۔

شاہ عالمی میں انہوں نے پرانے دکان دار ڈھونڈنے
 چاہے۔ مگر ان میں سے صرف ایک ہی ملا۔ وہ ایک ہی
 بہت تھا۔ فہرست ہاتھ میں لیے انہیں بار بار بازار جانا
 پڑتا۔ پھر اتنا سامان دونوں کو اٹھا کر رکشے میں ڈال کر لانا
 پڑتا۔ فرزام تو انہیں سامان اٹھانے نہ دیتا۔ لیکن اپنے
 بیٹے پر اتنا بوجھ ڈالنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ شروع
 شروع میں فرزام شاپرز ہی پکڑ لیتا تھا۔ پھر ایک دن اس
 نے عجیب کام کیا۔ وہ ایک بڑا اور چوڑا کپڑا اپنے ساتھ
 لے آیا۔ سارے سامان کو اس میں باندھا اور دکان دار
 کی مدد سے اس نے وہ گھڑی اپنے سر پر رکھوائی۔ مسز
 گوہر کی چیخ نکلی۔

”فرزام! تمہاری گردن میں جھٹکا آجائے گا۔ خدا
 کے لیے ایسے مت کرو۔ پلیز اسے اتارو۔“
 ”نہیں ماما۔ میری گردن ٹھیک رہے گی۔ میں
 نے بہت سے لوگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ آپ مجھے
 بھی کرنے دیں۔“

”تمہیں عجیب نہیں لگ رہا؟“ وہ خوف زدہ نظروں
 سے اس کے سر پر جی ٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھیں
 کہ اب گری کہ اب گری۔

”نہیں ماما! ایسی باتیں بھی عجیب لگتی ہیں کیا؟“
 شاہ عالمی کے رش میں وہ دونوں جگہ بناتے آگے
 پیچھے۔ کبھی ساتھ ساتھ گزر رہے تھے۔
 ”مجھے تو بہت مزہ آ رہا ہے اس روٹین کا۔ جانتی ہیں
 ایک بہت بڑی جلابی کپنی کا مالک اپنے گھر کی کیاریوں

کی خود کیم بھال کرتا ہے، کھاؤ ڈالتا ہے، کٹھ چھاٹ کرتا ہے۔ جب میں نے اس کے بارے میں پڑھا تو سوچا کہ جب میں بھی اس جتنی بڑی کمپنی کا مالک بن جاؤں گا تو میں بھی ایسے ہی پودوں میں کھاؤ ڈالا کروں گا۔ اپنے جوتے پالش کیا کروں گا۔ پر مجھے اب معلوم ہوا ماما کہ وہ یہ سب کمپنی بنانے سے پہلے کرتا رہا ہے۔ بڑے کام سے پہلے ہی چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان لکھٹ سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں شرم نہیں کرنا چاہیے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا ماما؟

”ہاں امیرے بچے۔ اتنی عظیم باتیں کر رہے ہو کہ مجھے راستہ ہی دکھائی نہیں دے رہا۔“

”ماما! آنکھیں صاف کر لیں نا۔ بات بات پر رویا مت کریں۔“ وہ ہنسنا تو وہ بھی ہنسنے لگیں۔

گھر میں کام شروع ہو گیا۔ دن میں فرزام نمونے لے کر انارکلی، کرشن عمر، باغبان پورہ، سنت ٹکڑ، بھائی دروازے، لاہور اسٹیشن، صدر، گوال منڈی، اچھرو بازاروں میں دکانوں میں جا کر آرڈر زلیتا۔ دیکھنے میں وہ ذرا انگریز انگریز لگتا تھا۔ انگریزی لب و لہجہ کی اردو بولتا تو بہت ہی سارا، چھوٹا سا صاحب لگتا نمونے دیکھنے والے سوچتے کہ گور صاحب کام کر رہا ہے۔ کوالٹی بھی اعلیٰ ہوگی اور باقی میٹرل بھی اور ساتھ ساتھ وہ اپنے گاہکوں سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”انگریز کی صنعت کے بنے ہیں“ جیسے جاپان کی مشینری، کوریاجی جیولری، ترکی کافر پیر اور اب انگریز کے کپڑے۔

پھر وہ بات بھی بہت اچھے انداز میں کرتا تھا، دکانوں میں جاتا تو اس کی مہمان نوازی کرنے کو ان کا جی چاہتا۔ انہیں آہستہ آہستہ آرڈر ملنے لگے۔ وہ آرڈر زلیتا بھی اور سپلائی بھی کرتا ایک عدد سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل اس نے لی تھی۔ لیکن لاہور کی سڑکوں پر خاص طور پر اچھرے اور بھائی دروازے کے بازاروں کی چھوٹی بڑی چھٹی ہوئی سڑکوں پر بایک چلا نا امریکا کے سب سے اونچے پل کے موٹے رے پر بایک چلانے کے قریب

قریب برابر تھا۔ ہر بار واپسی پر آکر وہ کہتا۔

”تیرا لعل زندہ آگیا ماما! جلدی سے امیر ہو جائیں ورنہ میری خیر نہیں۔“ وہ ہنس دیتیں۔

گرمیوں کے دن تھے دونوں ماں بیٹا چھوٹی سی بھت پر کرسیوں پر آٹنے سامنے بیٹھے تھے۔ قریب قریب کی سبھی چھتوں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ گرمی بہت پڑھ گئی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے سے بجلی نہیں آ رہی تھی۔ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ نیند تو اسے بہت آ رہی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔

”پاکستان میں اب زیادہ ہی گرمی نہیں ہونے لگی؟“

”پہلے بھی اتنی ہی تھی۔“ وہ ساتھ ساتھ کا پتکھا سے بھی جھل رہی تھیں۔

”لیکن ماما پہلے مجھے اتنی گرمی نہیں لگتی تھی۔“ وہ نہیں۔ ”تب تم ایک کینال کی کوئی میس رہتے تھے۔ جس کے آگے ایک کھلا لان تھا۔ بہت سے درخت اور پودے تھے گھر میں اور آریکٹکٹ نے گھر کو ایسے ڈیزائن کیا تھا کہ وہ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا تھا۔“

”اچھا! ہمارے مالک مکان کو بھی ایسے ہی گھر ڈیزائن کروانا چاہیے تھا۔ دیکھیں! کتنا گرم گھر ہے ان کا۔ اتنی جلدی گرمی آجاتی ہے لاہور میں۔“

”چار مرلے کے گھر کو وہ کیا ڈیزائن کروانا۔ پھر یہاں زیادہ تر لوگ موسم کو دیکھ کر بنا ہی گھر بنوا لیتے ہیں اور تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ ہمارے گھر میں ایر کولیشن تھا۔ ہر کمرے میں۔ سارا گھر ہی ٹھنڈا تھا۔ جس کمرے تم اسکول جاتے تھے۔ وہ بھی۔ تمہارا اسکول بھی تو بیٹا! ایسے لوگوں کو کیا معلوم کہ پاکستان میں کتنی گرمی اور سردی ہوتی ہے۔ یہ سب تو کسی اور کو ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”یعنی غریبوں کو۔“

”غریب ہونا برا نہیں۔“

لیکن مشکل ضرور ہے۔ یہ جو ہمارے پڑوس میں آئی رہتی ہیں نا۔ بازار سے آ رہی تھیں۔ سچ ماما! گرمی کے قریب تھیں۔ شاید بلند پشتر کا مسئلہ تھا انہیں۔ میں نے انہیں بایک پر بٹھا کر گھر تک چھوڑنے کے لیے کہا تو کہتی ہیں۔ ”بھائی! میرے شوہر نے مجھے چھتر بار کر گھر سے نکال دینا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”آئی! چھتر کے کتے ہیں تو بولیں کہ یہ جو تم نے یوں میں پن رکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو شوہر ہیں۔“ تو وہ بولیں۔ ”انہیں چھتر بھی کہتے ہیں۔“

منز کو ہر اتنا لوچا تو قہر لگا کر انہیں کہ آواز ایک دو قریب کی چھتوں تک تو ضرور ہی گئی ہوگی۔

”کیوں اس کا اتنا سر کھانا تم نے کھا لیا۔“

”میرا پناہ گری سے کھوا ہوا تھا۔ پانی کی جو بوتل میں بیٹے کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔ وہ میں نے سر پر ڈال لی۔ ایک چھوٹا لڑکا بازار میں برف والا پانی بیچ رہا تھا۔ دس روپے میں اس سے پوٹل بھر والی اور لڑکے سے کہا کہ تم ضرور پوٹل بھر کر کسی بڑے ادارے کی ہال ڈور منجا لو گے۔“

”کیوں اس دلائی اسے؟ ایسے تو ہمارے ملک میں ہزاروں بچے ہیں۔ کہاں ان کے مستقبل بنے ہیں۔“

”میرے ماما! اس کا ضرور بنے گا۔ اسکول کے لیجنڈم میں تھا۔ تین روپے کا گلاس دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ”تو کاتو پچھو۔ اتنی گرمی میں پیسے ہو۔“ کہنے لگے۔ ”ستر روپے کی برف آئی ہے۔ پانی مفت کا ہے۔ ساتھ گلاس نکل جائیں گے آرام سے۔ اتنا منافع کافی ہے جسے ملک میں اور منگائی نہیں کرنی۔“

”بھت خوب۔ کمال کا بچہ تھا۔“

”آپا! وہی پریدل جانا ماما۔ میں نے اسے گھر چھوڑ دیا۔“

”بھت خوب۔ تم بھی کمال کے بچے ہو۔“

”آئی! بار اسپرے کیے ہیں میں نے۔ لیکن یہ چھتر آکر جاتے کیوں نہیں؟“ وہ بار بار ریکٹ سے چھتر بار

رہا تھا۔

”اسپرے سارے علاقے میں ہو گا تو ہی چھتر ختم ہوں گے وہ بھی شاید۔“ وہ تیزی سے پتکھا جھٹنے لگیں تاکہ چھتر فرزام سے دور ہی رہیں۔

”اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس کہ سارے علاقے میں اسپرے کروا دوں۔ لیکن اگر علاقے کے لوگ تعاون کریں تو میں پیسے اکٹھے کر کے کروا سکتا ہوں۔“

”فرزام! یہ عام لوگ ہیں۔ ان کی زندگیوں میں اتنے مسائل ہیں کہ یہ لوگ پھر جیسے مسئلے پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ پھر، کھیاں، گرمی، بجلی کا نہ ہونا۔ یہ سب ان کے لیے معمول کے اور معمولی مسئلے ہیں۔“

”مسئلے حل کرنے سے حل ہو جاتے ہیں۔ ختم نہیں ہوتے تو کم ضرور ہوتے ہیں۔“

”جن کی زندگیوں میں مدد کا مسئلہ ہو۔ وہ اور مسئلوں پر کیسے توجہ دیں؟“

”چلیں ہاں لیا۔ مدد منگائی، بے روزگاری۔ یہ مسئلے ہیں، لیکن ماما! گندگی۔ یہ تو مسئلہ نہیں ہے نا۔ غریب لوگ غریب ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ گندے کیوں ہیں۔ کیا صفائی ستھرائی میں بھی پیسے لگتے ہیں۔ گھروں کے سامنے گند ہے۔ اندر گند ہے۔ بچے گندے ہیں۔ میں نے گلیوں میں بغیر ٹیکر کے گندے سندے کپڑوں میں بہت بار بچوں کو دیکھا ہے۔ ماما! عورتوں کو ان سب کا تو خیال رکھنا چاہیے نا؟ گھروں کے آگے کوڑا پھینکنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ایک گلی کو صاف رکھنے میں کتنے پیسے لگتے ہیں۔ اور میں جب جب پائپ لگا کر گھر کے آگے دور تک کا حصہ صاف کرتا ہوں تو ساتھ والی آنٹی کے سارے بچے آکر میرے سر پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دو چھتوں سے لڑکیاں بھی مجھے دیکھتی ہیں۔ سچ ماما! میں بہت شکر گزار ہوں برطانیہ کا۔ اس نے میری بہت سے معاملات میں بہت اچھی تربیت کی ہے۔“

اس تربیت کا اس نے ذرا سا استعمال کیا اور گھر گھر جا کر پیسے لیے۔ وہ ہر ایک کے دروازے پر جاتا۔ چھتر

اور پھر کے کانٹے پر لپکھ رہا تھا۔ سب دروازوں کی پردوں کی اوٹ میں کھڑی منتظر رہتیں۔ کچھ پیسے پکڑا دیتیں۔ کچھ کہتیں کہ ”ان کے ابو آئیں گے تو ہی جواب دیں گی۔“ ایک آنٹی کو فرزام نے کہہ دیا کہ ”کیا پھر آپ کو آپس کے ابو سے پوچھ کر کاٹتا ہے؟“ وہ تو نہیں۔ ساتھ کے گھروں کی مین اور آئیناں بھی دل کھول کر نہیں۔

اسرے پر آنے والی کل لاگت فرزام نے لگائی تھی۔ گھر بھی گرنے لے تھے۔ اب ہر ایک کو ایک جیسی رقم دینا بھی پیسے اتنے زیادہ بھی نہیں تھے۔ کم از کم وقفے وقفے سے تین بار اسرے ہونا تھا۔ کچھ نے بحث کر کے پیسے دیے کچھ نے بنا بحث کے دیے دیے اور کچھ نے سرے سے دیے ہی نہیں۔ جنہوں نے نہیں دیے۔ ان کے فرزام نے اپنے پاس سے ڈال لیے۔ اس کے پاس بھی زیادہ پیسے نہیں تھے۔ لیکن اس نے سوچا کبھی تو آئی جائیں گے۔ فی الحال چھوٹوں کو نہیں آنا چاہیے۔ وقفے وقفے سے تینوں اسرے ہو گئے۔ کشادہ گلی میں سڑک کی طرف ٹکڑ پر ان کا گھر تھا۔ اندر سے اندر اور گلیاں نکلتی تھیں۔

اسرے سے انقلاب تو نہیں آیا۔ لیکن چھوٹوں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ جنہیں برداشت کیا جاسکتا تھا۔ گلی میں رہنے والی ایک آنٹی اسے ملیں تو بہت پیار سے بولیں۔

”بڑا چنکا اس تو کا کے!“ (بہت اچھے ہو تم لڑکے) انہیں آرڈرز بھی مل رہے تھے اور وہ کام بھی کر رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ منافع زیادہ نہیں ہو رہا تھا۔ منافع جزیرے کے پیٹروں میں نکل رہا ہے۔ ہر پیٹرل کی قیمت ڈبل سے ٹریبل ہو چکی تھی۔ نویشن میں بھی وہ ایڈمیشن نہیں لے سکا۔ اگر وہ ایڈمیشن لے لیتا تو آرڈرز اور سپلائی کا کام کون کرتا۔ کسی اور رو کر وہ فی الحال انورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کڈز گارمنٹس کے ٹکڑری اسٹورز سے بھی انہیں آرڈرز مل گئے تھے۔ لہٰذا اور مون مارکیٹ کے کچھ اسٹورز سے بھی بات چیت چل رہی تھی۔ لیکن وہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا

تھا۔ گلبرگ اور ڈیفنس میں کچھ اسٹورز ایسے تھے جن کے ساتھ بات چیت میں کئی گھنٹے گزار جاتے۔ ”تمہیں بٹھا کر یہ سمجھاتے رہے کہ انہیں کس طرح کے فیشن کے کپڑے چاہئیں۔ کن رنگوں کے اور کس کام کے ساتھ۔“

فرزام نوٹ کر لیتا تھا۔ اگر مل کو بتا دیتا تھا لیکن سپلائی کے وقت وہ نقص نکالتے کہ آرڈر دیا نہیں ہے اگر اتنے گھنٹے میں خلع کریں گی تو کنگ کا کام کون کرے گا اور اگر اتنے ہی گھنٹے فرزام ان سب کو نوٹ کرنے میں لگائے گا تو باقی کا کام کون کرے گا۔ لیکن ان اسٹورز کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتے تھے ان سے انہیں بروقت ادائیگی ملتی اور قریب قریب ان کی پسند کی ملتی۔

دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اخبار میں ایک ورکر کے لیے اشتہار دے دیا۔

ایڈ میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہمیں ایک گریجویٹ کی ضرورت ہے جو روٹائی سے انگلش بول سکے۔

”میں گریجویٹ کر رہی ہوں۔“
”لیکن لیڈی! آپ ہیں تو نہیں نا۔“
”نہیں۔ لیکن ہو جاؤں گی۔“
”لیکن۔“ وہ نوج ہو گیا۔ ”کیسے اب اس سمجھا ہوں کہ ہمیں گریجویٹ ہی کیوں چاہیے۔ کیونکہ اس ملک میں ایک گریجویٹ ہی اچھی انگریزی بول سکتا ہے۔“

”میری ایک بھابھی بی اے ہیں۔ وہ تو انگلش نہیں بول سکتیں۔“ اس نے آنٹی بے چارگی سے جی بولا کہ فرزام اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”یہ انٹرویو اسی لیے تھے کہ معلوم کیا جاسکے کہ میرے پاس آنے والی بی اے انگلش بول سکتا ہے کہ نہیں۔“

”ایڈ میں لکھا ہے کہ اسے ڈیزائننگ کی سمجھ ہو۔“

”ہاں چاہیے۔ تو مجھے سمجھ بوجھ ہے۔ میں کسٹمر کیلئے کو آسانی سے سمجھ سکتی ہوں۔“
”میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن لیڈی! آپ کو کسٹمر سے ڈیل نہیں کرنا۔ آپ کو کچھ گروپس سے ڈیل کرنا ہے۔ جن سے آرڈرز لینے ہیں وہ اسٹورز گلبرگ اور ڈیفنس میں ہیں۔ کچھ سوسائٹیز میں ہیں۔ عام روٹین میں بھی ان لوگوں کو علوت ہوتی ہے انگلش میں ہی بات کرنے کی۔ ایڈ میں میل فی میل ضرور لکھا ہے۔ لیکن ہماری ترجیح لڑکا ہے جو اپنی کٹونس پر آجاسکے۔“
”مجھے کڈز گارمنٹس میں بہت اچھا تجربہ ہے۔ میں جانتی ہوں میں آپ کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔“ اس بار اور بے چارگی سے کہا گیا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو ایک اچھی جاب کی ضرورت ہے۔ لیکن۔“ اس کی شکل پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

”اچھی جاب کی نہیں ایک شریف جاب کی۔“
”اسے لگاڑی روٹنے ہی والی ہے بس۔“

”جگہ میرے گھر سے قریب ہے۔ میں یہاں چھٹی آسکتی ہوں۔“

”میں آپ کے لیے ضرور کچھ کرتا۔ اگر کر سکتا۔“ اس کی بے چارگی پر اسے ترس آیا۔
”ہاں جی جی۔ وہ وہاں آئی دس لڑکیوں اور پانچ لڑکوں کے ساتھ۔ چھٹی لڑکی تھی ایک فریش گریجویٹ لڑکے کو فرزام نے اوکے کر دیا۔ انٹرویو ان کے گھر میں ہی ہوئے تھے۔ جہاں ایک کمرے میں انہوں نے ایک میز لود کر دیاں رکھ کر اسے آفس بنالیا تھا۔

رہت کو وہاں سے اس لڑکی کا ذکر کرنا نہیں بھولا۔
”اس نے کہا کہ اسے ایک شریف جاب کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے بہت برے حالات دیکھے ہیں۔“ اس نے کہا کہ کڈز گارمنٹس کی اسے بہت سمجھ بوجھ ہے۔ سام! آپ اسے اپنے ساتھ لے لیں۔
”میں نہیں رکھ لیتی۔“

”ہم ایک اور ورکر کی تنخواہ کہاں سے نکالیں گے؟“

”ہو سکتا ہے! ابھی وہ کم پیسوں پر مان جائے۔ پھر آنے والے وقت میں ہم اسے زیادہ دے سکیں۔ میرے انکار پر وہ روٹنے والی ہو گئی تھی۔ کچھ بیچنے ہاں۔“

”دیکھ لو۔ ابھی ہم اتنے منافع میں نہیں جا رہے۔“
”نچے آکر اس نے وہ فہرست نکالی۔ جس پر ہر امیدوار کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے نمبر کو موبائل میں محفوظ کر لیا۔ تاکہ صبح اسے کسی بھی وقت فون کر سکے۔ پھر اسے خیال آیا کہ یقیناً ”آج وہ بہت مایوس ہوگی۔ اگر وہ ابھی فون کر دے تو شاید یہ اس کے لیے اچھا ہی ہو۔ اس نے فون کیا۔ وہ اس لڑکی کی آواز تو بالکل نہیں تھی۔ فرزام نے اپنا تعارف کروایا۔“

”مجھے افتخار القیوس سے بات کرنی ہے۔ آج وہ میرے پاس انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔“

اسے نوبت آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ سوا آٹھ بجے ہی وہاں تھی۔ مسز گوہر خود فجر کے بعد نہیں سوتی تھیں۔ اپنا کام کرنے لگتی تھیں۔ اسے وقت سے اتنا پہلے دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ البتہ انہوں نے اسے کلم سمجھا دیا۔ پہلے اسے ہر میٹرل کو دیکھ کر فہرست بنانا تھی کہ کون سا میٹرل کتنا ہے۔ بڑے کمرے میں سب میٹرل رکھا ہوتا تھا۔ اس نے نوبت یہ کام کر لیا۔ مسز گوہر حیران ہوئیں۔ وہ اچھی خاصی پھرتی تھی۔

”تم نے اس سے پہلے کہاں کام کیا ہے افتخ؟“ اس کی پھرتی کو دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ وہ کسی بڑے ادارے میں کام کرتی رہی ہے۔

”میں۔“ وہ بتاتے ہوئے شرمندہ ہو گئی۔ ”دون دن پہلے تک میں ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتی رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔

چھوٹے سے جس ریسٹورنٹ میں وہ کام کرتی رہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تھی۔ اس میں اس سمیت دو اور لڑکیاں تھیں۔ دو لڑکے تھے جو آرڈر لیتے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہو کر فاسٹ فوڈ کوڑے میں رکھ کر آرڈر دلانے والے پوائنٹ کو دیتی تھیں۔ آنے والے کسٹمر خود بھی کاؤنٹر تک آکر اپنی ٹرے لے سکتے تھے اور تین لڑکیاں جب کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوں تو وہاں تک آنا کسی کو برا نہیں لگتا تھا۔ افق ہر روز کاؤنٹر پر اٹھ کر دس بارہویں تنگ کارڈز ڈسٹ بن میں پھینکتی تھی۔ یہی حال دوسری لڑکیوں کا بھی تھا انہیں ان کی خوب صورتی کی بنا پر رکھا گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے قذافی اسٹیڈیم میں نئے بنے باؤنڈری شاپنگ سینٹر میں نوکری کی تھی۔ وہاں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کا کام ریکس کو چیک کرتے رہتا اور ان میں رکھی گئیں مصنوعات کی کمی پر انہیں وہاں لا کر رکھنا تھا۔ وہ سارا وقت لوگوں کی نظروں میں رہتی۔ آتے جاتے اس کے ہاتھوں کو کمر کو مس کیا جاتا۔ بہانے سے اسے کارڈز دیے جاتے۔ یہ سب تو کم تھا۔ اس کے ایک کو لیگ لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کئی ہفتوں سے اس کا نمبر مانگ رہا تھا۔ ریٹورنٹ کی جانب ملتے ہی اس نے شاپنگ سینٹر کی جانب چھوڑ دی۔

اس جانب میں ایک اور مسئلہ تھا۔ اسے دو بیس بدل کر انارکلی سے قذافی اسٹیڈیم آنا پڑا۔ اس کی آومی ٹخنہ کرایہ میں ہی نکل جاتی۔ ماں کی گھرواپسی کے بعد انہوں نے ایک وقت کا کھانا کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ انہیں گرمی نہ لگنے دی جائے۔ انہوں نے سیدھا سیدھا حالے سی کے لیے کہا تھا۔ علاج کے سارے اخراجات دانیہ نے اٹھائے تھے تو جو میسے جمل کے پریس کے مالک اور اسکول کی میڈم نے دیے تھے۔ اس سے انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ اسپلٹ اے سی لگوا لیا تھا۔ ماں نے بہت نہ نہ کی۔ لیکن اس نے بھابھی کے شوہر کو میسے دیے۔ وہ ماں کی زندگی کے لیے زمین آسمان ایک کر سکتی تھی۔

ماں کی بیماری جاچکی تھی۔ لیکن زندگی جیسی بیماری

ابھی ساتھ تھی۔ وہ ماں کے اسکول میں گئی۔ لیکن وہاں اسے تین ہزار میں پچھرا کھا جا رہا تھا۔ ایف اے پاس لڑکی کو اتنے ہی مل سکتے تھے۔ تین ہزار میں تو کلاس ٹیکس کا بل بھی ادا نہیں ہوتا تھا۔ ماں کے لیے جو مخصوص خوراک آتی تھی وہ الگ۔ اس مقام پر یہ ہوا کہ افق ان سب کی ماں بن گئی۔ اپنی ماں کی جگہ ماں۔ پہلے وہ صرف کام کرتی تھی۔ اب اسے کام کے ساتھ ساتھ سب کچھ سنبھالنا بھی تھا۔ اسے صرف وہ وقت کی روٹی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے دو وقت کی روٹی جمع بھی کرنا تھی۔ ماں پر جو وقت آیا اور پھر اسے بھیک مانگنی پڑی۔ اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ جس بل پر سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اس کے اختتام پر ایک عبارت لکھی تھی۔

”خود کو روندے جانے کے لیے تیار مت کرو۔“ اور افق اب کی بار کسی دکھ، تکلیف یا انسان کے ہاتھوں روندے جانے سے ڈرتی تھی۔ زندگی میں صرف جینا ہی نہیں آنا چاہیے۔ اگر پیچھے سیلائی رپا آجائے تو بھاگنا آنا چاہیے اور اگر رپا آئی جائے تو تیرا آنا چاہیے۔ زندگی میں صرف کھانا اور سونا ہی نہیں آنا چاہیے۔

انسان کوئی جانور نہیں ہے کہ شیر صرف دھاڑی سکتا ہے اور چھلی صرف تیرتی سکتی ہے۔ کوئل گائے گی اور سانپ پھنکارے گا۔ بندر درختوں پر چڑھے گا اور خرگوش صرف زمین کھود کھود کر سرنگ اور گھروندے بنائے گا۔ یہی سب تو انسان کو جانور سے الگ کرتا ہے کہ انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے فطرت نے ایک خاص خوبی تک سپاہ نہیں کیا۔ پھر بھی لوگ جانوروں کی طرح خود پر بوجھ لہوا لیتے ہیں۔ چابک کھاتے ہیں اور اپنے ہی پیچھے انسانوں کے جوتے چاٹتے ہیں۔

افق نے تین ہزار کی وہ اسکول کی نوکری کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری نوکری کے بارے میں معلومات کرنے لگی۔ اگلی نوکری اسے ساڑھے تین ہزار میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر ملی۔ اسے کاؤنٹر پر بیٹھ کر نوکری

کرتی تھی۔ فنون ریسیو کرنے ہوتے اور باری باری ہر نوکری کو اندر بھیجنا ہوتا۔ پھر اسے شاپنگ سینٹر کی جانب کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہاں اسے دس ہزار ملے۔ جیسے تیسے اس نے وہ جاب کی اور پھر وہ ملتی میں بنے ایک نئے ریٹورنٹ میں آگئی۔ پہلے اسے صرف چھ ہزار ملتے تھے، لیکن جمل اسے مانگیل پر پہل چھوڑ جاتا تھا۔ جمل نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ جمل نے کہا کہ وہ برائیت پڑھ لے گا اور پڑھنے کا کیا ہے زندگی میں کبھی بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

رات کو دونوں بھائی پریس جاتے اور دن میں جمل ایک کپڑے کی دکان پر کام کرتا۔ ماں گھر میں اکیلے رہتی۔ بھابھی ہی آکر پوچھتی رہتیں۔ مسز گوہر کے یہاں بھی وہ انہی کے ساتھ آئی تھی۔ انہی کے شوہر نے اخبار میں وہ ایڈ دیکھ کر دونوں کو بھیجا تھا۔ ریٹورنٹ کے ماحول سے وہ عاجز آچکی تھی۔ اب وہ چند ہزار کے لیے خود کو ہر روز بنیام نہیں کر سکتی تھی۔ مسز گوہر نے اس سے کہا کہ منافع دیا ہوتا ہے وہ اس کی خواہ برعادیں گی۔ ایک ہند گھر میں ایک عورت کے ساتھ اسے کام کرنا تھا اور اسے بہت سکون تھا۔

جب وہ فیکٹری جایا کرتی تھی۔ تب ہی سے اس کی کھالیں تھیں کہ وہ بھی ڈیرائنو بنے۔ ماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ حالات اچھے ہوتے ہی وہ اسے ایک چھوٹا ماکورس تو ضرور ہی کرا دیں گی۔ ایک دو بار اس نے ایک دو خلعے فیکٹری کی ڈیرائنو کو دکھائے تھے۔ چند لکھنوی تبدیلیاں کر کے ڈیرائنو نے وہ کپڑے ادا کر دیے تھے۔ اس میں سیکھنے کی ذہر دست

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے بہت سے کام کیے تھے۔ فراگوند کے خاکی لفافے، کاج، بن، ریڈی میڈ، پینل پر کار لگانا، ڈیکوریشن، سوز کی تیاری، جیولری، ڈیجیٹل ڈیرائنو جوتوں پر اسٹون لگانے کا کام۔ وہ ہر کام کرنے سے کرتی۔ نفاست سے مکمل کرتی۔ یہی بھابی کا تجربہ تھا کہ مسز گوہر کی مدد کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مسز گوہر کپڑے کی ہر سائز کی کٹنگ کرتی

تھیں۔ اس پر پھر ایمریڈی اور اسٹون ورک ہونا پھر انہیں سلائی کیا جاتا۔ آخری کام انہیں اچھی طرح دیکھ کر ٹانگوں کو چیک کر کے، سائز کو پھر سے ٹاپ کر چیک کرنے کا ہوتا۔ ہر آرڈر کو الگ الگ پیک کرنا ہوتا۔ کس رنگ، میٹرل، ڈیزائن کے نمونے کتنے بنیں گے۔ یہ بھی الگ الگ فہرست میں درج کرنا ہوتا۔ آرڈر ڈیور کرنے کی تاریخ ذہن میں یاد رکھنی ہوتی، مسز گوہر کا اصول تھا کہ وہ ایک بھی دن آرڈر لیٹ نہیں کرتی تھیں۔ اکثر رات رات بھر بیٹھ کر وہ اور فرزام کام کرتے۔

افق ماضی میں اتنے سارے کام کر چکی تھی۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ فیکٹری میں جو اس نے تھوڑی بہت کٹنگ سیکھی تھی۔ وہ یہاں کام آگئی۔ وہ پانچ ماہ کی بچی کی شلوار لیس آرام سے کاٹ لی۔ ماسٹر جی سلائی کرتے۔ وہ اگر فارغ ہو جاتی تو تیسری مشین پر بیٹھ کر سلائی کرنے لگتی۔ قیصوں پر۔ چھوٹے چھوٹے شرابوں پر تھوڑے بہت اسٹونز لگتے ہوتے تو وہ اٹھتے بیٹھتے آرام سے لگا لیتی۔ مسز گوہر کو شرمندگی ہوتی۔ ٹھیک ہے، وہ ان کی مدد کے لیے ہے۔ لیکن مدد سے ان کا مطلب اوپر کا کام تھا۔ کاریگروں والا کام نہیں۔ وہ گھر اس وقت نہیں جاتی تھی جب وقت پورا ہو جاتا تھا۔ وہ اس وقت جاتی تھی جب کام ختم ہو جاتا تھا۔ پہلے وہ صبح آٹھ بجے آتی تھی۔ پھر وہ سلت بجے ہی آ جاتی۔

”میرا بیٹا کتنا ہے کہ میں بہت محنت کرنے والی خاتون ہوں۔ لیکن افق! تم بہت بہت محنت کرنے والی لڑکی ہو۔ تم تو جن ہو۔ تم چھلتی نہیں۔ کیا کھاتی ہو؟“ ”انسان کو کام نہیں، خدمات تھا دیتے ہیں اور اب کام میرے لیے صدمہ نہیں۔ آپ کو نہیں معلوم، مجھے اس کام میں کتنا مزہ آتا ہے۔ ہم روز نیا کام کرتے ہیں۔ نئے ڈیزائن پر، نئے رنگ پر، نئے کپڑے پر۔ رات بھر یہ رنگ میری آنکھوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ میں صبح تک ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتی ہوں۔“

”ایسا ہی میرے ساتھ تھا۔ میرے شوہر گاؤں سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت سے تعلیم مکمل کی اور جاب کی اور پھر مجھ جیسی عام سی لڑکی سے شادی کی۔ میں صرف بارہ جماعتیں پاس تھی۔ جس آفس میں وہ کام کرتے تھے۔ میں وہاں آپریٹر تھی۔ لیکن مجھے ڈیزائننگ بننے کا بہت شوق تھا۔ جب ہم اپنا گھر بنا چکے تو انہوں نے میرا شوق پورا کر دیا۔ مجھے بتایا کہ کیسے میں گھر پر رہ کر اپنا کام کر سکتی ہوں اور واقعی ایسا ہو گیا۔ میرے بنائے ملبوسات کو پسند کیا جانے لگا۔ میں ایک بڑے نام کی ڈیزائننگ نہیں تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ میں خوش تھی۔ میں اپنی مرضی سے ڈیزائن کرتی اور اسے پسند کیا جاتا۔ اتنے سال برطانیہ میں میں نے اس شوق کو دبائے رکھا۔ رنگ مجھے بے چین کر دیتے۔ میرے ہاتھوں میں آنے کے لیے پچھلتے۔ اب میں اس چھوٹے گھر میں رہ کر چھوٹے سے پیانے پر بہت محنت سے کام کر رہی ہوں۔ لیکن میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ تم اپنے ذہن میں آنے والے کسی بھی ڈیزائن کا خاکہ مجھے دکھا سکتی ہو۔ اچھا ہوا تو ہم اس پر کام کر لیں گے۔ کتابیں پڑھ کر ہی سب کام نہیں آتے۔“

افتح مسکرائے گئی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اسے یہ پہلی خوش خبری ملی تھی۔ اس نے زندگی بھر کام کیا تھا۔ خواب نہیں دیکھے تھے۔ خواہش نہیں کی تھی وہ اپنی چادر کو جانتی تھی۔ لیکن ایک آدھ خواب ضرور پالنا چاہیے۔ اس خواب کے پیچھے ضرور بھاگنا چاہیے۔ اس خواب کے لیے جان توڑ کوششیں ضرور کرنی چاہیے۔ اگر یہ خواب نہ دیکھے جاتے تو دنیا کبھی اتنی ترقی نہ کرتی۔ اب افتح نے پیسے ضرورت سے ہٹ کر ایک خواب دیکھا۔ اپنے کامیاب ہونے کا۔ آدھے سے زیادہ کام وہ گھر لے جاتی تھی۔ کپڑوں کے تھان کے تھان وہ جل کی سائیکل پر رکھ کر گھر بھجوا دیتی اور رات بھر بیٹھ کر چھوٹے سائز کے کپڑے کاٹ لیتی۔ پیپر پر خاکے بناتی کہ کس پر کس ڈیزائن کا کام ہونا چاہیے۔ کس رنگ کا۔ کس اسٹون کا۔ یہاں اسے

فیکٹری میں کام کا تجربہ دودھ سے لگا۔ وہاں ایک ایک کام کو تفصیل میں اور ترتیب سے کیا جاتا تھا۔ کارکن رنگ کا ہو گا۔ مٹن کس رنگ، سائز کے ہول کے کہاں کہاں گئے گئے۔ پاکٹ کہاں ہوں گی اور کہاں۔ کس رنگ کے ساتھ کس رنگ کی میچنگ ہوگی۔

وہ ایک چھوٹے لیول کی لوکل فیکٹری تھی۔ اس اتنی سی فیکٹری میں کام بہت ترتیب سے ہوتا تھا۔ کوالٹی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیبر کو چیک کیا جاتا تھا۔ ایک ایجنٹ کی بیٹی نہیں کی جاتی تھی۔ اپنے پس منظر میں کی بیٹی ہو جاتی تھی۔ انہیں لوہڑا نئے سرے سے سلائی کروایا جاتا تھا۔ اس معاملے میں ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ کا ایک ہی اصول تھا۔ وقت اور قوت کتنی ہی صرف ہو۔ کوالٹی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ رات بھر بیٹھ کر وہ کنگ کرتی۔ خاکے بناتی۔ خاکے پر بنیادی باتیں لکھ دیتی اور صبح پہلے خود جاتی۔ پھر جمل سائیکل پر سالانہ چھوڑ جاتا۔ مسز کو ہر چیک کرتی تھیں۔ کی بیٹی دور کر کے، اوکے کر کے کارگیروں کے پرہ کر دیتیں۔ آرڈرز کی تیاری میں تھوڑی سی تیزی آگئی۔ مسز کو ہر وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ آرڈرز نہیں لیتی تھیں۔ اب ایک دو آرڈرز اور لینے لگیں۔ فارغ وقت میں وہ گلبرگ اور ڈیفنس کے اسٹورز میں جا کر ڈسکس کر لیتیں کہ ان کی ڈیمانڈ کیا ہے۔ اس طرح انہیں آسانی رہنے لگی۔ وہ وہی ڈیزائن کر دیتی تھیں ان کی ڈیمانڈ ہوتی جو انہیں چاہیے ہوتا۔

ایک دن شام گئے انہیں گلبرگ کے ایک اسٹور سے فون آیا کہ ایک میڈم ہیں۔ انہیں انارکلی فرائم تین مختلف سائز اور رنگوں میں چاہیے۔ میڈم کو ان کا نمبر دے دیا گیا۔ مسز کو ہرے ان سے بات کی۔ اگلے دن ان کے کزن کی بارات تھی اور انہیں وہ انارکلی فرائم اپنی بھانجیوں کے لیے چاہیے تھیں۔ اسٹور پر موجود ایک وہ اپنی بیٹی کے لیے لے چکی تھیں۔ ان کی بھانجی کو بھی وہی پسند آگئی تھی۔ لیکن اس کے سائز کی اور موجود نہیں تھی۔ مسز کو ہر کو یہ بتایا

انارکلی فرائم ہاتھ اور ان کا ماننا تھا کہ کبھی بھی کسٹمر کو نہیں کھانا چاہیے۔ لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ کلرنگر جانے والے تھے۔ منیجر مل موجود تھا۔ ان کے پاس وہی اور گئے بر اسٹون ورک ہوا تھا۔ صرف اسٹون ورک کے لیے ہی انہیں آٹھ گھنٹے تھے۔ معذرت کے ساتھ انہوں نے انکار کر دیا۔

”اب کو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ افتح کو انارکلی فرائم نے عرض کیا تھا۔

”کلرنگر۔“ وہ گھنٹے تک سب ہی کارگر چلے جاتے تھے۔ انہیں کل دن میں بارہ بجے تک چاہیے۔“

افتح ان سے بات کریں اور ان سے کہیں کہ اگر اسٹون ورک تھوڑا ہلکا ہو جائے تو آپ جانتی ہیں کہ بچے ایک چیز پسند کر لیں تو انہیں وہی چاہیے ہوتا ہے۔“

”جو بھی ہم کیسے کام کریں گے افتح۔ وقت نہیں ہے۔“

”اب کارگیروں سے بات کریں میڈم! اگر وہ آج بات کام کر لیں گے تو آپ انہیں کل کی چھٹی دے دیں گی۔“

”اگر کل انہیں چھٹی دے دی افتح! تو باقی آرڈرز کو کیا کرے گا۔ ہم صرف تین بچوں کے لیے اتنا کچھ کر لیں گے؟“

”ہو سکتا ہے وہی میڈم! میں اور آرڈرز بھی دے دیں گی۔ ہماری باقاعدہ کسٹمر بن جائیں۔ ہمیں ان سے کچھ بڑھتی ہیں۔“

”لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی فائدہ نہ ہو۔“

”فائدہ ہو بھی سکتا ہے۔ ہماری فیکٹری میں ایسے کسٹمر بہت ہی کم مل جاتی تھی۔“

”کلرنگر! اب تک سوچنے کے بعد انہوں نے بیگم کو فون کیا۔ انہیں تفصیل میں بتایا کہ انہیں کتنے کام میں لگ سکتی ہیں۔ اس نے ہاں کہہ دی۔ اپنی

مرضی کے تین مختلف رنگ بتا دیے۔ رنگ سازی مسز کو ہر خود ہی کر سکتی تھیں۔ رنگ ساز فورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک مقامی ادارے میں دو گھنٹے ہر روز جا کر انہوں نے رنگ سازی سیکھ لی تھی۔ سفید شیفون کو انہوں نے بیگم کے بتائے رنگوں میں رنگا۔ اس دوران افتح نے چوڑی دار پاجامے کاٹ دیے۔ سلائی ماسٹر وہ پاجامے سینے لگے۔ سارے کارگر رات بھر کام کے لیے ملن گئے تھے۔ اگلے دن کی چھٹی بھی انہیں مل رہی تھی اور رات کے کام کے الگ پیسے بھی۔ گھر فون کر کے افتح نے اپنے کام کے بارے میں بتا دیا تھا۔ مسز کو ہر ایک بار اس کے گھر جا کر انہیں سے مل آتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔ رات بھر کام ہوتا رہا۔ دونوں کارگیروں نے مل کر پہلے ایک کو اوڑھے پر لگایا۔ اس پر کام کیا۔ پھر دوسری لگے۔ اس دوران سلائی ماسٹر ان کی ڈیکل سلائی کرتے رہے۔ مسز کو ہر اور افتح دونوں پر دوسری مشینوں سے بنیادی فٹنگ لگاتی رہیں۔ مسز کو ہر نے ہی انہیں کھانا منگوایا تھا۔ درمیان میں آدھے گھنٹے کے وقفے سے وہ لوگ باری باری آرام کرتے رہے تھے۔ صبح فجر کے وقت دونوں کارگر اپنے کام سے فارغ ہو کر چلے گئے۔ اگلے تین گھنٹوں میں ماسٹر صاحبان بھی چلے گئے۔ آخری مراحل میں دونوں نے سلائیاں چیک کیں۔ سائز کو ٹپا۔ انہیں استری کیا اور پیک کر دیا۔

جمل افتح کو لے کر گھر چلا گیا۔ بارہ بجے بیگم اپنے ڈرائیور کے ساتھ آکر سائز اور کام چیک کر کے لے گئیں۔ بیگم وہی قیمت دے گئی تھیں جو مسز کو ہر نے مانگی تھی۔ انہوں نے ایمر جنسی کام کیا تھا۔ مسز کو ہر نے ڈبل قیمت مانگی تھی۔ وہ ڈبل ہی دے گئی تھیں۔ ”بس بچے ہیں نا۔ جو چیز دیکھ لیتے ہیں وہی مانگتے ہیں۔ میں کل ہی اٹلی سے آئی تھی۔ خریداری کرنے نکلی تو ایک ہی فرائم بنی کو پسند آگئی اور وہی بھانجی کو۔ میری سسٹر نے کہا کہ اب باقی سب بھی ایسی ہی مانگیں گی۔ میرے لیے تو بہت مشکل ہو جائے۔ پھر اتنا رولی ہیں نا یہ سب۔“

یہ ان کا پہلا آرڈر تھا جسے انہوں نے راتوں رات کھل کیا تھا۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ شاید انہیں ایسا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ انکاریکوں کو چھٹی دینی پڑی اور اب اگلے آرڈر لیٹ ہو جائیں گے۔

دو دن وہ اسی بچھتاوے میں رہیں۔ افق سے بھی ذکر کیا۔ وہ شرمندہ ہوئی کہ شاید اسی کے مشورے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ لیکن ایسا ہوا کہ کچھ بچھا نہیں ہوا۔ بلکہ بہت اچھا ہو گیا۔ وہی بیگم ایک ہفتے بعد اپنی بہن کے ساتھ ان کے پاس موجود تھیں۔ دو ماہ بعد ان کی بہن کے دیور کی شادی بھی برطانیہ میں۔ بہن بھی وہیں کی رہنے والی تھیں۔ بہن نے اپنی دو بیٹیوں، مند کی تین بیٹیوں کی ایک بیٹی کا ساز لکھوا دیا۔ رنگ اور ڈیزائن نوٹ کروا دیے۔ لیکن چولی انارکلی چوڑی دار، گھیر وار شلوار وغیرہ۔ انہوں نے الگ الگ سب کے لیے تفصیلات بتا دیں۔ چار فنکشنوں کے لیے چھ بچیوں کے کپڑوں کا آرڈر مل گیا۔ بجٹ وہ بتا گئیں اور اچھا خاصا ٹھیک ٹھاک بجٹ تھا۔ صرف اپنی بیٹی کے لیے بارات کی انارکلی فراک وہ چالیس ہزار کی ہوا رہی تھیں۔ آرڈر تیار کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ماہ تھا۔ وہ آرام سے بنا سکتے تھے۔ کاریگروں کے ساتھ مسز گوہر کا لوٹس کا وعدہ تھا۔ اس آرڈر پر انہوں نے ہر کاریگر کو بونس دیا۔

چند ڈیزائن جو وہ منتخب کر گئی تھیں۔ ان میں سے ایک شرارے کا ڈیزائن تھا جو افق کا تیار کیا گیا تھا۔ شرارہ بہت ہلکا پھلکا سا تھا۔ فیوزی رنگ کا شرارہ تھا اور ہلکے گلابی رنگ کی کڑی تھی۔ کڑی پر سفید اسٹونز کا چھن تھا۔ دھننا فیوزی اور گلابی رنگ کا تھا اور اس پر بھی سفید اسٹونز کا چھن تھا۔

پندرہ دن میں انہوں نے اپنے کام کے دوران ان کا آرڈر بھی تیار کر دیا۔ اپنا پہلا فارن آرڈر۔ سارا سامان برطانیہ بھجوا دیا۔

شب منٹ وصول کرتے ہی انہوں نے تین اور بچیوں کے ساز لوٹ کروائے۔ ایک ہفتے بعد چھ اور بچیوں کے مسز گوہر تین سال سے بارہ تیرہ سال کی

بچیوں کے کپڑے بناتی تھیں۔ لیکن پر نور دو فرسٹ کے ساتھ انہوں نے چھ ماہ عوامہ ڈیزائن مل ڈھانکی سال کی بچیوں کے لیے بھی کپڑے بنوا دیے۔ انہوں نے شاید شادی میں شرکت کرنے والے ہر خاندان میں موجود ہر بچی کا ساز انہیں لکھوا دیا تھا۔ اسی انداز سے منسلک ان سے تین چار مختلف لڑکیوں کی فون کا ہے بگ ہے بات کرتی اور بتاتی رہتیں کہ انہیں کس طرح کے کپڑے چاہئیں۔ ان کا پہلا فارن آرڈر جس سے انہیں ایک بڑا منافع ملا۔ برطانیہ جیسے ملک میں جہاں شادی بیاہ کے روایتی کپڑوں کی خریداری مشکل کام ہے اور چھوٹی بچیوں کی تو بہت ہی مشکل ہے۔ ان میں ان کے ہاتھ ایک لوکل ڈیزائنر آگئی جو کہ ان کے نزدیک بہت مناسب قیمت پر اچھے کپڑے بنا کر دے دیتی تھیں۔

اس آرڈر کو تیار کرنے میں انہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب آئے دن انہیں وہاں سے فون کاڑ آتے لگیں اور وہاں سے گاہے لگائے آرڈرز ملنے لگے۔ ایک دوسرے کا رفرنس دے دے کر کہتیں کہ انہیں فلاں نے ان کا نمبر دیا ہے فلاں نے دیا ہے ایک سے دو اور دو سے کئی دوسرے کسٹمرز انہیں آرڈر دینے لگے۔

”ماما! یہ جو لڑکی آپ کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اسے کسی یورپین ملک میں ہونا چاہیے تھا۔“
”وہ کیوں؟“

”ارے ماما! یقین جانیں۔ میں نے ابھی تک کسی لڑکی کو سائیکل کے پیچھے ایسے بیٹھتے نہیں دیکھا۔ سارے لاہور میں ایک ہی واحد لڑکی ہوگی سائیکل کے پیچھے بیٹھنے والی۔“

”تم نے سارا لاہور دیکھ لیا؟“ وہ مسکرائیں۔
”سارا انہیں دیکھا۔ جتنا بھی دیکھا ہے۔ اس میں واحد ہے۔ شاہراہ قائد اعظم جیسی پر روشنی سڑک پر سائیکل پر بیٹھ کر سفر کرتی ہے۔ بہت اعتماد ہے اس

ملا۔ میں فراموش ہوں کہ ان باتوں کو معمولی جانتی تھی۔ پاکستانی معاشرے میں نہ ہوتی تو وہ خود بائیں چلا کرتی۔ بس کی کنڈیکٹر بھی بن جاتی۔

”اس لیے تو کہا کہ اسے یورپ میں ہونا چاہیے۔“
”اتنی لمبی چادر لیٹ کر وہ پیچھے بیٹھتی ہے، کسی دن سائیکل میں چادر پھنسی تا تو جس سڑک پر وہ گرے گی، ہر دے مر کر ہی اٹھے گی۔“

”ارے ماما! سخت سے کام کرنے والوں کے لیے انسان بہت سخت ملک ہے۔ عورتوں کے لیے خاص طور پر۔ عزت بھی سنبھالو کپڑے بھی اور اتنا بھی۔ ان معاملات میں پاکستانی عورت دنیا کی دوسری عورتوں سے زیادہ سختی ہے اور اگر اس عورت کا معاشرہ ذرا سا مائیکرو ہے تو یہ عورت کہاں سے کہاں جائیگی۔“

”میں وہ سائیکل پر بیٹھی اچھی نہیں لگتی؟“
”اچھی بہی میں ماما بڑا بونا سمجھتا ہوں میں خود کو اس کے سامنے۔ اس کے سامنے ہی نہیں اپنے اسلم کے سامنے۔ جمل اور اسد کے سامنے۔ اس دن افق نے دس بار اسے گھر بھیجا چیزوں کے لیے۔ ماما وہ دس چکر لگا کر آیا۔ پانچویں چکر میں

میں نے اسے پیسے دیے کہ رکشہ کر لو اور اس میں سب چھپنے لے آؤ تو بولا فرام بھائی! آپ کو کتنی عالت ہے بچو ضائع کرنے کی۔ ان پیسوں میں ایک گلو سیب لٹا دیا۔ اسے انہیں لیں اور کھائیں۔ میرے پاس وقت بھی ہے اور طاقت بھی۔ مجھے انہیں استعمال کرنے دیں۔ جیسے اس نے دس چکر لگائے ماما! میں نے دیکھ دیکھ کر تھک گیا۔ لیکن وہ نہیں تھکا۔ کچھ بیٹھنے میں ان کے ریس چلا گیا۔ اتنی گندی جگہ پر کھانا کھا رہا تھا کہ بتا نہیں سکا۔ دولتی ملی ہوئی جس نے اسے گزرا کر آگے ریس خانہ تھا اور اتنی بدبو اور گرمی تھی۔ اسد اتنا پیار لڑکا ہے۔ نیلی آنکھیں ہیں لڑکی۔ اتنا خوبصورت ہے کہ بتا نہیں سکا۔ مجھے

بہت ترس آیا۔ اسے اتنے گندے حلیمے میں وہاں دیکھ کر۔ میں نے جمل سے کہا کہ میں اس کے لیے کسی اور نوکری کا پتا کروں تو کہتا ہے کہ ہمارے مالک نے ہمیشہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ آج کل وہ بیمار ہیں۔ ان کا کام ہم سنبھال رہے ہیں۔ ایسے انہیں چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جائیں گے۔ ذرا بے حد متاثر نظر آ رہا تھا مسز گوہر مسکرا دیں۔

”ماما! میں نے آپ کو بھی بتایا نہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی کے اس طرح بدل جانے پر بہت دھمی تھا۔ برطانیہ سے نکالے جانے پر۔ اس بنا بجلی کے ملک میں رہنے پر۔ اور اب میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ کیونکہ لاکھوں سے کم تر ہو کر کروڑوں سے میں بہتر رہا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی اصول اور فلسفہ نہیں بنایا۔ جمل کے پاس اصول ہیں۔ اسد کے پاس بھی ہیں۔ ماسٹر جی اور اسلم کے پاس بھی ہیں اور پالی بیچنے والے بیچے تک کے پاس اصول ہیں۔ لیکن میرے پاس نہیں۔ ماما! جب ہم ایک بر آسائش زندگی گزارتے ہیں تا تو ہم صرف چیزوں کے نام اور انہیں استعمال کرنا ہی سیکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم جدوجہد میں آتے ہیں۔ مصائب کا شکار ہوتے ہیں تا تو ہی ہمیں اپنے اصل اور نقل کا پتا چلتا ہے۔ تب ہی ہم تانے سے سونا بنتے ہیں۔ یہ ماسٹر جی ہیں۔ مشین خراب ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ یہ ان کا کام نہیں۔ پکھا خراب ہوا۔ وہ بھی ٹھیک کر دیا۔ خود ہی جا جا کر پشیرول لاتے رہتے ہیں جزیرہ۔ کبھی نہیں جتایا کہ میں تمہارے اتنے کام کرتا ہوں۔ اسلم کو میں نے اپنی کچھ شرٹس دینی چاہیں تو کہتا ہے ”بھائی جی! کسی ضرورت مند کو دے۔ میں تو اچھے خاصے رزق والا ہوں۔ اگر ایک بار لےنے والوں میں سے ہو گیا تو دینے والا کبھی بھی نہیں بن سکوں گا۔“ ماما! وہ دینے والا بننا چاہتا ہے بتائیے مجھے ماما! عظمت کی اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں۔“
مسز گوہر گود میں رکھے اس کے سر کو پیار سے سلالتی رہیں۔

”اس دن آپ اسٹور جانے لگیں۔ آپ اپنے کپڑے اور جوتے نکال کر رکھ گئیں۔ سامنے دیکھا کہ افق نے آپ کی جوتی کو کپڑے سے صاف کر دیا اور ویسے ہی واپس رکھ دی کہ آپ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس نے صاف کی۔ میں بچن کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی آپ کے جوتے تو کبھی میں نے بھی صاف نہیں کیے۔“

”مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ میرا بہت احترام کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں وہ ایسی ہی ہے۔“

”وہ جیسی بھی ہے۔ ایسے بنے بنائے تو پیدا نہیں ہوتے؟ ایسا تو خود کو بنانا پڑتا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کیا میں کچھ کچھ ان سب کے قریب کا ہو سکتا ہوں؟“

”میرا بیٹا بہت پیارا ہے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

فرزام نے کالج میں بی ایس سی کرنے کے لیے ایڈمیشن لے لیا۔ اس کے پاس اب اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ کالج جا سکے۔ آمدنی بھی اچھی ہو گئی تھی۔ کالج سے آکر وہ آرڈرز کے لیے چلا جاتا۔ دوسرا لڑکا ان آرڈرز کو سپلائی کر دیتا۔ باقی لوگوں سے مسزگو ہر فون پر رابطہ کر لیتیں یا خود چلی جاتیں۔ اب ان کے پاس چار کار میگر اور تین ماسٹر جی ہو گئے تھے۔ بہت سی بڑی دکانوں والے انہیں گھر کے آفس میں آکر مل لیتے تھے۔ وہیں سب حساب کتاب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے کپڑے کے بنے پاؤچ کا کام بھابھی کے سپرد تھا۔ یہ ان کے کپڑوں میں مفت کا آسٹم تھا جو انہوں نے شامل کیا تھا۔ اس آسٹم کے شامل کرنے سے ان کے کپڑوں کی مانگ میں اضافہ ہوا تھا۔ چھوٹی بچیوں کو ہینڈ بیگ اور پرس کا بہت شوق ہوتا ہے تو اس سے کپڑے کی فروخت میں واضح فرق آیا۔ کپڑے کے یہ پاؤچ کسی وقت میں افق اور بھابھی نے درجنوں کے حساب سے بنائے تھے۔ یہ پاؤچ دہنوں کے لیے بنوائے جاتے تھے۔ اس نے مسزگو ہر کو بچیوں کے لیے چھوٹے سائز میں بنانے کا مشورہ دیا جو انہیں اچھا لگا اور ان کا آئیڈیا

مقبول ہو گیا۔ یہ آئیڈیا فارن آرڈرز کے ساتھ لاپہ مقبول ہوا۔ انہیں تھم تپائی جاتی اور ایکسپسٹ پر بنوائے جاتے۔ ان کا یہ آسٹم ریڈی میڈ کپڑوں کے ساتھ مفت تھا۔ لیکن جب انہیں تھم تپائی جانے لگی تو اس کا معاوضہ بھی دیا جانے لگا۔ ان کی پسند کے عین مطابق۔

”یہ کام بننے کا وقت ہے۔“ مسزگو ہر بہت خوش تھیں۔

”کیا مطلب؟“

”انسان پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ گونا گویا چلا جاتا ہے۔ لاکھ کو شش پر بھی۔ اس وقت کے اثرات ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ سنور آچلا جاتا ہے۔ ہر بگڑی بات بننے لگتی ہے۔ تو یہ وقت کام بننے کا ہے ہمیں اور آئیڈیا ز پر کام کرنا چاہیے۔“

”مثلاً؟“ اس نے پوچھا۔

”تم بھی سوچو افق! کیا ہونا چاہیے۔“

”میں تو ایک عرصے سے سیل کا سوچ رہی ہوں۔“

”سیل کا۔“

”جی ہاں۔ ہم ایک ہی قیمت پر کپڑے تیار کرتے ہیں۔ منافع رکھ کر سیل لگاتے ہیں۔“

وہ سوچنے لگیں۔ ”اس کے لیے الگ سے تیار کرنی ہوگی۔ جگہ بھی ڈھونڈنی ہوگی۔ فرزام سے ملنا ہوں معلومات کرے۔ اگر کسی بڑے ایونٹ میں اسٹال مل جائیں تو بہت زبردست رہے گا۔ اس سے ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔“

”جی ہاں!“

”افق! پھر تم کچھ ڈیزائن ریڈی کرو۔ کچھ پرانے برٹ نکالو۔ ان میں تھوڑا بہت ایڈ کرو۔ دیکھتے ہیں ان کا کیا کیا بن سکتا ہے۔“

افق بڑی ڈیزائن بیک اٹھالائی۔ اس میں ان کے تیار کردہ ڈیزائن نمونے موجود تھے۔

فرزام کو سیل کے بارے میں بتا کر وہ سب اس کے لیے تیاری کرنے لگے۔ فرزام نے ایک اسٹال

افق میں بیک کر دیا۔ نمائش دس روزہ تھی اور اب انیسویں دن کے بعد معلوم ہونا تھا کہ انہیں کس قدر لٹاگ ریڈی رکھنا چاہیے۔ لیکن اس وقت وہ لٹاگ ریڈی کر نہیں سکتے تھے۔ اب وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اتنا کم ہو کہ انہیں منافع ہی نہ ہو اور اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ فروخت نہ ہونے کی صورت میں الٹا انہیں نقصان ہی ہو جائے۔

لیکن شاید مسزگو ہر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ وقت کام بننے کا ہے تو ان کا کام بن گیا۔ دس روز رات دن ان کے اسٹال پر رش رہا۔ ابتدائی چار دنوں میں ہی انہیں میٹرل کی قیمت وصول ہو گئی۔ اگلے دو دنوں کے منافع سے اسٹال کی بکنگ کے لیے ادا کیے گئے پیسے پورے ہو گئے اور باقی کے چار دن کا منافع ان کی جیب میں آیا۔ دس دنوں میں اسٹال کے لیے سب نے کام کیا۔ فرزام، اسلم، جمال سب سامان لائے۔ اسٹال کو ڈیکورٹ کرتے۔ مسزگو ہر بھی وہیں موجود رہتیں۔ اسلم اور فرزام نے سیلزمینی کی۔ افق گھر میں ہوتی اور قریب سے ہر دن کا سامان الگ کر کے پیک کرتی۔

سیل کامیاب ترین رہی۔ ساتھ انہوں نے مختلف بھی بانٹ دیے۔ جس میں ان کے فون نمبرز اور ایڈریس تھا۔ ایسے کپڑوں کی خریداری کے لیے ان کے پاس بھی رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ گاہے بگاہے عورتیں ان کے پاس خریداری کے لیے آجائیں۔ کچھ آرڈرز دے جاتیں۔ فون پر رابطہ رہتے۔ انہیں مستقل کلائنٹس مل گئے۔

مسزگو ہر نے کار میگوں کے بڑے کمرے میں اسے سیل کوارٹر۔

اپنے پہلا اسے سی تھا جو ان کے گھر لگا۔ فرزام کا خیال تھا کہ یہ کار میگوں کے کمرے میں ہی لگنا چاہیے۔ پہلے اس نے اپنا دوپہر کا کھانا گھر سے لاتے تھے۔ اب مسزگو ہر نے ایک کام والی رکھ لی تھی۔ اور یہ صفائی کرتی تھیں اور کار میگوں کے جانے کے بعد فرزام کے کمرے کا صفائی کرتا تھا۔ اب کام والی نیچے کی صفائی کرتی اور ان سب کے لیے دوپہر کا کھانا بھی پکاتی۔

سب کار میگر ماہر ہو چکے تھے۔ ایک بار بتانے سے ہی بات سمجھ جاتے۔ ان کے کام میں غلطیاں کم ہونے لگیں۔ اب ہر وقت ان کے سر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میٹرل کے لیے بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اسلم سب سمجھ گیا تھا۔ وہ اور فرزام جاتے اور میٹرل لے آتے۔ کبھی کبھی افق اور مسزگو ہر اسلم کو لے کر چلی جاتیں۔ آئے دن مارکیٹ میں نئی سے نئی چیز موجود ہوتی۔ وہ پھر وہیں طے کر لیتیں کہ کون سی نئی چیز شامل کرنی ہے اور کتنی۔ مسزگو ہر کے تیار کیے گئے ملبوسات میں ایک ہی بات تھی۔ جسے خاص پسند کیا جاتا تھا۔ وہ تھی نفاست۔ وہ بچیوں کے ملبوسات کو ان کی عمر کے مطابق ہی نہیں اور نازک سا تیار کرتی تھیں اور بقول ان کے ریکورڈسٹرز ان کے کپڑوں میں بچیاں بہت آرام محسوس کرتی ہیں۔ کپڑے سنبھالنے میں انہیں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔

”ایک بات بتائیے۔“

”جی ہاں۔“ وہ ذرا پریشان سی ہو گئی۔

”ماما کو آپ کے کام میں ڈھونڈنے سے بھی خالی نظر نہیں آتی۔ کتنی ہیں بہت خپلی ہے پر فیکشن کے لیے افق۔“

”جی ہاں۔“ اس جی سے اس کا مطلب تھا۔ ”تو اب کیا ہو گیا؟“

”لیکن یہاں کیا ہوا؟“ اس نے رجسٹر اس کے سامنے رکھا۔

رجسٹر سرخ گول دائروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ”لیٹر ڈائریٹر“ لکھ کر دکھایا تھا۔ مسلسل تین دن سے یہ لیٹر گول دائرے لے رہا تھا۔

”میں نے اتنی اچھی طرح سے یاد کیا تھا۔“ سر جھکا ہوا تھا۔ نظریں رجسٹر پر تھیں۔

”لی اے میں آپ انگلش کو یاد کریں گی؟“

”یہ مجھے نہیں آتی۔ تو پھر یاد ہی کرتی ہوں۔“

اس کے انداز پر ایک جان دار قہقہہ اس کے اندر ہی دم

در اصل اب وہ صرف بی اے پاس کرنا چاہتی تھی۔
ایک ڈگری چاہیے تھی۔ پہلے کبھی وہ کتابوں کو
نہ لیا کرتی تھی۔ اب اس کی ساری دلچسپی صرف اور
اپنے کام کے ساتھ تھی۔ وہ کام سے نہیں جھکتی

اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور وہ کیا کرتی۔ نہیں
رنا بھی چاہتی تھی تو بھی ہاں کہنا پڑا۔ اس کی گرامر
روح ہو گئی۔ ہر لائن پر کراس لگنے لگے۔
”آپ نے پریکٹس نہیں کی تھی؟“

کھینچنے اور محنت کرنے سے سب کچھ آجاتا ہے۔
 سے گرا کر کرنے میں مزا آنے لگا۔ روز رات کو وہ وہ
 مال و نفقات لکھ کر ہی سوتی۔ غلطیاں ہوتی رہیں۔
 کا درستی بھی ہوتی رہی۔ وہ ایک آدھ لائن اپنے
 غلط میں لکھنے لگی۔ نیند اسے ویسے ہی نہیں آتی
 سلطان بھر کے کام سے تھک جاتی تھی۔ لیکن آرام
 میں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی تعمیر کو مکمل اور مضبوط کرنا

”کیسی بلائف؟“
 ”کوئی بھی۔“ یہ کہتے ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔
 ”میرے ساتھ چلی جائیں گی، پھر سب کچھ چھوڑ

”تم سے زیادہ کچھ بھی قیمتی نہیں۔ میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی۔“

”میں آپ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

”تم کہاں جانا چاہ رہے تھے؟“

”مرکا ایلانی کر دیا ہے۔ آن لائن کچھ ٹیسٹ بھی دیے ہیں۔ امید ہے باق اسکا ریشپ مل جائے گا۔“

”بہت براٹھ چالس ہے۔ تمہیں مس نہیں کرنا چاہیے۔“

”آپ ایستھا کی مریض ہیں۔“

”میں خود کو سنبھال سکتی ہوں۔“

”ہر بار میں آپ کو ان ہیملڈ ڈھونڈ کر دیتا ہوں۔“

”آپ میں یاد رکھنا شروع کر دیں گی۔“

اس بات کے بعد دونوں کافی دیر تک خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

”میں اتنی سے شادی کر لوں؟“

مسز گوہر نے اچھے سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کو ٹھیک نہیں لگی میری بات؟“ ان کے ایسے دیکھنے پر وہ تھرا گیا۔ ”ارے نہیں ملا! میرا کوئی چکر

وکر نہیں ہے اس کے ساتھ۔“

”محبت کرتے ہو اس سے یا تمہیں بھی بہت خوب صورت لگتی ہے؟“

”محبت کیسے کروں؟ محبت سے تو بہت نفرت ہے مجھے۔ وہ آپ کے ساتھ رہے گی۔ آپ کا خیال رکھے گی۔ آپ کا بہت احترام کرتی ہے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔ کم از کم بھابھی کی طرح کسی تکلیف کا باعث نہیں بنے گی۔“

”محبت کر رہے ہو اسے؟“ مسز گوہر کو بیٹھنے کی یہ بات بری لگی۔

”آپ تو مجھے غلط ہی سمجھے جا رہی ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں میں بھی

خوبیاں دیکھو۔ پھر انہیں اپنے قریب آنے دو اور یہ کہ خود کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔ ملا! میں ایک ہی لڑکی کو جانتا

ہوں۔ اتفاق کو۔ وہ ڈھانکی سال سے ہمارے پاس کر رہی ہے۔ سارا دن بیٹھ رہتی ہے۔ جن لوگوں کا میں اکیڈمی میں استاد ہوں۔ وہ تک مجھے چلی بھرے سے باز نہیں آتیں۔ آتے جاتے کنی مار دیتا ہوں۔ کلچ کی جو لڑکیاں میری دوست ہیں۔ وہ صرف دوست رہنا نہیں چاہتیں۔ رات رات بھر مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ان سب حالات کو دیکھ کر مجھے تو لگتا تھا کہ میں تو کلی ٹائم ہسٹ بوائے ہوں۔ بہت خاص محبت ہم ہوں۔ لیکن اتفاق کے لیے میں میڈم کا بیٹا ہوں اور جب اسے پڑھانا ہوں تو صرف استاد ہوں۔ تو یہ غلطی شرافت بہت بڑی چیز ہے۔ کیا خیال ہے آپ؟“

سر ہلا کر صرف اسے دیکھا۔ یعنی اس کی بات سے اتفاق ہے۔

”میرا خیال ہے زیادہ خوبوں اور کم نقصان والے لوگ اچھے سے دوست بن کر اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ میرے کمرے کے ایک کونے میں رومی کی وی

چیزیں ترتیب سے رکھی تو آپ نے دیکھی ہی ہوں گی۔ یہ چیزیں مجھے ہر روز بتاتی ہیں کہ کوئی محبت کرنے والا نہیں ملے۔ لیکن قدر کرنے والا ضرور ڈھونڈ لینا چاہیے۔

محبت کرے نہ کرے ساتھ ضرور رہے۔ ملا! میں زندگی میں بڑی تباہی سے بہت ڈرتا ہوں۔ اب میں فضا

پر آجانے سے نہیں ڈرتا۔ اپنی زندگی میں موجود کسی شخص کے غلط نکل آنے سے ڈرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو

میری میرے لیے بڑی تباہی ہوگی۔ رومی کو میں چاہتا ہوں ضرور سنا آیا تھا۔ لیکن بہت عرصے تک اسی کے

چھپ چھپ کر رونا رہا ہوں۔ اس نے محبت نہیں کی۔ لیکن میں نے کی تھی۔ اگر وہ ایک بار مجھے

کر لے تو میں بھاگا جاؤں اس کے پاس۔ میں اسے معاف کر دوں گا۔ اگر محبت میں بھی معاف نہ کیا جائے

تو کس جذبے میں کیا جائے؟ لیکن میں جانتا ہوں۔ اگر میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کی منت بھی کی تو بھی وہ

ماننے کی۔ اسے اس نقشے سے بہت محبت ہے جو اس نے خود اپنی زندگی کے لیے بنایا ہے۔ وہ اس نقشے میں

تبدیلی نہیں کرے گی۔ ایک بار میں اس سے مل

ہو گیا۔ دوبارہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی میں غلط لوگ نہیں چاہئیں۔ اگر یہ لالچ ہے تو ہاں! مجھے اچھے لوگ چاہیے ہیں۔ صرف اچھے۔“

مسز گوہر اپنے بیٹے کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھیں اور یہ جان کر انہیں بہت دکھ ہوا کہ ان کے بیٹے کے اندر ایک اور ہی سفر جاری ہے۔ وہ بہت گمراہ ہو گیا

چھپ۔“ اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں کہ بات کہیں سے شروع کریں۔ پھر توقف سے پوچھیں۔ ”بہت مختلف لڑکی ہے فرزام! میں اس میں نقص نہیں نکال رہی۔ لیکن وہ مجھے بہت زیادہ مشین اور ٹھوڑی سی

انہیں لگتی ہے۔ کبھی تم نے اسے ہنسنے دیکھا؟ میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس میں لڑکیوں والی کوئی بات ہی

نہیں ہے۔ اس کی مدد جو اس کے کپڑے لاتی ہیں وہ انہیں استعمال ہی نہیں کرتی۔ میں نے پوچھا تو اس نے

کہا۔ اسے نئی چیزیں اچھی ہی نہیں لگتیں۔ اس کی مدد نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ صرف ایک وقت کا کھانا

کھاتی ہے۔ رات میں بمشکل دو گھنٹے سوتی ہے۔ میرے پونچنے پر اس نے بتا دیا کہ نہ اسے بھوک لگتی

ہے نہ ہی نیند آتی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی، لیکن وہ خاموش رہی۔ کبھی کبھی منہ چھپا کر اپنی آنکھیں صاف

کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی لو اسے پہلی بار ملنے والا ہی جاچ لیتا ہے۔ وہ ہنستی نہیں بولتی نہیں۔

کسی خواہش، کسی خواب کا ذکر نہیں کرتی۔ بس تم اس کے آگے کام کا ڈھیر لگا دو۔ وہ سر جھکائے کرتی رہے گی۔

جیسے کاموں میں خود کو چھپا رہی ہو، دفتری ہو۔ مجھے وہ بہت پاری ہے۔ لیکن فرزام! تم ایسی مدد دے لڑکی

سے ملو کہ لوگ؟ ٹھیک ہے۔ تم محبت کا ذکر نہیں کر رہے۔ جانی کا کر رہے ہو۔ ایسی خاموشیاں بھی

جانی بن جایا کرتی ہیں۔ جب میں اس کی عمر میں تھی تو مجھے اس سے زیادہ مسائل تھے۔ میرا گھر اس کے گھر

سے زیادہ چھوٹا تھا۔ میں اس سے زیادہ غریب تھی۔ لیکن زندگی سے میرا ناٹوٹا نہیں تھا۔ زندگی سے ملنے

اس وقت ٹوٹے ہیں جب اندر کوئی تباہی بہا ہو۔ کوئی

بھرم، کوئی خواب ٹوٹ چکا ہو۔ یہ سب اس کی مدد کی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ حالات کے بدترین ہو جانے کی وجہ سے بھی۔ شاید ہی وہ اپنے آپ سے باہر نکل سکے۔ اگر وہ تمہاری اچھی دوست بن کر زندگی گزار سکتی ہے تو مجھے اس کی ساس بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

یہ سب باتیں جو فرزام کی ماں اسے کہہ رہی تھیں۔ ان باتوں پر اس نے غور نہیں کیا تھا اور یہ کوئی ایسی بری باتیں بھی نہیں تھیں۔ حساسیت تھی ان میں

اور یہ حساسیت اتفاق میں پائی جاتی تھی۔ ان سب پر سوچا جاسکتا تھا۔ بات کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس بنا پر اسے مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ ایک بار اتفاق سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بات کیسے کرنا؟ جہاں وہ کام کرتی تھی وہاں اتنے لوگ تھے۔

باہر اس کے ساتھ وہ جائے کی نہیں۔ بلکہ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ اس سے باہر جانے کا کہہ سکے۔

بہانے سے وہ اسے لے کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اسے یہ کہتی اچھی نہیں لگتی تھیں کہ ”اتفاق! جاؤ ذرا فرزام

کے ساتھ جائے پی او“ یا ”وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

اسی عالم میں چند دن گزر گئے۔ اتفاق سے اتوار کو شام کے وقت ایک فضا تھ پر اسے وہ کھڑی نظر آئی۔

وہ جھک کر کچھ میگزینز دیکھ رہی تھی۔ اتوار کو اکثر فرزام پرانی انارکلی جا کر پرانی کتابوں کی چھانٹی بہت دل لگا کر

گرتا تھا اور بہت اعلیٰ درجے کی کتابیں چھانٹ کر لے آتا تھا۔ وہ کافی دیر سے ایک ایک اسٹل پر کتابوں کی

ورق گردانی کر رہا تھا۔ ذرا دور اسے وہ بھی نظر آئی۔ وہ جلدی جلدی سب ہی میگزینز دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے خاص چیز کی تلاش ہو۔ وہ اس کے قریب گیا اور

سلام کیا۔ ”کچھ خاص ڈھونڈ رہی ہیں؟“ اس کے ہاتھ میں

فیشن میگزینز تھے۔ اتفاق نے انہیں سر ہلا دیا۔ ”میں مدد کروں؟“

”مجھے مل گیا ہے میگزین۔“ وہ جو میگزین دیکھ رہی

تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کیا اور کتب فروش کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شاپر میں ڈال دیا۔

فرزام نے میسج دے دیے۔

”آپ نے کیوں دیے؟“ وہ اس سے زیادہ الفاظ میں احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی لیکن اتنی کہ۔

”آپ ماما کے ہی کام کے لیے لے رہی ہیں نا۔ تو ماما کے بیٹے کو الٹی کر دی۔“

وہ خاموش رہی۔ احتجاج ابھی تک آنکھوں میں رقم تھا۔ خدا حافظ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

”ذرا میری بات سننے پلیز۔“ جتنی تیزی سے وہ آگے نکلی۔ اتنی ہی تیزی سے وہ پیچھے آیا۔ وہ رک کر دیکھنے لگی پوچھا نہیں کہ کیا بات ہے۔

”یہ اس طرف۔“ اس نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا۔ ”ریگل کے پاس ایک بہت اچھائی کارنر ہے۔ آپ چلیں گی میرے ساتھ وہاں؟“ اتنا کہہ کر وہ ابھی رہا تھا کہ وہ میڈم کے بیٹے کے یہ پوچھنے پر اسے لفظ سمجھ کر پھرتی نہ مار دے۔

وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ بھی جھلکنے لگا آنکھوں سے۔

”نہیں؟ خود ہی کہہ دیا۔“ چلیں! وہاں نہیں تو یہ چند قدم پر سڑک پار کر کے بہت سے لوگوں کی پسندیدہ جگہ عجائب گھر ہے۔ میں ابھی آتے آتے دیکھ رہا تھا کہ اس کا بلغ بہت اچھا ہے صاف ستھرا ہر ابھرا۔“

اس کے رد عمل کا سوچ کر وہ گھبرا رہا تھا۔ چادر کا کونا دائیں کان سے دائیں میں لیے میگزین کو اسٹڈی فائل کی طرح ہاتھ میں۔ پکڑے وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شرابے نکل رہے تھے۔ ان شرابوں میں اسے دکھ بھی نظر آیا۔ جیسے اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح اس کے ساتھ یہی کرے گا۔ لہجوں میں ہی ماحول بدل گیا تھا۔ وہ اسے بہت نفرت سے گھور رہی تھی اور ایسے کھڑی تھی۔ جیسے اور انتظار میں ہو کہ دکھاؤ اپنی اوقات۔ کہاں تک جاتے ہو تم؟ نکلے ماتم

بھی وہی؟

”میرا یہ مطلب نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“ اس کے تاثرات بڑھ کر اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”میں آپ کا استاد بھی ہوں۔ آپ کو پڑھانا ہے میں نے۔“ اس کا یہ کہنے سے مقصد احسان جتنا نہیں تھا۔ اس سے اس کا مطلب اپنی شرافت جتنا تھا۔

”تو اب آپ معروضہ لینے آئے ہیں؟“ اس کے انداز نے بتا دیا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔ لہجوں میں ہی سالوں کا تاثر بدل چکا تھا۔ اس کی شرافت پر شک کیا جا رہا تھا۔ بات بگڑ چکی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ غصے میں اگلے آئے ہی نا۔ اور یہ بھی کہ وہ اس کی کوئی وضاحت نہ سنے۔ انکار ہی سہی وہ کر دے۔ لیکن وہ اسے بد معاش لفظ نہ سمجھے۔ فرزام کے مسام بھیک گئے۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ کیا سے کیا بن گیا اس کے لیے۔

اسے گھور کر وہ پلٹی اور دو قدم اپنے راستے کی سمت اور اس سے مخالف سمت میں بڑھی۔ اس نے صرف تھوڑی نہیں مارا تھا میڈم کے بیٹے کو باقی نظروں سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

دو سے چار اور چار سے آٹھ قدم چلتے اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ سچ راہ میں اس کی بے عزتی کی گئی ہے۔ پھر اسے اسے صرف لڑکی سمجھا گیا ہے۔ پھر اس کی خوب صورتی پر نظریں پڑیں اور مردوں کا کام ہی کیا ہے۔ موقع ملے ہی موقع کا فائدہ اٹھاتا۔

فرزام کی نظریں جو دور جاتی افق پر تھیں۔ صاف صاف دیکھ رہی تھیں کہ وہ دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔ اس نے اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کیا۔ جو افق کو سمجھتا تھا وہ سمجھ لیا۔ لیکن اس نے اسے پورا سنا نہیں۔ بھیڑ میں تیزی سے جگہ بنائی وہ جاری تھی۔ فرزام کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ایسے ہو چکے گا۔ لیکن اگر اب یہ ایسے ہی تھا تو وہ ایسے ہی نہیں چھوڑے گا۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ تو اسے اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جگہ بنا تاخیری سے اس کے پیچھے جانے لگا اور تقریباً ”بھاگتے ہوئے“ ایک سائیکل والے کی ٹکر سے بچتے ہوئے وہ اس کے پیچھے سے بھاگتا

اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں افق!“ اس نے فوراً کہہ دیا۔ بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ مطلب تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ میں غلط نہیں کر رہا۔ تمہارا استعمال نہیں کر رہا۔ وقت گزاری نہیں چاہیے۔ ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ اس نظر والا بھی نہیں ہوں۔ مجھے ویسا تو نہ سمجھو۔

قریب سے ایک موٹر سائیکل پول پول کرتی گزری۔ پرانی انارکلی کی اتوار بازار کی بھیڑ بھاٹ میں۔ اسٹاپوں پر ”باجی“ ”تپا“ خالہ“ کی آوازوں میں۔ ٹریفک کے شور میں۔ جھوم کی جھنکاہٹ میں افق کو یہ آواز بہت بری لگی۔ ”شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

افق نے اس کی طرف ایسے دیکھا۔ جیسے دراصل وہ اسے بتا رہا ہو کہ ”تمہارے پیروں کے نیچے کی زمین پھٹ رہی ہے۔ دیکھو دیکھو! تم نیچے چھو جھنکی جا رہی ہو۔ یہ زمین نہیں نکل لے گی۔“

”ماما نے کہا کہ میں پہلے تم سے بات کر لوں۔“

اس نے لفظ ”ماما“ کو سہارا لیا۔ تاکہ وہ یقین کر لے کہ اس سب کاموں کو بھی معلوم ہے اور وہ اسے الو نہیں بتا رہا۔

”میں تو صرف بات کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد غلط نہیں تھا۔“

وہ جلدی جلدی ہٹانے لگا کہ مبادا وہ پھر بھاگ ہی نہ جائے۔ ایک آوی فرزام سے ٹکرایا اور فرزام ذرا سا لڑکھ کر سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔ لیکن افق ٹائی بت دیکھ کر کھڑا رہا۔ جیسے کچھ سن نہیں رہی اور اس کے سامنے کوئی اپنے بولنے کا شوق پورا کر رہا ہے۔ جیسے وہ دکان کے باہر زنانہ ریڈی میڈ کپڑے پنے پلاسٹک کی مورت کھڑی ہے۔ جس کا تعلق بازار سے تو ہے لیکن ننگی سے نہیں۔

”افق!“ فرزام کو اسے آواز دینی پڑی۔ وہ دونوں کٹے سامنے رش میں اور کتنی دیر کھڑے رہ سکتے تھے۔ وہ چوگی۔ اور فرزام کی طرف دیکھ کر بغیر جلدی سے

ڈبلی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ نیلے گتہ کی طرف جانے والی سڑک پر واقعی اس کے پیروں تلے کی زمین پھٹ رہی تھی اور وہ دھنستی ہی جا رہی تھی۔ آخر وہ گھٹس کیوں رہی ہے؟ پاتال میں کیوں جا رہی ہے؟ اسے کون نیچے ہی نیچے کھینچ رہا ہے؟ امان سے تو وہ نفرت کرتی تھی۔ ہے نا؟ پھر فرزام جیسے لڑکے کے منہ سے شادی کا سن کر وہ پاتال کی طرف کیوں جا رہی ہے؟

چال میں تیزی آگئی۔ نیلے گتہ کی طرف تھوڑا اور فاصلے طے ہوا۔ ذرا اور آگے ایک اور سڑک تک۔ امان نامی دلدل نے ایک بار نکل تو لیا تھا اس کے ہاتھوں اپنی عزت تار تار کر دیا تو چکی تھی۔ اب وہ کیوں اسی شخص کے نام پر اندر دھنستی جا رہی ہے؟ شادی کے نام پر اسے کیا یاد آگیا ہے؟ اب وہ کیا کچھ اور برباد کرے گا۔ وہ پسینے میں بھیک لٹی اسے لگا۔ امان کا باپ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ آگے بھی وہی ہے۔ دائیں بائیں بھی وہی ہے۔ اس نے اپنے اندر کی چیخ کو بمشکل روک لگا۔

اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے امان نام کی دھڑکن کو اپنے دل کے اندر سے سرے سے دھڑکتے سنا اور وہ ڈر گئی۔ اگر پھر اس دل نے اسی کے نام پر دھڑکنا شروع کر دیا تو۔ تو امان پھر سے جیت جائے گا۔ وہ اسے دھوکا دینے اس کے اندر پھر سے آگیا تھا۔ اس بار وہ یہ دھوکا نہیں کھائے گی۔ اپنے گھر کی گلی کے سرے پر وہ رک گئی۔

دائیں پلٹی تو دس قدم کے فاصلے پر فرزام کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ جس حالت میں وہ تیزی سے اس کے پاس سے نکلی تھی اس کا سوچ کر فرزام اس کے پیچھے گھرتا تھا۔ وہ چلتی اس کے قریب آئی اور آگے ہو کر چلنے لگی۔ وہ پیچھے آئے لگا۔ سڑک پار کر کے وہ عجائب گھر کے ہرے بھرے بلغ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ دوبارہ اس نے فرزام کی طرف نہیں دیکھا۔ دراصل وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ جو سڑک اس کے اندر سالوں پہلے شادی کے نام پر بجے تھے۔ اب وہی سڑک نام

پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب ہے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 مارک مفت

قیمت - 300/- روپے
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذر بچہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دلوں میں بیٹے اور ان کی ہونے والی ہونے کتنی محنت
کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کا بیٹا ان کے برے
وقت میں جسے دار نہیں بناتا تو انھیں میں بننا بھی پسند
نہیں کرے گا۔

احمر اپنی ماما سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ وہاں کیسے اور
کہاں رہ رہی ہیں۔ پوچھنے کا مطلب تھا پھر امداد بھی
کرنا اور ابھی ابھی انہوں نے بلڈنگ کا گھر چھوڑ کر ایک
ویل اسٹوری گھر لیا تھا۔ اب وہ لیڈ زمین کسی کو جواب
دہی نہیں تھا کہ تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے
اتنا بڑا گھر لینے کے لیے اور نئے ماڈل کی کار خریدنے کے لیے
لی؟ نئے سال کی چھٹیوں میں تم یورپ کیسے گھوم
آئے؟ اب وہ وہاں کھل کر پر آسائش زندگی گزار رہا
تھا۔

اس کا انگریز نمائندہ سیکنڈ ہینڈ بائیک چلاتا رہا تھا۔
بل اٹھارہ اٹھارہ کھٹے کھڑی ہو کر تنگ کرتی رہی تھی۔
لیکن جو بھی تھا۔ وہ مسز کو ہر اور فرزام کے لیے بہت
اچھا تھا۔ وہ ایک پر آسائش زندگی نہیں گزار رہے
تھے۔ لیکن وہ کمینے اور عاصب نہیں بنے تھے۔ تو ایسی
آسائشوں سے محنت اور خواری بھلی۔ چیزوں کی تعداد
میں کمی ہو جانی چاہیے۔ خزیوں کی نہیں۔ نیکی کی
تلقین ملے نہ ملے۔ گناہ سے دوری کی ضرورت
چاہیے۔

مسز کو ہر کو اتنا شوق ضرور تھا کہ احمر اپنے بھائی کی
شادی میں آجائے کہ سے کم کوئی ایک تو دوسرے کی
شادی میں شرکت کرے۔ لیکن تانیہ کے ہوتے وہ
نہیں آئے گا۔

جننے کے دن وہ سیر کے وقت بند گلی کے ہرے رنگ
کے دروازے کے گھر میں فرزام اپنی چھوٹی سی بارات
لے کر آتا۔ اس نے ڈیرانٹو سفید شلوار سوٹ پہنا
تھا۔ بلکے سرخ دپٹے کو جو دو لہما کے لیے ہوتے ہیں
گلے میں ایک بل دے کر ایک سرا پیچھے اور ایک آگے
رکھا تھا۔ اتنی سی ہی تیاری میں وہ شہزادہ لگ رہا تھا جو
تیمپری کی کلی کو لینے کے لیے آیا تھا۔ باراتیوں میں سب
عی کار گیر اور استقبال کرنے والوں میں افق کے چچا

اٹھنے کے لیے پر تولتی افق نے اس کی طرف دیکھ کر
”اس نقصان پر انہیں افسرہ ہونا چاہیے ہمیں نہیں
افق۔“ وہ مسکرایا۔ افق بیٹھ گئی۔

فرزام نے اسے رومی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ
لوگوں نے وہاں بیٹھے بیٹھے خود کو بیان کر دیا۔ افق کو اب
زندگی میں کسی مرد کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے تو خود
کو اہل سے بچانا تھا وہ اس جیسے شخص کے لیے جوگ
لینا نہیں چاہتی تھی۔

فرزام اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامی کرنے
سے ڈرتا تھا جو آئیں اور پھر اسے چھوڑ جائیں اور وہ
ٹوٹ جائے۔ وہ دلوں کی الجھن اپنے اپنے اندر رکھ لے
کے خاتمے کے لیے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے
تھے۔

ان دونوں میں ”محبت“ نامی احساس کہیں بھی
نہیں تھا۔

مسز کو ہر افق کے گھر جا کر اس کا ہاتھ مانگ آئی۔
جسے فوراً قبول کر لیا گیا۔ جمل اور اسد کی خوشی کا
نہیں تھا۔ انہیں اتنا پیارا ”بھائی جان“ مل رہا تھا۔
یہ پیایا کہ فرزام کے جانے سے پہلے نکاح کر دیا جائے گا۔
فرزام کے کاغذات میں ٹھوڑی سی سی سی کی بیٹی وہ
گئی تھی۔ جن کے لیے وہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ یہ طالب علم
کی طرف سے جو اس کا ویرا منسوخ کیا گیا تھا۔ اس نے
سے اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر حال اب
تو وہ ہر طرح کی اور ہر مقام پر اچانک سے مل جائے گا
مشکلات کا عادی ہو چکا تھا۔

کبھی کبھار ہی مسز کو ہر کی احمر سے بات ہو جاتی
تھی۔ انہوں نے اسے فرزام کے نکاح میں شرکت کی
دعوت دی۔ اتنے پیسے لگا کر وہ صرف نکاح میں شرکت
نہیں کر سکتا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہ پیسوں کا نقصان
سے نہ کر لیا جائے اس نے بہانے سے انکار کر دیا۔
مسز کو ہر نے کبھی اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا
کاروبار کتنا اچھا چلنے لگا ہے اور اس کا دوبارہ کے لیے

کر رہے تھے۔ افق اس ماتم کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ
اس شخص کے لیے یہ ماتم اور کرنے کے لیے تیار نہیں
تھی۔ اگر وہ یہ ماتم کرے گی تو وہ نئے سرے سے اس پر
جان دینے لگے گی۔

المن عدن نامی لڑکے کے بارے میں افق فرزام کو
بتانے لگی۔ اس کے باپ کا اس کی عزت پر حملے کو
چھوڑ کر اس نے ان سے ملاقات کے متعلق بھی بتا
دیا۔

جب اس نے بات ختم کر لی تو اس نے خاموشی
سادہ لی کہ کیا اب بھی یہ فرزام نامی لڑکا اس سے شادی
کرنا چاہتا ہے۔ سست در سست فرزام بھی خاموش رہا۔
”لانا نے ٹھیک کہا تھا کہ افق کے اندر بہت کچھ ٹوٹ
چکا ہے۔“

اس نے اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔ افق کو جیسے
جواب مل گیا کہ وہ اسے انکار کر رہا ہے۔ جس طرح
اسے اس کے پروپوز کرنے پر خوشی نہیں تھی۔ ایسے
ہی انکار پر بھی دگھ نہیں تھا۔ اسے عدن کا خوف تھا کہ وہ
پھر نہ اس کے اندر تن لے۔ اس کا خیال پھر نہ اسے
آئے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اتنی بڑی بات سن کر
وہ اس سے شادی کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک سی
دے گا۔

”تم جیسی لڑکی کو کوئی بھی آسانی سے بے وقوف بنا
سکتا ہے۔“

اس کی اگلی بات سن کر وہ زمین میں گر گئی۔ اب
اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے
اسے یہ سب بتا کر اس کے بعد وہ دوسرا شخص ہے
جسے اس نے اس بارے میں معلوم ہونے دیا۔ یہ بات
اس نے اپنے اندر راز کی طرح نہیں ایک گناہ کی طرح
چھپا کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے گناہ کا خود ہی پردہ چاک
کر دیا۔ اب یہ اس کا مذاق اڑائے گا۔ وہ جوں سے سمجھ
رہا تھا۔ اس کے الٹ سمجھے گا۔ وہ اٹھنے لگی۔

”جو چھوڑ جاتے ہیں وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔“

اکتوبر 2013 اہلہ شعلہ 2013 اکتوبر 2013

سکھ چکے تھے۔ کامیابی کے راستے خدا کے ہاتھ میں۔
لیکن ان سب نے اپنی اپنی سیڑھیاں بنالی تھیں۔

رات گئے وہ اس کی پینٹنگ کر رہی تھی۔ اس گھر کی
ایک ہی رونق تھی 'فرزام'۔ اور وہ جا رہا تھا۔ چلنے
سے پہلے وہ سب کو کرائے کی کار میں خوب گھما تارہا۔
جمل اور اسد نے زندگی میں تفریح نام کی چیز نہیں
دیکھی تھی۔ اب وہ ہر وقت فرزام کے ساتھ چپکے
رہتے۔

جمل تو اب گھر ہی میں ہوتا تھا۔ رات کو ہی پریس
جاتا تھا، لیکن اسد اسکول سے آنے کے بعد فرزام کے
ساتھ ساتھ رہتا۔ جتنی بار بھی وہ خریداری کرنے کے
لیے گیا اسد اس کے ساتھ ہی رہا۔ اکثر تینوں بال پر
چمل قادی کرتے۔ بھنے ہوئے چنے کھاتے۔ آکس
کریم گولے گولے کئے۔ اور نہیں تو فرزام ان کے
ساتھ شرط باندھ کر دوڑ لگانے لگتا۔

اس کا معمول تھا، مسز گوہر کے ساتھ پھنسی والے

نے اس کا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایڈمیشن
کرا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ زیلو راسٹری کرے۔ افق کا
منا تھا کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح یونیورسٹی
جا کر اس کا بہت وقت صرف ہو گا۔ لیکن فرزام کا کہنا تھا
کہ وہ اپنی زندگی میں کام سے نکل کر اپنے لیے بھی کچھ
کرسے۔

کلاسز شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ فرزام کے
چلنے سے پہلے ایک اور پیش رفت ہوئی۔ جس نے
ان کی زندگی میں تھوڑی اور تبدیلی کر دی۔ افق کی اماں
کا گھر ایک بند گلی میں تھا۔ اس گلی کے دونوں گھر ایک
ایلی مارکیٹ بنانے کے لیے خریدنا چاہتی تھی۔ اس
گلی کے سرے پر سڑک تھی اور اس سڑک پر بہت سی
دکانیں تھیں۔ جو پارٹی وہ جگہ یعنی چاہتی تھی اسے
راتوں رات ہی جگہ چاہیے تھی۔ اسی لیے انہیں
اچھی خاصی قیمت کی پیش کش کی جا رہی تھی۔ رقم اتنی
اچھی تھی کہ انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باہمی
مشاورت سے یہ طے پایا کہ افق کا خاندان فی الحال مسز
گوہر کے گھر میں رہے گا۔ آئندہ کے لیے کچھ بھی
پلان کیا جاسکتا تھا۔

دونوں گھر یک گئے۔ بھابھی مرکزی شہر سے دور چار
مہلے کے گھر میں چلی گئیں۔ افق کا گھر اندر مسز گوہر
کے گھر میں آگیا۔ جس ہال نما کمرے میں سلن پیک
کر کے رکھا جاتا تھا۔ وہاں لکڑی سے پارٹیشن کروالیا
گیا۔ ان کے پچھلے کمرے سے بڑا اور کھلا کمرہ بن گیا۔
فرزام نے ایک بیڈ لاکر وہاں سیٹ کر دیا۔ آرڈر لینے اور
پلاٹی کرنے کی ذمہ داری جمل نے سنبھال لی۔ فرزام
کی موٹر بائیک اسے دے دی گئی۔

گھر بننے سے جو رقم وصول ہوئی تھی اسے افق نے
متر کو ہر کے حوالے کیا۔ وہ اسے بزنس میں لگانا چاہتی
گی۔ دونوں پارٹنرز کی طرز پر برابر آگئے۔ اب وہ ایک
خاندان بن گئے تھے۔ انہیں مل کر محنت کرنی تھی۔
سائل کا حل مل کر نکالنا تھا۔ وسائل اور کامیابی کے
لے مل کر جدوجہد کرنی تھی۔ وہ سب جدا جدا تھے۔
لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ لفظ "محنت" کو

کروانے سے کوئی زندگی سے نہیں چلا جا سکتا۔
دھکے لگاتا ہے۔ دل والوں کو نکالنے کے لیے وقت
آنے پر ان دو عکلوں کا بھانڈا پھوٹ ہی جاتا ہے۔
اس نے افق کو دیکھا دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے
وہ تازہ تازہ پینٹ سے بنائی گئی دیوئی لگ رہی تھی۔ اس
کا چہرہ اسی دیوئی جیسا لگ رہا تھا جسے حوطہ کر کے کمبوت
میں بند کر دیا گیا ہو۔ تازہ تازہ وہ دو پر صدیوں پرانا چہرہ
چند گھنٹوں کی بولسن کا صدیوں سے ناتا۔
"آکس کریم کھاؤ گی؟"

"جی! کھالوں گی۔" آواز اتنی دھیمی تھی کہ بھابھی
فرزام نے سنا۔

"میرا خیال تھا کہ تم کوئی۔ میرا کھانے سے ہی
پیٹ بھر گیا۔" وہ ہنسنا لگا۔ وہ بھی ہنسے۔

"پھر میں نہیں کھاتی۔" وہ ہنسی نہیں۔ سنجیدہ ہی
رہی۔ وہ اس کے مذاق کو سمجھی ہی نہیں۔

"جب تک تم میں حس مزاج آئے گی۔ میری حس
مزاج مرچکی ہو گی۔ میں تو تمہیں ایک دو لطفی سنانے
جا رہا تھا۔ لیکن مجھے تو تمہیں لطفی سمجھانے بھی پڑیں
گئے۔"

وہ جب رہی۔ ہولے سے کبھی کبھی گود میں رکھے
ہاتھوں کو جھینش دے دیتی۔ ایسے سمٹ کر بیٹھی تھی
جیسے بہت خوف زدہ ہو۔ بہت برے وقت پر اسے
آ رہا تھا وہ۔ دوسری بار کسی کے ساتھ کار کی فرنٹ سیٹ پر
پر بیٹھی تھی۔ پہلی بار کا بیٹھنا یاد آ رہا تھا۔

دونوں میں خاموشی رہی۔ بنا کے دونوں ہی
گئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رشتے کو کتنے
اس رشتے کو نبھانے دوست بن کر ہی سہی نہایت
ساتھ خوشی خوشی زندگی گزارنے میں انہیں وقت ملے
گا۔

فرزام کے پاس چند ہفتے ہی تھے۔ اس کا دیر پا بچا
تھا۔ وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ افق نے اچھے بھولے
سے بی اسے پاس کر لیا تھا۔ اسے ساتھ لے جا کر اپنی

باسوں بھابھی اور چند اور لوگ شامل تھے۔ چیز کے نام
پر دعائیں تھیں اور بری کے نام پر فرزام سامرو۔
افق رخصت ہو کر فرزام کے گھر آگئی۔ فرزام نے
ماں کو افق کے بارے میں اس کی جانی کوئی بات نہیں
بتائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اب بس ان دونوں کا
آپس کا مسئلہ ہے کہ وہ کیسے ایک دوسرے کو ماضی کی
تکلیفوں سے نکالتے ہیں۔

افق نے مسز گوہر کا لایا سرخ رنگ کا شرابہ پستانا تھا
اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی
خوب صورتی ایک طرف اور اس کا دھواں دھواں ہونا
دوپ ایک طرف۔ خود کو مارل رکھنے کے باوجود وہ
وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھی۔ جیسے ابھی سب چھوڑ
چھاڑ بھاگ جائے گی۔

مسز گوہر دونوں کی تصویریں بنا رہی تھیں۔ فرزام کی
دلہن کے لیے انہوں نے تھوڑے سے زیورات
بنائے تھے۔ وہ انہوں نے پہلے ہی افق کو دے دیے
تھے۔ افق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ کافی دیر تک
اس سے باتیں کرتی رہیں۔

نکاح دوپہر کے وقت ہوا تھا اور شام تک افق گھر
آگئی۔ رات کو ان تین لوگوں نے فائو اسٹار ہوٹل میں
ڈنر کیا۔ ماں کو گھر ڈراپ کر کے وہ ایسے ہی تھوڑی سی
ڈرائیو کے لیے کار اوڑھو اور گھما تارہا۔ اب ایسا تھا کہ
انسان بہت سے فیصلے بہت مضبوطی سے کر لیتا ہے۔
لیکن جب ان فیصلوں کے راستوں پر سے گزارنا ہے تو
معلوم ہوتا ہے۔

فرزام ایک اچھا اور انصاف پسند لڑکا تھا، لیکن اس
کے کانوں میں ماضی میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر قطار
در قطار درختوں کے سایوں میں چہل قدمی کرتے اور
کسی جھیل کے کنارے بیٹھے بنے گئے خواب آبشار
کے جھرنے کی طرح رواں تھے۔

وہ ذہن کو جھٹک رہا تھا۔ پھر بھی کانوں میں
سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک خفیف سی
کپکپاہٹ اس کے اندر تھی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ
کسی گودھکا دے کر گھر سے باہر نکل کر دروازہ مقفل

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سرگ کے دو کتا

آمنہ ریاض

تیت 250/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، ملہ بازار، کراچی

دن بلوغ جنح جانا چل قدمی کرتا کبھی کبھی بیڈ منشن کھیل لیتے اب وہ سب ساتھ جانے لگے تھے۔ اسد اور جمال اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اب سب کو ایسے دیتے کھیلتے دیکھ دیکھ گلابی ہوتی جا رہی تھیں۔ صحت اچھی ہوئی مئی تھی۔ لیکن اس اطمینان و سکون نے اور اچھی کر دی تھی۔

بیڈ منشن کھیلتے وہ ریکٹ افق کے ہاتھ میں بھی دیتا تو وہ سرنگی میں ہلا دیتی۔ وہ پکڑا کر دور سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ جب وہ ہر شل کو مس کر دیتی تو ایسے شرمندہ ہوتی جیسے بہت بڑا گناہ کر لیا ہے اور بلوغ جنح کے سب ہی لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو کر ”شیم شیم“ کہہ رہے ہیں۔

”افق! آخر ریکٹ کو ایسے ایسے پکڑنے میں تمہارا کیا جاتا ہے“ وہ قریب آکر پھر سے بتانا کہ ریکٹ کو کیسے پکڑنا ہے۔ اس کے دور جاتے ہی وہ پھر سے بھول جاتی۔

”اس شل سے تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟ یہ دیکھو“ اس میں کوئی مہم فٹ نہیں ہے۔

وہ ریکٹ اسد یا جمال کو پکڑا دیتی۔ فرزام دور سے چلاتا۔ ”واپس کرو اسد اسے“ وہ واپس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔

”کھیلتی کیوں نہیں ہو افق باجی۔ ایسے کھیلو۔ ایسے“ اسد بھی اس کے پاس آکر تاتا۔

فرزام نے اس کی طرف ہٹ کی اور وہی پہلی ہٹ اس نے ریورس کی تو وہ ریکٹ چھوڑ چھاڑ دل پر ہاتھ رکھ کر قہقہے لگاتے لگاتے اسد اور جمال نے ہانکیاں بجائیں۔ وہ چلتا ہوا قریب آیا۔

”اسد! میں جا رہا ہوں۔ لیکن تم یاد سے یہاں آکر یاد دہاری ہو والگا جانا۔ ٹھیک یہاں۔“ جمال افق کھڑی تھی وہاں کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے فرزام بھائی! اور کچھ؟“

”میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے۔“ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ریکٹ ہاتھ میں لیے

کھڑی تھی کہ جاؤں یا نہیں رہوں۔

پھر وہ اس کے ساتھ لمبی لمبی سڑکوں پر چل قدمی کرتا۔ ہلکی پھلکی باتیں کرتا۔ ایک بار اسے خریداری کے لیے لے گیا۔ اسے اپنی پسند کے لیے کھنڈی لود سوتی کے کرتے اور جینز کے کپڑے نما ٹنگ پاجامے لے کر رہے۔ پمپ شووز لے کر رہے۔ پمپ شووز لے کر رہے۔

”تمہاری یونیورسٹی وارڈ روم تیار ہے؟“ اس کا کہنا تھا کہ کپڑے کم ہی ہوں۔ لیکن صاف کپڑے ہوں۔ وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ نفیس ہو گئے تھے رہا کر اچھے کپڑے میں ہو۔

اسے اپنے یونیورسٹی بیگ میں کیا کیا رکھنا ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا۔

”کسی سے ڈرنا نہیں اور سب سے ہائے پیلور کئی ہے۔“ اس نے سمجھایا کہ ”لوگوں کے ڈر کو بچانے کے لیے سے نکل دو۔ ان سے فاصلے پر رہو۔ لیکن انہیں جانچتی رہو۔ جب ہم زیادہ لوگوں کو جانچ لیتے ہیں تو کم بے وقوف بننے ہیں۔ جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے لگتے ہیں ہمارے بننے لگتے ہیں۔“

اس کی پینٹنگ مکمل ہو گئی۔ اسے صبح کی فلائٹ سے جانا تھا۔ سب لوگ کھلی جھٹ پر موجود ہاتھیں کر رہے تھے۔ اسد نے ابھی سے رونا شروع کر دیا تھا اور فرزام اسے ہلارہا تھا۔ جب وہ کمرے میں آیا تو اس کے کپڑے استری کر دی تھی۔ وہ بیگ کی کچھ کھول کر سرسری نظر سلان پڑا لے لگ۔

”افق! آواز دی۔ اس نے سوچ بچ کر دیا تھا۔ کوئی کام ہو گا۔“

”ارے نہیں۔ تم کام کرتی رہو۔ میں سہل کر رہی پریشانت کر رہا ہوں۔“

اس نے سوچ آج کر دیا اور پھر سے استری کر لی۔

”مجھے چند سہل تو لگ ہی جائیں گے امریکا میں۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خاموش ہی رہا۔

سر انتظار میں افق نے ہی مڑ کر اسے دیکھا۔ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسے دیکھتے پا کر وہ جھٹ سیدھی ہو گئی۔

”تم مجھے یاد کرو گی؟“ ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔

”ہی ایسے ہی۔ روز فون کیا کروں گا۔ ایسے میں یاد کیا کروں گا؟“ وہ سوال پوچھ کر خود ہی ڈر گیا کہ اگر اس نے یہ کہہ دیا یا کوئی بھی جواب نہ دیا تو اس نے جواب کی گنجائش ہی ختم کر دی۔

افق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ایک اور بات پوچھ لوں۔“ انداز بچکانہ تھا۔ لیکن دراصل اسے بچکانہ بنایا گیا تھا۔

”جی! میں سن رہی ہوں۔“ یہ نہیں کہا۔ ضرور ضرور۔ اس سوال پر وہ خود جھٹ سے اڑ گئی کہ نچالے کیا پوچھ لے۔

اس نے دیکھا کہ وہ استری شدہ شرٹ کے کالر کو پھر سے استری کر رہی ہے۔ پار پار اسے استری کر رہی ہے۔ سوال پوچھنے کی نوبت ہی ختم ہو گئی۔ جب اس نے افق کو وقت دے ہی دیا تھا اور بتا کے اس سے مانگ بھی لیا تھا۔ پھر اسے ایسے اس سے دل لگی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

افق نے اسے دیکھا اور چاہا کہ اسے روک کر پوچھے کہ کیا پوچھنا تھا۔ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکی۔ ابھی اس میں اتنی اہمیت نہیں آئی تھی اور ابھی وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی وہ ہر سوال پوچھنے جانے سے ڈرتی تھی۔ ہر جواب کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی تو وہ صرف فرزام کا احترام کرتی تھی۔ صرف احترام۔ باقی سب جذبول کے لیے نچالے کتنا وقت دے گا تھا۔

جنت کی رات ان سب نے اسے خدا حافظ کہا۔

افق کو گھسیٹتے اس نے ایک اور بار مڑ کر خاص طور پر افق کو دیکھا۔ وہ جلد ہی اسے بھی یوشن ہلا لے گا۔



افق کے پیسوں اور کچھ اپنی بچت کو مسز گوہر نے استعمال کیا اور قدانی اسٹینڈیم میں ایک دکان کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ برطانیہ جانے سے پہلے ان کا خواب رہا تھا یہاں ایک دکان حاصل کرنا۔ لیکن اس وقت کے بعد دیگرے ان کے حالات بدلتے ہی چلے گئے اور وہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔ اب دکان انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ کچھ ترمیم و آرائش کروا کر انہوں نے اس کا افتتاح کر دیا۔ افتتاح کچھ ایسے تھا کہ پانچ سو اور ہزار میں سیل لگا دی گئی تھی اور تین کی خریداری پر ایک جوڑا مفت تھا۔ یہ پیش کش اگلے پندرہ دنوں تک کے لیے تھی۔ اس افتتاح کے لیے انہوں نے نئے کپڑے بنائے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اشاک میں رکھے اچھی حالت کے راتے کپڑے بھی ڈسپلے کر دیے تھے۔ اسد اور جمال دکان کے سیز میں بن گئے۔ بیس دن کے اندر اندر سارا اشاک ختم ہو گیا۔

مسز گوہر کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اب انہیں من چاہا منافع ہو رہا تھا۔ چند بڑے اسٹورز کے آرڈرز کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے برائے ”پتھر“ کے لیے کام شروع کر دیا۔

یہ اس علاقے میں کھانے والی پہلی مکمل بچیوں کے ملبوسات کی دکان تھی۔ جس میں ہر رنگ کے کپڑے، ڈرائین، کام اور ہر طرح کے اونٹ کے لیے لباس لگتے۔ انہیں آرڈر بھی دیا جاسکتا تھا۔ انہیں بھی۔ آرڈر اور قہم درک کے لیے وہ تھوڑے سے زیادہ پیسے چارج کرتے تھے۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی میچنگ پانچ اور زیورات کا کام بھی شروع کر دے گی۔ کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کاریگر زیادہ رکھنے پڑے اور اوپر پچھے اس گھر کو انہوں نے چھوٹا سا کارخانہ بھی بنادیا۔

(باقی آئندہ ماہ)

محبت سیاح

تھا۔ غذائی اسٹیڈیم میں دکانیں دوپہر کے بعد ہی کھولے جاتے تھے۔ اس لیے اب ان دونوں کے پاس کافی وقت تھا۔

افق اور سبزگوہر کی ساری توجہ اب ڈیرا منگہ پر آگئی تھی۔ اب انہیں کسی کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ فلاں آرڈر نے فلاں طرز کا سہیل ہی بتانے کے لیے کہا تھا۔ یہ فلاں کپڑا اور ڈیزائن ہی مانگا ہے۔ اب انہیں مکمل آزادی تھی۔ وہ اپنی مرضی کا ڈیزائن کریں گی اور ”چتر“ میں ڈسپلے کریں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ہر ڈیزائن کو پسند کیا جائے گا۔ اور پھر سے پہنا جائے گا۔ اب انہیں ریگولر کسٹمر مل گئے تھے جو سیدھا ”چتر“ آتے۔ ویسے بھی انسانی خبط ہے کہ وہ ایک بڑی پر

کام ہر جگہ جانے کی صورت میں انہیں کاریگر زیادہ رکھتے پڑے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی بنادیا۔

خود ایک اچھی کالونی میں پندرہ مرلے کی کوٹھی میں کرائے دار بن کر آگئے۔ کارخانے میں میٹرل کی سپلائی کے لیے بینک سے ایک سونڈ کی قسطوں پر نکوالی۔ اس سونڈ کی کاڈرا میور جمال تھا۔ وہی کارخانے کے سب ہی اندر باہر کے کام دیکھتا تھا۔ کاریگروں کے مسئلے حل کرتا تھا۔ حساب کتاب دیکھتا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا۔

اسد نے ایف ایس سی میں کالج میں داخلہ لے لیا

مشکل ناول



مارکیٹ سے کھینچا چیز بھی بہت اطمینان کے ساتھ لے لے گا اور پھر سے سب کو بتائے گا۔ انہی جگہ اور اونچے نام بہت سے نقائص پر پروں کا کام کرتے ہیں۔

لاہور کے اتنے شبن دار علاقے میں ایک شاندار دکان نے انہیں دلوں میں خاطر خواہ سے زیادہ منافع دینا شروع کر دیا۔ منافع سے زیادہ وہ ملبوسات کی پسندیدگی سے خوش تھیں۔ ان کی محنت رنگ لار ہی تھی۔ وقت وہ طرح سے بدل جاتا ہے۔ ایک قسمت سے۔ ایک ہاتھ سے قسمت سے نہ بدلے تو ہاتھ سے بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ قسمت ہار جاتی ہے۔ ہاتھ نہیں ہارتے۔ دنیا میں جتنی بھی انسانی ترقی ہوئی ہے۔ اسے ہاتھ سے ہی ممکن کیا گیا ہے۔ ورنہ ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہنے والے لوگوں کے زمین میں دبے ڈھانچے بھی نہیں ملتے اور مل جائیں تو کار کد نہیں ہوتے۔

افق کا۔ مسز گوہر کا۔ اسد اور جمل کا۔ ان کا وقت بدل چکا تھا اور یہ وقت ہاتھ باندھے بیٹھے رہنے سے نہیں بدلاتھا۔

اپنی سونو کی میں جمل افق کو ڈراپ کر دیتا۔ وقت ہوتا تو لے بھی آتا۔ ورنہ وہ خود ہی آجاتی۔ اماں نے گھر کے معاملات سنبھال رکھے تھے۔ وہ کام والی کی نگرانی کر لیتیں۔ مگر کوئی کہیں۔ ان سب کے لیے وہ سر کا کھانا بنوا کر کارخانے بھجوا دیتیں۔

رات کو فرزام آن لائن آجاتا۔ باری باری سب سے بات کرتا۔ افق کو اپنی یونیورسٹی کے بارے میں بتاتا۔ کیا کھایا کیا پیا، کب سویا، کب جاگا۔ وہ اس سے دیر تک بتاتا اور اس سے بھی ڈھیروں سوال کرتا۔ آہستہ آہستہ دونوں میں اچھی گپ شپ ہونے لگی۔ وہ لپ ٹاپ کے سامنے لالا کر دکھاتا۔ یہ شرٹ لی، یہ پینٹ لی۔ یہ مک لیا۔ پین لیا۔ یہ مکی ماؤس وال کلاک۔ ایک منٹ تک ہر صورت بچتے والا الارم۔ یہ نیا سیٹ، نیا لوشن، نئے جوتے، نئی گھڑی اور جرابیں۔

اگر وہ یہیں اس کے پاس ہوتا تو شاید ایسے کبھی نہ

کرتا۔ لیکن سات سمندروں کے درمیان میں کون سے اتنا دور ہو جانے سے اسے احساس ہوا کہ لاگ اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ اپنی یونیورسٹی کی خوب صورت ترین لڑکی قرار دی جانے لگی۔ اسے رک رک کر مٹر کر دیکھا جاتا۔ پہلے وہ بے چاری تھی۔ بسولہ رکشوں میں دھکے کھانے والی، کاونٹر کے پیچھے سے فاسٹ فوڈ کی ٹرے دینے والی۔ دیکھنے والے اس پر سمجھ کر دیکھتے تھے۔ اب وہ لمبے کرتوں اور رنگ پاجاموں میں بیگ کو کندھے پر لٹکائے، فائل کو بازو میں پکڑے دیکھنے والوں کو پہنچ سے دور نظر آتی۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے اس سے بہانے بہانے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ چند ایک لڑکوں سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان سے بات چیت ہوتے ہی وہ انہیں بتا چکی تھی کہ مس نہیں سمجھتا۔ اس سے مسز کا سنتے ہی لڑکی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔ انہیں بہت سی چینی ہوئی تھی یہ جاننے کے لیے کہ اگر یہ ایسی لڑکی ہے تو وہ کیسا ہوگا۔

لڑکوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہیں جھوٹ لگا۔ ایک نے اسے سفید جھوٹ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکیوں لڑکوں سے دور رہنے کے لیے مشہور کر دیتی ہیں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے یا منگنی۔ اگر یہ سفید جھوٹ بھی تھا تو افق کا انداز ایسا تھا کہ لڑکا اس کے قریب جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ فرزام سے شادی ہونے کے باوجود وہ لڑکوں سے نفرت کرتی تھی۔ جنہاں لڑکے اسے موبائل ہاتھ پکڑے یا باتیں کرتے نظر آتے اس کا خون کھانچا جاتا۔ لڑکوں کے گروپ میں ہنسی کے فوارے بہہ رہے ہوتے تو اس کے سینے ٹکٹے ٹکٹے۔ اسے ہوجانا کہ کسی لڑکی کا مذاق اڑایا جا رہا ہوگا۔ وہ لڑکی

نفرت کرتی تھی یا ان سے خوف زدہ تھی۔ اس کا بازو اس نے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آنے دیا تھا۔ ہاں اس کی ذلت میں ایک واضح نشان ضرور بن کر ابھر آیا تھا۔

”دور ہو۔“

جب وہ اور مسز گوہر کسی ہوٹل میں منعقد کسی نمائش میں جاتیں تو لوگ اسے کوئی بڑی ڈیزائنر سمجھتے۔ وہ دونوں دوسروں کے کام کا بخور مشاہدہ کرتی تھیں۔ اس سے انہیں اپنے کام میں جدت لانے کے نئے نئے تیزیاں ملتے تھے۔ فیشن سے متعلق ہونے والے ایونٹ میں وہ دونوں اکثر جایا کرتی تھیں۔ ان کا اپنا ارادہ بھی ایک ایونٹ کروانے کا تھا۔ لیکن ابھی کچھ کل وہ کرائے پر ایک کارنریا دکان حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب وہ ایک اور دکان کا کرلیہ انورڈ کر سکتے تھے۔ ایڈوانس بھی ان کے پاس تھا۔ وہ مری طرف مسز گوہر کا خیال تھا کہ اگر کوئی مہنگی دکان نہیں ملتی تو کسی اچھی سوسائٹی یا ٹاؤن میں وہ لوگ ساہوار قسط پر ایک اچھا گھر لے لیں۔

افق اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال جو اس کو ہی ترقی دی جائے۔ فرزام کا ووٹ مسز گوہر کے حق میں گیا اور اس نے گھر لینے کے لیے کہہ دیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ جو ادائی گھر کے کرائے کے سلسلے میں کی جاتی ہے وہی گھر کی قسط کی مدد میں ادا کر دی جائے گی۔ وہ دکان کے ایڈوانس کے لیے وہ کچھ اور انتظار کر سکتے تھے۔

لاہور کے مرکز سے ذرا اسد اور ایک اچھے ٹاؤن میں ایک گھر لے کر ایک بنگلے کی ایڈوانس بے منٹ کر دی۔ بانی فرزام نے اس سال کے اندر اندر ادا کر لی تھی۔ مسز گوہر کی خوشی دیکھنے لاق تھی۔ جیسے انہیں ان کا بیچا ہوا گھر مل گیا ہو۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ جمل اور اسد کو الگ الگ کمرے مل گئے۔ افق کو اپنے شوہر کا اپنا گھر مل گیا۔

سیاہ لائنگ کوٹ پہنے وہ ٹرائی کھینچتی شیشے کے دروازے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس کی فلائٹ وقت پر آئی تھی۔ لیکن اس کا سامان کم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سامان کو ڈھونڈنے میں کافی وقت لگا۔ وہ لوگن انٹر نیشنل ایر پورٹ پر موجود تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ فرزام اس کا انتظار کر کر کے چلا گیا ہو۔ اس نے کل ہی کہا تھا کہ اگر فلائٹ کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ ایر پورٹ پر سو جائے گا۔ وہاں سے جائے گا نہیں اور وہ ہنسنے لگی تھی۔

”تے شور میں نیند آجائے گی؟“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بساط دل	آمنہ یاس	500/-
درد و موم	راحہ جبین	750/-
دعائی اک روشنی	رحمانہ گارہ خان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رحمانہ گارہ خان	200/-
شہر دل کے دوا دے	شادیہ چوہدری	500/-
خیر سے نام کی شہرت	شادیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جوں	آمینہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاطمہ انوار	500/-
بھول بھلیاں حیرت مگیاں	فاطمہ انوار	600/-
بھلاں دے دنگ کالے	فاطمہ انوار	250/-
یہ گیاں یہ چہ پارے	فاطمہ انوار	300/-
میں سے عورت	فرزانہ عزیز	200/-

پہلا نمبر 32216361

وہ علامہ اقبال ایر پورٹ نہیں ہے، جہاں آدھے سے زیادہ لوگ ٹینک منانے آ جاتے ہیں۔ امریکیوں کا ہوائی اڈہ ہے۔ ہزار کیا لاکھ بھی ہوں تو شور نہیں ہوگا۔ ”کتنے اچھے ہیں امریکی۔ پاکستانیوں کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔“

”دونوں نے“ وہ کھلکھلائیں۔
 افتخار کافی دیر سے کھڑی تھی۔ فرزام نظر آکر ہنس
 دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نکلتے ہی اسے سارے
 کھڑا ملے گا۔ لیکن اب۔۔۔ ہاں لڑکا دور سے آتا
 اسے نظر آیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا
 ڈھائی سال دونوں نے ایک دوسرے کو آن لائن دیکھ
 تھا۔ ڈھائی سال لپ لپ سے آنے سے آئے سانسے رہے
 تھے۔ اس نے اس کی ہر ہر بات سنی تھی۔ بہت سے
 لطیفوں پر ہنسی تھی۔ اس کی خریدی گئی بہت سی چیزیں
 کو ہاں پسند کیا تھا۔ بخار اور دکھ میں اس کی سرخ ناک
 مذاق اڑایا تھا۔ اور اب۔۔۔ وہاں کھڑے، بھلے
 ہوئے ایک شخص کو اپنے قریب آتے دیکھتے افتخار
 عجیب لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس پر اس
 کی پہلی نظر پڑی اور اس کے دل نے چاہا کہ چلائے
 لگا کر باہر آجائے۔ اس پر اس کی نظر پڑی تو جی نہیں چلا
 کہ وہ نظرواپس لوٹ آئے۔
 دونوں کی نظریں ملیں۔ فرزام خوش دلی سے
 مسکرایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھول تھے۔ اس کے
 قریب آکر وہ بریک لگانے کے سے انداز میں رکا۔
 ”او میری افتخار!“ پھول اس کے ہاتھ میں دے۔
 ”ایک ایک سیمنٹ ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے سڑک
 جام تھی۔“

سلمان کا شمار کئے لگے۔
 اس قدر بڑی ہوئی ہوگی۔ ہے نا؟
 ”نہیں۔ میں یہ کتب پڑھتی رہی۔“ اس نے
 پھولے ہوئے بیک کی طرف اشارہ کیا۔ فرزام کا خیال
 تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان
 گزروں میں دو دنوں میں بہت اچھی دوستی ہو چکی
 تھی۔ فرزام جیسے لڑکے پر افاق کو بہت ناز تھا۔ افاق جیسی
 بچی فرزام کو بہت پیاری ہو گئی تھی۔

ان کے سوا اور پر سوالیہ کلمہ
Men's Spa سے آ رہا

ہوں۔ سوڈا الرز میں تیار ہو کر۔“

انداز میں خفگی تھی۔ سوڈا الرز ضائع جانے پر یا تعریف نہ کیے جانے پر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تو دیر تک ہنستی ہی رہی۔ وہ کوئی لیڈی ڈیڈ یا نا تھی جس کے آنے پر وہ اس طرح سے ہن سکتا تھا۔ انہی نے آتے ہوئے لب گلوڑ لگایا تھا جو اتنی لمبی فلائٹ میں کب کا گم ہو چکا تھا۔ یہاں آتے ہوئے بھی اس نے صرف کپڑے ہی تبدیل کیے تھے۔ بلیک شیفون کا سوٹ جس کے تنگ بازوؤں پر سفید موتیوں کی تین لائن بنی تھیں اور ایسی ہی تین لائنیں دوپٹے کے چاروں طرف تھیں۔ سامنے سے بال اٹھا کر انہیں چند بل دے کر پیچھے پن لگالی تھی اور بالوں کی ڈھیلی چوٹی بنا کر انہیں پیچھے سے لاکر بائیں کندھے پر رکھا تھا۔ دائیں کندھے پر دوپٹا سلیقے سے جمایا ہوا تھا۔

”اب تمہیں بہت ہنسی آیا کرے گی۔“

پاکستانی اور انڈین کیونٹی نے مل کر اس ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے ایک کلائنٹ نے ہی انہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی معلومات فرزام نے حاصل کر لی تھی۔ بنگ انہیں آسانی سے مل گئی تھی۔ دس روزہ ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ جب کے ساتھ ساتھ فرزام نے اس کی مدد بھی کی۔ اسی ایونٹ کے دوران ان سے ایک بڑی اور فعال این جی او کا نمائندہ ملا وہ انہیں این جی او کی طرف سے کرائے جانے والے دوسرے ایونٹ میں شامل ہونے کے لیے راضی کر رہے تھے۔ جس کا مقصد فنڈز اکٹھا کرنا تھا۔ این جی او تھرڈ ورلڈ میں بچوں کی عام ویائی بیماریوں کی ویکسین مفت سپلائی کرنے کا کام کر رہی تھی اور اس کی لیے وہ کیونٹیز کو اکٹھا کر رہی تھی۔ این جی او کے ساتھ کام کرنے والے مجموعی منافع کا پچیس فیصد رکھ سکتے تھے۔ باقی کام منافع انہیں این جی او کو فنڈ دینا تھا۔

افق نے پاکستان میں سڑکوں پر سے بات کی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ مطلوبہ آرڈر تیار کروانے کے امریکا بھجوا سکتی تھیں۔ افق نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدے کی رو سے اگر وہ ایک خاص شرح سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر کے دیں گی تو اسے این جی او کا رکن جانا جائے گا اور وہ این جی او کو اپنی آراء اور مشوروں سے نواز سکتی ہے۔ ایونٹ کے باقاعدہ شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ ہفتہ اور اتوار دونوں انہیں شہر کے مختلف کیونٹی سینٹرز میں نمائش منعقد کرنی تھی۔ ہر ہفتے نئی جگہ ہوگی۔

این جی او نے اسے دور ضا کار بھی دے دیے۔ کام کرنے اور کسی بھی مسئلے سے نمٹنے کے لیے۔ مقامی اور غیر ملکی پچاس سے زیادہ گروپس شرکت کر رہے تھے۔ پمفلٹ پر ”چیز“ کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ ٹی وی میں فنڈز ریزنگ کے لیے تشہیر کی گئی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ امریکا اگر وہ پاکستان سے بھی زیادہ مصروف ہو جائے گی۔ کارخانے میں ان کی ایک اسٹنٹ تھی ”مس سندس۔ افق سارا وقت

اس سے آن لائن رابطے میں رہتی۔ دونوں آپس میں ڈسکسی کرتی رہتیں کہ کس ڈیزائن اور کس میٹریل کو لے کر کام کرنا ہے۔ رنگ کون سے اچھے رہیں گے اور کس پینٹرے کو یوسٹن کے لوگ پسند کریں گے۔ پاکستانی مخصوص روایتی لباس ہی بتا رہے تھے۔ لیکن کیونکہ اس ایونٹ میں ہر ملک کے لوگ آنے والے تھے تو انہوں نے جینز پر پہننے کے لیے مختلف ڈیزائن کے کرتوں پر بھی کام کیا تھا اور چھوٹے کراس بیگ پر ٹین این جی او کیوں کے اسٹائلز پر بھی۔

یہ ایونٹ تین مہینے تک جاری رہتا تھا۔ ان کے پاس کام کے لیے وقت تھا پہلا اسٹاک جلد ہی مل جاتا تھا۔ این جی او کی طرف سے انہیں بریفنگ دی جارہی تھی اور ٹریڈ کیا جا رہا تھا۔ انہیں بتایا جاتا کہ انہیں کسے اپنی مصنوعات کو ڈپلے کرنا ہے۔ کم سے کم پرائز ٹیک کیا ہونے چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ کیا۔ انہیں پہلے جمع کیے گئے فنڈز کے بارے میں بتایا گیا۔ انہیں اچھی طرح بریف کیا گیا کہ کس طرح وہ پہلے سے زیادہ فنڈز اکٹھا کر سکتے ہیں۔ این جی او کے ریکارڈ کو توڑ سکتے ہیں۔ ان سے سوالات کیے جاتے۔ مشورے مانگے جاتے۔ انہیں تھرڈ ورلڈ کے بیمار بچوں کی مختصر ڈاکو منٹریز دکھائی جاتیں۔ یوں انہیں فنڈز ریزنگ کے لیے اچھی طرح تیار کر دیا گیا۔

ایک بار ملا نے کہا تھا کہ افق ”خیر“ ہے۔ تم تو زیادہ ہی ”باعث خیر“ بن گئی ہو۔ ”بات اچھی تھی لیکن انداز اور افسرہ ساتھ تھا۔

وہ ڈائمنگ نچل کی کرسی پر بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قریب ہی پاکستان سے بھیجا گیا پہلا اسٹاک بکرا رہا تھا۔ وہ انہیں جانچ رہی تھی اور الگ الگ کر رہی تھی ساتھ ساتھ پیڈر ٹوٹس لکھتی جارہی تھی۔ ایونٹ کے پہلے ہفتے کے لیے وہ خاص خاص کلیکشن کا انتخاب کر رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ مین کو تیزی سے چلاتے اس

نے پچھلے فرزام نے آگے بڑھ کر اس کا پین اچک لیا۔

”کوئی نہیں جانتا۔“ قریب ہی کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔

”ہاں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔“ کہاں؟“ ”کیونکہ“ دونوں ہاتھوں کو اداسی سے تھوڑی کے نیچے رکھا۔

”آپ کے آفس والے بھیج رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ آٹھ پہلے میں نے وہاں کی ایک کمپنی کو درخواست دی تھی۔ ساتھ ہی اپنے کام کی تفصیل اور سی ڈی بھی بھیجی تھی۔ کمپیوٹر سے متعلق کچھ نئی اصلاحات پر کام کیا ہے میں نے۔ چند سوئٹ ویئرز بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیابی سے بنا سکتا ہوں۔ وہ مجھے انٹرویو کے لیے بلا رہے ہیں۔ ”باتیں وہ اچھی کر رہا تھا۔ لیکن منہ بگڑتا ہی جا رہا تھا۔

”تو جا میں نا۔“ دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پاتی تھی کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔

”ہاں تو جا ہی رہا ہوں۔“ وہی لالی پاپ نہ ملنے کا انداز۔ افق کو حیرانی تھی کہ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔ ”تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

جیسے دراصل یہی پوچھنا چاہ رہا ہو۔ افق نے ابجھ کر اس کی طرف دیکھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا اور یہ کیوں سمجھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔

”کیسا سوال ہے۔“ وہ واقعی حیران تھی۔

”تم مجھے روک ہی نہیں رہیں۔“ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ نہ جا میں نا۔ تم نے کہہ دیا کہ جا میں نا۔

”ہاں۔“ افق کی سمجھ میں اب بات آئی تھی۔ اس کی کہیں تک نہیں اور اس نے سامنے رکھے پیڈر پر انہیں گلا دیا۔

دونوں کے تعلق کے درمیان ایک فاصلہ بنیاد سے ہی چلا آ رہا تھا۔ اب بھی وہیں تھا وہ کم ضرور ہو رہا تھا لیکن ابھی تک موجود تھا۔ فرزام اس کے ساتھ چل رہی تھی کہ نہ تھا۔ لیکن اس کی کمر میں اپنے بازو عمائل نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس کا بازو تھا تھا تھا۔ جب

افق کچن میں حکام کر رہی ہوتی اور وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور افق کے ہاتھ سے گر جاتا اور وہ مسکراہٹ دیتا یا کچن سے چلا جاتا۔ اگر انہیں ایک ہی صوفے پر بیٹھنا ہو تا تو وہ ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھتے۔ ورنہ الگ الگ صوفوں پر ہی بیٹھتے۔ وہ وہاں کے دور میں داخل ہو رہے تھے۔ لیکن وہاں کرتے نہیں تھے۔

افق جب اکیلی ہوتی، بس میں بیٹھتے۔ ٹوب میں۔ این جی او کی بریفنگ لیتے۔ سبزی اور گوشت کی خریداری کرتے۔ ڈیجیٹل سارے پیڈر کو ہاتھ میں پکڑتے۔ فٹ ہاتھ پر چلتے۔ سڑک کو پار کرتے۔ ٹکٹ لیتے۔ گھر کا لاک کھولتے۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی۔ وہ دن رات اسے سوچتی۔ کام کے دوران بھی اسے کھوجتی۔ پاکستان میں وہ اس کے آن لائن آنے کا انتظار کرتی تھی۔ یہاں وہ اسے بار بار دیکھنے کا انتظار کرتی تھی۔ پاکستان میں وہ انتظار کم تھا۔ یہاں بہت بڑھ گیا تھا۔ فرزام اس کا شوہر تھا۔ جس کے کھوجانے کا اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جس کے چلے جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ اسے بہت بہت پسند کرتی تھی۔ بہت یاد کرتی رہی تھی۔

”نہ جا میں۔“ اس نے اٹھو سے کہہ دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمجھے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ جس کام کے لیے اس نے اتنی محنت کی ہے وہ صرف اس کی وجہ سے اس محنت کا عمر نہ کھائے۔ اگر وہ امریکا نہ آتی ہوتی تو وہ چلا ہی جاتا۔ اس طرح اس کے کہنے پر وہ بہت خوش نظر آنے لگا۔ جیسے جانا تو اسے بھی ہے۔ لیکن روکے جانے کی اسے بہت خواہش ہے۔

”میں تمہیں یہاں بلا کر خود یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں۔ انٹرویو تو بہانہ ہے۔ میرا کام انہیں پسند آگیا ہے۔ وہ میرے آگے کانٹریکٹ رکھ دیں گے۔“ ٹیل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا۔

افق کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھالے اور یہ بھی کہ وہ اس کے ہاتھ پر ہی رہے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ جانا بھی چاہ رہا ہے

لوہر رکنا بھی۔
 ”ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں ملتے۔“
 اس بات پر وہ خاموشی میں سمٹ گئی۔ چاہتی تھی کہ فیصلہ وہ خود کرے۔ اگر وہ اسے جانے کے لیے کہے تو شاید وہ برا مان جائے اور اگر روک لے تو اس کا خواب توڑ دے۔

وہ دن وہ ایسے ہی الجھا رہا۔
 ”اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے مجھے اچھے خاصے پیسے ملیں گے۔ میں کافی امیر ہو جاؤں گا۔ بہت زیادہ اپنے پیسوں والا۔ پھر تم میرے ساتھ پیرس چلو گی؟“
 یہ صرف ایک سوال تھا۔ لیکن سر ہلانے سے پہلے جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو جانا کہ یہ صرف ایک عام سا سوال نہیں ہے یہ ان دونوں میں چھپی ہوئی ”محبت“ ہے۔ مدھم مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں چھپی۔ فرزام کی نظریں اسی چمک چمک پر جمی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ ملے ہوا۔ ابھی تو ایسا ہے کہ زندگی افزا تفری کا شکار ہے۔ تم فنڈ ریزنگ کے لیے کام کر رہی ہو۔ بوشن میں تمہیں ایک کارنر بھی چاہیے۔ ماں مجھے بار بار فون کر کر کے کہہ رہی ہیں کہ ان کے کارنر کا کیا بنا۔ ایک دو لوگوں سے بات چل رہی ہے۔ ساتھ چلنا۔ تم بھی مل لینا اور میرے آنے سے پہلے ہر کام سے فاسخ ہو جانا۔ ٹھیک ہے۔ ساتھ سر بھی ہلایا۔

”پروجیکٹ پر ہی کام کروں گا۔ کہنی مجھے جاب بھی دے گی۔ لیکن مجھے کینیڈا میں نہیں رہنا۔ وہاں کاموسم نہیں پسند مجھے۔ اگر وہ مجھے برطانیہ میں اپنی کہنی کی برانچ میں سیٹ کر دیں تو ٹھیک ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میں برطانوی حکومت کو یہ پیاسکوں کہ انہوں نے کس قدر لائق فائق لڑکے کو نکال باہر کیا۔ ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس بار انہیں مجھے اعزاز سے سزا دینا ہو گا۔“
 ماما کہتی تھیں کہ وہ پریشانی اور خوشی میں بولتا بہت ہے۔ اب افق کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی

میں بول رہا ہے یا پریشانی میں۔ افق نے سوچا کہ اسے ایک بار پھر فرزام کو روکنا چاہیے۔ شاید وہ کیسی پہاڑ ہے۔
 ”مگر دل نہیں چاہ رہا تو نہ جائیں۔“
 بولتے بولتے رک کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ ”مذرا کر رہی ہو؟“

سرنگی میں ہلایا۔ ”روک رہی ہوں۔“
 ”اب میں تمہیں پیرس گھوما کر رہی رہوں گا۔ چہ دونوں کی بات ہے میں سیٹ ہو جاؤں گا۔“ آخری بات کہتے کہتے منہ کو زیادہ لٹکایا۔

ہفتے کے اندر اندر وہ چلا گیا۔ وہ اپنے کام میں بے حد مصروف تھی۔ لیکن اس بار یہ مصروفیت اسے اچھی نہیں لگی۔ بوشن آنے کے بعد وہ ہفتہ گھومتے رہے تھے۔ وہی ٹھیک تھا۔ وہ کام سے نہیں ٹھکتی تھی لیکن اب اسے اپنے آس پاس فرزام چاہیے تھا۔ جیسے وہ نیپل پر بیٹھی کام کر رہی ہو تو وہ اچانک سے اس کا پین آکر اچک لیٹک سندس کو ”بائے بائے“ کہتا۔ چاکلیٹ دودھ کا گلاس اس کے سامنے لا کر رکھتا اور ایم پی ٹھری کے ایر فون اس کے دونوں کانوں میں لگاتا۔

”پہلے گلاس ختم کرو۔ پھر کم سے کم تین گانے سنو۔ پھر کام شروع کرنا۔“ وہ گلاس پی جاتی۔ تین گانے سن لیتی اور پھر سے پین پکڑ لیتی۔ رات گئے سندس کے ساتھ ویڈیو چیٹ پر جب وہ ڈسکشن کر رہی ہوتی تو قریب ہی صوفے پر آؤا تر چھا لیٹے وہ اپنی جمائیاں روک رہا ہوتا۔ بظاہر وہ لی وی دیکھ رہا ہوتا۔ لیکن دراصل اسے الارم دے رہا ہوتا کہ اب بس کرو کام۔ اور دوسری تیسری بار جب وہ اس پر نظر ڈالتی تو وہ صوفے سے لڑھک کر نیچے کارپٹ پر سو رہا ہوتا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ الٹا پلٹا سا بچہ بن گیا ہے۔

اور افق جیسے اقوام متحدہ کی سفیر بن گئی تھی۔ کام اس کی طرف تھینچے چلے آتے۔ گھر کے کام اور کھانا پہلی فرصت میں ہی بناتی تھی۔ باقی کے اپنے کام سارا وقت کرتی۔

پہلا تم روز کھانا بناتی ہو یا رات؟ ایک دن وہ آفس سے آکر گھر لے لگا۔
 ”میں بنایا کروں؟“
 ”بھئی کہہ ہی دیا کرو کہ“ فرزام جی! مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔ یہ کھانا دانا میں نہیں بنا سکتی اب چلیں! کہیں باہر چل کر کھاتے ہیں۔“ وہ اس کی لڑا لڑا اور انداز کی بھرپور نقل اتار رہا تھا۔
 ”فرزام جی!“ اسی کی طرح ”فرزام جی“ کو تان میں لے کر کھانا باہر چل کر کھالیں؟“
 ”یہ کھانا باہر کھالیں؟“

”اس بلڈنگ کے گاؤن میں۔“ ہاتھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ باہر کھانا کھانے سے میرا یہ مطلب ہے گھر میں پکاؤ اور باہر جا کر کھالو۔ ہو گیا باہر جا کر کھانا۔ ایسا کرتے ہیں کسی ہوٹل کی پارکنگ میں اپنے چمچ بنیں اور گلاس لے کر چلتے ہیں اور وہاں کھاتے ہیں کھانا۔ ایسے ہو جائے گا ہوٹل میں کھانا کھالیں۔“

وہ خوب ہنسی اور منٹوں میں تیار ہو کر آگئی۔

”کیاں؟“ فرزام کو معلوم تو تھا۔ لیکن اسے چارہا

”ہوٹل کی پارکنگ میں کھانا کھانے۔“
 وہ ٹول کی جان لگا کر ہنسنے لگی۔

فرزام نے ٹھیک ٹھاک اپنا ٹھکانہ رکھا۔ لوگوں کی ہنسی اور ہنسنے کی حرکت کی تھی۔ افق کا اسکو بھی اچھا رہا تھا۔ اس کے لیے وہ لوہر پر امید ہو گئی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی مصنوعات میں وہاں کے لوگوں کی پسندیدگی کا قیاس مرکز کیا تھا اور کتنا زیادہ پسند کیا گیا اور کیا اسے یہ کھد کے مومنے کرتے تھے۔ جن پر کام تو تھا ہوا تھا۔ لیکن ان کے ڈیزائن ایسے تھے کہ لگتا تھا کہ ہاتھ سے بنائے گئے ہیں۔ مشینی کڑھائی میں

یورپین ممالک ہر ملک سے آگے ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ ان چیزوں میں خاص دلچسپی لیتے ہیں جو کسی دوسری ثقافت کی نمائندہ ہو۔ ان کڑوں پر روایتی ٹانگوں کو مشین سے بنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص وہ چیز لینا چاہتا ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو تو ایسے میں دوسرے ملکوں کی روایتی چیزیں دھڑا دھڑا فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اشالوں پر بھی کم و بیش ایسی ہی چیزیں تھیں۔ لیکن رنگوں اور ڈیزائن میں فرق ایک چیز کو دوسری سے الگ کر رہا تھا۔ وہاں ان کا مقصد منافع نہیں فنڈ ریز تھے اور سب ہی چاہتے تھے کہ وہ اچھے فنڈز اکٹھے کر لیں۔ افق کو اچھا لگ رہا تھا اس جی او کے لیے کام کرنا۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار امریکی مشہور و معروف قانون دان، کھلاڑی، صحافی، اساتذہ، ڈاکٹر، وکیل، سینیٹرز اور بے شمار دوسرے لوگ رضا کار بنے ہوئے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے تھے۔ سامان کو اٹھانے اور صفائی کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو دوسرا کار اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک ساٹھ سالہ سرجن ڈاکٹر تھے۔ دوسرا رضا کار ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ ایسی صورت حال میں افق کا جذبہ اور بلند ہو گیا۔

واپسی پر وہ فرزام کو ایک ایک بات بتاتی۔ پھر تک وہ مصروف رہی۔ اگلے دو دن اس کے پاس بہت وقت تھا۔ اس نے گھر کے لیے ضروری خریداری کی۔ فرزام کے دوست کی بیوی نمل اس کے ساتھ ہی گئی۔ اس نے زندگی میں کسی لڑکی کو لپ اسٹک کے لیے اتنا جتنی نہیں دیکھا تھا، جتنی وہ تھی۔ وہ شاپنگ مال میں ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ریسٹورنٹ میں آکس کریم کھاتے ہوئے آس پاس موجود خواتین پر نظریں گاڑے رکھتی۔ ان کے ہونٹوں پر۔ اگر خاتون دور ہوتی تو آنکھیں سکر لیتی۔ ورنہ ذرا سا قریب چلی جاتی۔ وہ اس حساب کتاب میں رہتی کہ چمکتی آنکھوں والی سنہرے بالوں والی مگھابی رنگت والی لڑکی نے جو پرل سی ڈرا سی ہنسی اور بے بسی پنک سے ذرا سی گہری لپ اسٹک یا لپ

گلوڑ لگا رہا ہے۔ وہ اس کے پاس ہے نا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے دھتالی جاتی۔
”یہ جو نیلے اسکرٹ میں لڑکی گزری ہے نا۔ ہاں۔ وہ۔ وہ۔ اس نے جو لپ اسٹک لگائی ہے وہ میرے پاس ہے۔ اور وہ جو مولی عورت نے لگائی تھی وہ نہیں ہے۔“ اکثر وہ ان کے پاس چلی جاتی۔ چین سے ہاتھ پر براؤن اور لپ اسٹک کا نمبر لکھتی اور ”تھینک یو“ کہہ کر پلٹ آتی۔

اس کے وارڈروب میں اتنے کپڑے اور جوتے نہیں تھے جتنے لپ اسٹک اور لپ گلوڑ کے پاس تھے۔ افق میک اپ نام کی چیز سے واقف نہیں تھی۔ نہ ہی اسے شوق تھا۔ لیکن مکمل کے کہنے پر اس نے میک اپ کی کچھ چیزیں لے لیں۔ اس نے سوچا کہ وہ میک اپ کر کے فرزام کو حیران کر دے گی۔ اسے بھی معلوم ہو کہ وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اسی دن شام کو وہ کلوچ پر دراز ایک برانی فلم دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی چائے کا بولاک رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ مکمل کے ساتھ خرید ا ہوا میک اپ کا سامان لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگا۔ ابھی اسے میک اپ کرنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ روز بکاسا کر لیا کرے تو فرزام کے آنے تک سلیقے سے کرنا آئی جائے گی۔

چائے پیتے فلم دیکھتے اس نے آج خرید کر لائے میگزینز میں سے ایک کو میز پر سے اٹھالیا۔ یہ مقامی سطح پر شائع ہونے والا اردو میگزین تھا۔ نہ اسے فلم میں دلچسپی تھی نہ ہی فی الحال میگزین میں۔ اسے فرزام کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے فون کیا تو اس نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ”میں بھی کرتا ہوں۔“ کور پچھلے ڈیزائن گھنٹے سے اس کا بھی چل رہا تھا۔

میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کا ہاتھ ایک صفحے پر آکر ساکت ہو گیا۔ ٹی وی اسکرین پر ہیروئن رو رہی تھی چلا رہی تھی۔ لیکن اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیرے کا ایک گہرا سیلاب اس کی آنکھوں میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک بل کے

لیے تڑپ کر مر گئی۔ حسی اور سانس اکٹھے کرنے کا شعور احساس ہوا۔ وہ واش روم کی طرف بھاگی اور دروازہ کھولنے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ منہ صاف کر لیا۔ دوبارہ لاؤنج کی طرف آئی تو اس میگزین کو کھورے کے جو اس کے اس طرح اٹھ کر جانے پر کلوچ سے ہر گھبراہٹ ہوئی۔

اس میگزین میں عدن تھا۔ اس شخص پر نظر ڈالنے ہی نفرت سے ہی سہی اس کی سائیس اکٹھے کرنے لگیں۔ وہ پلٹ کر وہی افق بن گئی جو ڈی ایچ اے سے غلام علی غلام کے ہاتھوں سے اپنی عزت بچا کر نکلی تھی۔ جس کے گلے میں چادر جھول گئی تھی اور جو سڑک پر جانے پناہ کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اس شخص سے آئندہ اگر کبھی ملی تو وہ اس پر ہجو کر دے گی۔ لیکن اب وہ کانپ رہی تھی۔ یہ اس کا وہی تھا۔ جس پر وہ بہت پشیمان تھی۔ تھوڑی دیر وہ ایسے ہی کھڑی کارپٹ پر گرے عدن کو دیکھتی رہی سہرگٹا بڑھ کر میگزین کو اٹھالیا۔

”ایم بی بی ایس ڈاکٹر عدن غلام علی (پاکستان)“ اس تعارفی سطر کے نیچے مختصراً ”اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ درج تھا۔ یہ ایک آرٹیکل تھا جسے ایک مقامی مسلمان صحافی نے شائع کیا تھا۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھا۔ جنہیں بے گناہ یا بے حد معمول الزامات لگا کر سالوں سے جیلوں میں قید کر رکھا تھا۔ ان پر وہشت گردی کا شبہ کیا گیا تھا اور سالوں سے وہ شبہ نہ تو تصدیق میں بدل رہا تھا اور نہ ہی مخالفت میں۔ آرٹیکل میں کل بیس ایسے لوگوں کا ذکر مکمل تعارف اور تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا۔ باقی اعداد و شمار الگ سے تھے۔ افق نے آرٹیکل کو ایک بار پڑھا اور عدن کے ساتھ ہوئے واقعے کو تین بار۔

جب وہ بار بار اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو پڑھ رہی تھی تو شاید انجانے میں وہ اس کے باب کے ہاتھوں ہوئی اپنی بے عزتی کا بدلہ لے رہی تھی۔ لیکن

مرفی لیا بھی نہیں تھا۔ حیرت اور افسوس کی ایک تیز دھند اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک دم ایک ایسا کوری کھنٹی بن گئی۔ جس پر ”عدن“ بھی ڈوب جھڑپا تھا۔

اور مکمل بہت زور و شور سے بچنے لگی۔ اس بار وہ اتار چڑھی۔

”تم ٹھیک تو ہو افق؟“ مکمل نے چھوٹے ہی پوچھا تو عدن نے گہرا سانس لیا کہ اس نے یہی کیوں پوچھا۔

فرزام کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہیں۔ وہ کب سے فون کر رہا ہے۔

”میں واش روم میں تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ لاؤنج کی طرف واپس آتے وہ اور پریشان ہو گئی۔ اسے قریب ہی رکھے موبائل کے چھ بار بجنے پر بھی پتا ہی نہ چلا۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟

فرزام کو فون کیا۔ واش روم کا پتہ دیا۔ وہ بات اس سے کر رہی تھی۔ وہ کچھ میگزین کوری تھی۔

”ٹھیک کی ہوا افق؟“

”نہیں تو۔“ جواب کے درمیان ذرا سا وقفہ آیا۔

”تم آرام کرو۔ پھر بات ہوگی۔“ وہ ناراض نہیں ہوا تھا۔ اس کی عاتب دہائی پر خود ہی یقین کر لیا کہ وہ ٹھیک کی ہوگی۔

وہ اٹھی اور لپ ٹاپ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ عدن کی تفصیل میں اس کے وکیل کا ذکر بھی تھا اور بیان کی گئی تھی۔ سرج اچن سے اس نے بوشن کے وکیل کو عدن کے بارے میں پوچھا۔

”میں کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے عدن سے متعلق اس آرٹیکل کو کیوں پڑھا۔ فرزام کی کالز کو کیسے مس کر رہا تھا۔ اس کے وکیل کو کیوں ڈھونڈا۔ افسوس کی بات اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ سب اسی کے زیر اثر تھی۔ کیا تو تھا ہی نہیں کہ وہ عدن کی شکل بھی دیکھتا تھا۔

”میں جانتی تھی۔ اسلام آبادی۔ ایم۔ ایچ کے باغ میں بیٹھ کر اس نے دعا کی تھی کہ زندگی میں یہ شخص ایک بار تو ضرور اسے ملے۔ بے شک افق کے ہاتھ میں

کھٹکول ہو اور عدن کے ہاتھ میں خیرات۔ وہ اس شخص سے ضرور پوچھے گی کہ عزت سے چھوڑ دینے کے لیے تو اس نے خود کہہ دیا تھا۔ اسے دھوکا دے کر بھاگنے کی ضرورت کیا تھی؟

وکیل عبدالعزیز کا نمبر ملا یا۔

”محبت ماریہ سے کرنا تھا۔ شادی بھی اسی سے کی۔ دھوکے کے لیے افق ہی کیوں؟“ مکمل جاری تھی۔

”مگر وہ کبھی افق کی زندگی میں نہ آتا تو وہ اس کے گدھے باپ کے سامنے نہ جاتی۔“

”ملا میر عبدالعزیز اسپیکنگ۔ واٹ کین آئی کیل آپ ہیں؟“

”کیا وہ واقعی بے گناہ ہے؟“

”پہلے اپنا تعارف کروائیں لیڈی!“

”کیا وہ ہشت گرد ہے؟“

”آپ کا نام لیڈی۔“

”کتنی سزا ہوگی۔؟ رہا ہو گا بھی کہ نہیں۔؟ کیا وہ سچ دہشت گرد ہے؟“

”آر یو مس افق۔؟“

”مس افق۔ مس افق۔ مس افق۔“

فرزام کے فلیٹ میں اس فقرے کی بازگشت گونجنے لگی۔ فون افق کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ اسے کیسے جانتا تھا۔ سات سمندر پار۔ ایک انجانا شخص۔ جس سے آج اس کی پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ وہ اس کا نام لے رہا تھا۔

”آر یو دیر مس افق۔؟“ وہ یقین ہی کر بیٹھا تھا کہ وہ افق ہی ہے۔

خاموشی کا وقفہ جاری رہا۔

”آر یو اوکے۔؟“

آخر کار اس نے مری مری آواز میں ”طیس“ کہا۔

”آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”تو آپ مس افق ہی ہیں۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ پچھلے چار سالوں سے میں نے ایک ہی نام لاٹھوں

بار سنا ہے۔ افق۔ افق۔ افق۔ اسے کو میرے لیے دعا کرے۔ مجھے آزاد کروا لے۔ افق ملی؟ کہیں بچو۔

فون اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کی بیٹھی الگ ہو گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی چیخ کو روکنا چاہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ عدن تو دھوکے باز ہے۔ اسے تو اس پر تھوکتا ہے۔ اس کا گریبان پکڑتا ہے۔ پھر یہ سب اتنے سال وہ اسے یاد کرتا رہا ہے۔ اس کا نام لیتا رہا ہے۔

منہ پر ہاتھ رکھے وہ بیٹھی رہی۔ ذرا دیر بعد اس پاس ایسے دیکھنے لگی جیسے پینٹا نوٹ گیا ہو۔ یا اپنے میں ہو اور بلک بلک کر التجا کر رہی ہو کہ یہ خواب ہی ہو اور بس۔

”او خدا یا!“ اس نے سر کو تھام لیا۔ آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ اب یہ آنسو کس احساس کے تحت تھے۔ افق اس کا فیصلہ ابھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ فون کی بیٹھی اس میں واپس ڈال کر فون آن کیا۔ عبدالعزیز کا ایک میسج موجود تھا۔

”میرے آفس میں آکر ملیں۔“ ساتھ ہی آفس کا پتا بھی لکھا تھا۔ اس نے افق کو آفس میں آنے کے لیے کیوں کہا اور وہ کیوں جائے؟ کس لیے؟ وہ نہیں جائے گی۔ اسے نہیں جانا چاہیے۔ وہ کیوں نہ جائے؟ اسے کیوں نہیں جانا چاہیے؟

سوالات آگے پیچھے اس کے اندر باہر بن رہے تھے۔

نیلا کرتا، جینز اور جوگرز پہن کر بیک کو کندھے پر لٹکا کر وہ دروازے کو لاک لگا کر نیچے آگئی۔

افق نے عدن کا اعتبار کیا تھا۔ اس کی مدد لینے ڈی ایچ اے اس کے باپ کے پاس پہنچی تھی۔ یہ دو بڑی غلطیاں تھیں۔ لیکن اس بار وہ ایک فاش غلطی کرنے جا رہی تھی۔

”مجھے صرف تجس تھا۔ میں اس لیے یہاں آئی

ہوں۔“ وہ آگئی تھی۔ مگر اب پچھتا رہی تھی۔ اچھی بھلی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی بلا سے دہشت گردی سی۔

”آپ صرف تجس مٹانے کے لیے آئی ہیں۔ ایک کہنہ مشق وکیل نے اس کی بودی وکیل کو ہونے سے ایک طرف کر دیا۔

”یہ سچ ہے۔“ وہ اس کا طنز سمجھ گئی۔

”سچ کے بارے میں آپ بھی جانتی ہیں۔ لیکن آپ عدن کی مدد نہیں کریں گی۔“

”ہیں۔“ اس لفظ مدد کا تو اسے گمان بھی نہیں تو کہ اسے کہا جائے گا اور اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔

”آپ پلی خاتون ہیں۔ دراصل کوئی پہلا انسان ہے جو اس کیس کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہے۔“

”ان کی وائف۔“

”گن دونوں کی علیحدگی ہو چکی ہے۔“

”عدن کا خاندان؟“ وہ لفظ قادر استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”وہ یہاں نہیں آسکتے۔ اس کے قادر نے کوشش کی تھی۔ انہیں ویزا ہی نہیں دیا گیا۔“

قادر کے نام پر ایک آسمانی بجلی اس میں سے ہو کر گزری۔

”میری جب بھی اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ ”کیا افق ملی؟“ کہیں ملی گئی؟“ مس افق اسے آپ پر بہت یقین ہے کہ آپ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ آپ دوست ہیں اس کی۔“

افق نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ خاموش سا ہو گیا۔

”میں نے بہت سی این سی۔ اوز اور قانونی اداکار کو خطوط لکھے ہیں۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی تعلق نہیں ملا۔ اس کا کیس اتنی ست روی کا شکار ہے کہ اگر فیصلہ اس کے حق میں ہو بھی گیا تو سالوں لگ جائیں گے۔ آپ عدن کی مدد کریں گی مس افق؟“

پھر وہی سوال۔ افق بری طرح سے چڑ گئی۔ ”ہاں

نہیں۔“ آپ اس کی مدد کرنا نہیں چاہتیں۔؟“ اس نے اس کے پاس پہنچنے کی دھمکی کو دھوکہ لگایا تھا۔ اس کے پاس فون کیا تھا۔ اس کے آفس آگئی تھی اور اس کے پاس پر اٹا چڑ رہی تھی۔ ”ہاں نہ“ نہیں کر رہی تھی۔

”جس نفسیاتی کیفیت سے وہ گزر رہا ہے۔ اسے اس کے صرف آپ ہی اسے آزاد کروا سکتی ہیں۔ اس کی امید ہیں۔ اس کا یقین ہیں۔ اس کا نام ہے کہ آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔“

”افق کی آواز تیز ہو گئی۔

”ہیں نے کہا۔ آپ اس کے لیے دعا کریں گی۔“

”اللہ ہر بے گناہ پر رحم کرے۔“

”اس سے چھوٹی سی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن وہ دہشت گرد نہیں ہے۔“

”اللہ ہی ستر جانتا ہے۔“

”ابو جاتا ہے اسے بتانے کے لیے وہ خود زمین پر نہیں آتا۔ عدن کو ہی سچ اور جھوٹ ثابت کرنے کی کوششیں کرنی ہوتی ہیں۔“

”تو پھر آپ کا کام ہے۔“ مطلب افق نے انکار کیا۔

”آپ جس کام سے میرے پاس آئی ہیں؟“ بہت

وہ دونوں اس کے آفس میں ایک طرف رکھے

”اے اے۔“ وہ آکر وہاں بیٹھ کر یہ سوال سن کر پھر

”کیس؟“ اصرار سے پوچھا گیا کہ ثبوت دو کہ

”اس سوال اور انداز پر افق نے کوئی اور رد عمل نہیں

”آپ دونوں پاکستانی ہیں۔ مسلم ہیں۔ وہ آپ کو

کہتا ہے تو آپ بھی اسے جانتی ہوں گی۔ پاکستانی

کیونکہ میں سے کوئی اس کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا۔

آپ لوگوں میں مدد کرنے کا جذبہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس ایسے تین اور کمزور تھے۔ وقفے وقفے سے تینوں ختم ہو گئے۔ کیونٹی نے این جی اوز نے اس کی بہت مدد کی۔ کچھ اور بڑے نام سامنے آئے۔ دو کا تعلق تھا لیڈ سے تھا۔ ایک کا سربراہ ہے۔ کیا سب پاکستانی سو رہے ہیں؟ کیا سب مسلم سو رہے ہیں؟ کیا آپ دونوں میں اتنا سا تعلق بھی نہیں ہے کہ آپ۔“

”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ درمیان میں ہی بولی۔

”انسان تو ہیں آپ دونوں۔ تعلق نہیں ہے۔ انسانیت کا رشتہ تو ہے۔ سب سب سے وہ اڑیاں رگڑ رہا ہے۔ دوبار خود کشی کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی دورے پڑتے ہیں اسے۔ خود کو زخمی کر لیتا ہے۔ دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔ چلاتا ہے۔ روتا ہے۔ چند ہفتوں بعد زخمی ہو کر وہ اسپتال ضرور جاتا ہے اور اس پر بھی وہ جب مجھے ملتا ہے تو کیس کا نہیں آپ کا پوچھتا ہے۔ وہ اس المان کے بارے میں بات کرتا ہے جسے افق جانتی ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں تو کریں۔ شاید

تھوڑا ہی بہت ہو۔ اگر پاکستانی کیونٹی کو اس بارے میں بتا سکتی ہیں تو بتائیے۔ انہیں جگائیں۔ اس سانحے کو سب کی نظروں میں لائیں۔ انسانیت کے ناتے۔ رحم کے ناتے۔ چیرٹی ہی سمجھ کر خدا کے لیے۔“

افق یہ سب ایسے سن رہی تھی۔ جیسے اپنی کسی بیماری کے بارے میں ہدایات سن رہی ہو۔ ایسی بیماری جس کا اسے علاج کروانا ہی نہیں۔ رات بھر وہ خواب میں ڈوبتی رہی تھی۔ سالوں پہلے اس کی یہ حالت تب ہوئی تھی۔ جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

”اے اے۔“ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چینی ماریں اور دورے سی کیفیت میں آگئی تھی۔

ماہنامہ شعاع 10 نومبر 2013

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع 10 نومبر 2013

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ شعاع 10 نومبر 2013

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM

RSPK.PAKSOCIETY.COM

کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گھر میں باتھ روم میں جا کر اس نے اپنی چیخیں دیائی تھیں۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی تو خواب میں وہ دھاڑیں مارتی رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ماں بیٹے میں نہا گئیں۔ انکی انکی سانس لینے لگیں۔ اتنے نے باقی ماندہ چیزوں کا دم گھوٹ دیا۔ اس نے اپنی ماں کی حالت کو دیکھا اور لب سی لیے ورنہ جس طرح اس کے باپ کے مرنے پر اس کی پھوپھی نے بن ڈالے تھے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی بن ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی اگلی سسکی اس کی ماں کی جان لے لے لی۔ اس دن کے بعد سے اتنے اپنے وجود میں قید ہو گئی۔ کیا اسے قید کی سزا نہیں ہوئی تھی تب؟

اس کا جرم محبت تھا اور سزا کے نام پر اسے بہت کچھ بھگتنا پڑا تھا۔ محبت کے نام پر اس نے بھیا نک سزا کائی۔

”کیا آپ ہماری مدد کریں گی؟“ اس سے پھر پوچھا جا رہا تھا۔ وہ خود سے پوچھنے لگی کہ اسے اس کی مدد کیوں کرنی چاہیے۔ وہ اسے چھوڑ گیا۔ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کی مدد اس پر فرض نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی لاکھوں انسان اسی کی طرح ہیں۔ ہر شخص اپنے نصیب کے مطابق ہی دکھ اٹھاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے نصیب کے بیٹھے پھل اکیلے اکیلے کھاتا ہے۔ عدنان نام کا باب اس نے اپنی زندگی سے بھاڑ پھینکا ہے۔ اب وہ اس شخص کا نام بھی کہیں شامل کرنا نہیں چاہتی۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہیں۔ جس شخص نے سالوں آپ کا انتظار کیا۔ اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی۔“

”آپ اسے میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“

”ظاہر ہے۔ میں ایک مایوس شخص کو اور مایوس کیوں کروں گا؟“

اتنے وہاں سے اٹھ آئی اور بے مقصد سڑکوں پر چل قدمی کرتی رہی۔ وہ پھر کے کھانے کے لیے گئی اور آرڈر

دے کر اٹھ گئی۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھی، کھانا چلنا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ کہ وقت کر رہی تھی۔ بے مقصد گھومتے پھر رہی تھی۔ آگئی۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ دن میں صرف لے کر رہا تھا اور لب بھی کھانے کے بجائے وہ ڈھیر ہو گئی۔

دلغ میں آٹھ سالوں کے خاکے پرزے پرزے کر اڑ رہے تھے۔ جھپک جھپک سب آج رہا تھا۔ لینڈ لائن فون بجنے لگا۔ وہ گھنٹے سے وہ کالوں پر تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر اندر رہا تھا۔ کوئی لائن بھی اس نے روشن نہیں کی تھی۔

”تمہارا فون کیوں بند ہے؟“

”اوہ! چارج نہیں کیا تھا۔“

”تم ٹھیک ہو؟“

”بالکل۔“

”کہاں تھیں تم؟“

”میں سو رہی تھی۔“

”سارا دن سو رہی ہو؟ اس سے پہلے کہ تھیں؟“

”میں شائنگ کرنے گئی تھی۔“

”کیوں گئیں؟“ فرزام کو غصہ آ گیا۔

”کیوں نہ جانی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تمہیں میسج بھی کیا تھا اتنے! تم کیوں گئیں؟“

اس کی جھنجھلائی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ اب تو تم گھر میں ہی ہو۔“

بھابھی کے پاس چلی جانا۔ فارغ ہو کر ان ہی کے پاس چلی جایا کرو۔ پور نہیں ہوگی۔

”میں تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔“ اس نے پوچھا۔ نہیں کہ وہ اسے باہر جانے سے کیوں روک رہا تھا۔ اتنے نے موبائل آن کیا۔ وکیل کے آفس میں جانے سے پہلے اس نے خود ہی اسے بند کر دیا تھا۔ پاکستان سے یا فرزام کی کل نہ آجائے اور اس کے سے نکل جائے کہ وہ کہاں آئی ہے اور کس کے پاس اور کیوں ہے۔

دن میں جلد میں ڈر گیا۔ خواب تھا شاید۔ خواب مجھے یاد نہیں۔ لیکن اس خواب اور ڈر کا تعلق ہے۔ میں نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ کہیں کہیں کوئی نقصان نہ پہنچے والا ہو۔ میری تسلی کے لیے یہ اعتقاد سے رہنا گھر سے تو باہر جانا ہی نہ۔ عمل

اسی کے عمل جانا ہی۔

فرزام کا میسج پڑھ کر کل سے اب تک اسے پہلی بار کسی کی سانس آئی۔ اپنے شوہر کے اتنے فکر مند ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس میسج پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دلوں میں سب سے پیارا دل فرزام کا تھا اور اس دل کی مالک وہ تھی۔ اس نے عدنان کے خوف سے بچنے کے لیے اس کے لیے جوگ لے لینے کے ڈر سے فرزام سے شادی کی تھی۔ اور کون تھا جو فرزام کو پھر نہیں کرتا تھا اور وہ اسے سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس نے اس کا نفسیاتی علاج کیا تھا۔ اسے پر اعتماد کیا تھا۔ انسانی نے اسے سکھایا تھا کہ لوگوں سے ڈرنا مجھوڑ دے اور یونیورسٹی میں اس نے کسی بھی لڑکے سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے باتیں کرتے آتے تھے اور وہ بڑے طریقے سے انہیں سیر حارستہ دکھا رہی تھی۔

فرزام اس کی ذہنی تعمیر میں حصہ دار تھا۔ وہ اس کے لیے بڑے بڑے چھوٹے گھر کی ہونے پر اسے کچھ جتنا سن تھا۔ اس نے بھی بھول کر بھی عدنان کا نام اس کے لیے نہیں لیا تھا۔ دونوں کا بہت ہی خاص قریبی رشتہ تھا۔ وہ دونوں ہی اس خاص رشتے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بہت خاص تھے۔

فرزام گھر کے عمل کے پاس آگئی ڈر اسی کے ساتھ کہ وہ اسے باہر جانے سے کیوں روک رہا تھا۔ اتنے نے موبائل آن کیا۔ وکیل کے آفس میں جانے سے پہلے اس نے خود ہی اسے بند کر دیا تھا۔ پاکستان سے یا فرزام کی کل نہ آجائے اور اس کے سے نکل جائے کہ وہ کہاں آئی ہے اور کس کے پاس اور کیوں ہے۔

وہ کب سے ہفتہ کا ایونٹ بھی شاندار رہا۔ اور مجموعی

طور پر کافی منافع ہوا۔ اس کا اسکور اس بار بھی اچھا ہی تھا۔ سب کے لیے مشترکہ تالیاں بجوائی گئیں۔ فردا فردا ان کی تعریف کی گئی۔ مسٹر جین اس کے پاس بھی آئے۔ وہ پچاس پچپن سالہ چھ فٹ کے سفید قام امریکن تھے۔ سب سے ایسے بائیں کرتے۔ جیسے وہ ان کے شاگرد اور سامنے والا ان کا استاد محترم ہے۔ اتنی عاجزی تھی کہ سارا وجود ہی جھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں بھی۔

”کیا آپ کو امریکی جیلوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہاں کتنے بے گناہ لوگ قید ہیں؟“

وہ اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ اچانک سے ہی ان سے یہ سوال کر بیٹھی۔ مسٹر جین کی آنکھوں کا رنگ بدلا جیسے وہ جانتے تھے کہ یہ صرف ایک سوال نہیں ہوگا۔ مختلف ملکوں کے دوروں کے دوران ان سے ایسے سوال پوچھ ہی لیے جاتے تھے۔ خاص طور پر نوجوان تو ان کی جان کو آجاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ خود ایک امریکی ہیں اور کسی بھی گورے کو دیکھ کر انہیں لگتا ہے کہ یہ بھی گوانتانامو بے کے خالموں میں سے ایک ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس ڈھانچے کا حصہ تو ضرور ہی ہے اور اگر یہ بھی نہیں تو چلو وہ امریکی تو ہے نا جو اپنے علاوہ ہر مذہب اور قوم سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی این جی او کے فعال کارکن تھے جو تھرڈ ورلڈ کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ صرف انسانیت کے لیے کام کرتے تھے اور اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں تھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ گڑبڑائے اور مزید بحث سے بچنا چاہا۔

”آپ کی این جی او کو اس کے لیے بھی کام کرنا چاہیے۔“

”بہت سے امریکن بھی ان حالات کا شکار ہیں اور ایسے ہی جیلوں میں قید ہیں۔“ وہ دراصل یہ ایک نکتہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ صرف مسلمان ہی اس سب کا عتاب نہیں بنتے۔

”پھر آپ کو ان سب کے لیے کام کرنا چاہیے۔“

”بہت سے دوسرے ادارے اس پر کام کر رہے ہیں۔ ہم ان مسائل پر کام نہیں کرتے۔ ہماری این جی او کا یہ منشور نہیں ہے۔“

”میں آپ کے لیے اتنی محنت کر رہی ہوں مسٹر جین۔ آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔“ افق نے سنا ہی نہیں کہ مسٹر جین نے کیا وضاحت دی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی ماننا تھا کہ امریکی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تباہی بھی اور آباد کاری بھی۔

”آپ کے لیے کیا؟“ اس بات پر وہ اور الجھ گئے۔

افق کا مسٹر جین کو روک کر یہ سب کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ اس کے پاس آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھوڑا سا غصہ آگیا۔ اسے آرٹیکل میں موجود باقی لوگوں اور دوسرے اعداد و شمار کا خیال بھی آیا اسے ایک دم سے یہ لگا کہ اپنے کام کے لیے تو یہ امریکی اس سے کام لے رہے ہیں تو اس کے کام کے لیے کیا یہ آگے آئیں گے؟ یہ سب سوچتے وہ یہ بھول رہی تھی کہ تھرڈ ورلڈ میں پاکستان بھی شامل ہے اور پاکستان کے دہشت گردوں میں اسی این جی او کے کارکن ویکسین کی سپلائی کے لیے پہنچتے ہیں۔ مختلف انجکشن اور ڈراپس ان ہی کی طرف سے جاتے ہیں۔

اس نے انہیں ڈاکٹر عدنان کے بارے میں بتادیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔ دو دن بعد انہوں نے افق کو این جی او کے لیے اپنے رضا کار صحافی سے ملوایا۔ صحافی کا تعلق ایک بڑے میڈیا گروپ سے تھا اور وہ اس گروپ کے اخبار ”میزین“ اور ٹی وی کے لیے کام کرتا تھا۔ صحافی کی ملاقات اس نے عبدالعزیز سے کروادی۔ وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اگر وہ اس معاملے میں تھوڑا بہت شامل ہو ہی گئی تھی تو آگے نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس نے عبدالعزیز سے وعدہ لیا تھا کہ اس کا نام اور شناخت سامنے نہیں آئے گی۔ خاص طور پر عدنان کو اس بارے میں بالکل خبر نہیں ہونی چاہیے۔ عبدالعزیز کا خیال تھا کہ صحافی ان کی بہت مدد کر سکتا ہے اور وہ اس صحافی سے مل کر حقیقتاً بہت خوش ہوا تھا چند ہی ہفتوں بعد مسٹر جین

نے افق کو چند دوسری این جی او کی طرف بھیجا۔ انہیں افق کا کیا گیا نظریہ بہت برا لگا تھا۔ وہ بار بار اس کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں تو کریں گے۔ افق نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی اوز کے نمائندوں سے بھریات چیت کی۔

مسٹر جین کے ساتھ کی گئی حادثاتی بات چیت کا رگڑ ثابت ہو رہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے نہ نہ کرنا بھی افق اس سب میں اتنی شامل ہو گئی۔ این جی او کے نمائندوں نے وکیل سے ملاقات کی۔ اس نے کیس، مسٹری بل۔

”آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔“ عبدالعزیز اسے مہینے آیا۔ اس کا منہ بن گیا پڑھ کر اسے تعریف اچھی نہیں لگی۔ کاش وہ کبھی آفس میں نہ ہوتی اور نہیں تو اس نے وہ رسالہ ہی نہ خریدا ہوتا۔

عبدالعزیز کی براہ راست بات چیت این جی او سے ہونے لگی۔ اس نے عبدالعزیز سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس نے جتنے ریفرنس دینے تھے وہ دے چکے اب اسے پریشان نہ کیا جائے۔

آئندہ آنے والے چند اور ہفتوں میں ایک اور ہوا۔ صحافی اسکاٹ جو اس سارے معاملے کے لیے مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ اس نے دو سینئر ز اور ایک تازہ دان کے سامنے ایک لائیو ٹاک شو کے دوران اس مسئلے کو اٹھایا۔ عبدالعزیز کی طرح ایسے ہی کسز ہینڈل کرنے والے دوسرے وکلاء اور متاثرین کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ چند ڈاکو منزروں نے گئیں۔ صرف شبہ پر قید مجرموں کی بابت طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ ایسے شو وہاں آئے دن ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی نظروں سے ایسے واقعات چھپے ہوئے ہیں ان کو کم از کم اس طرح ان کے کانوں تک یہ خبر ضرور پہنچ جاتی ہے اسکاٹ نے اسی مسئلے پر ایک فیچر لکھا اور اس نے راست حکومتی اداروں پر تنقید کی۔ چند اخبارات نے سرے سے عدنان اور اس جیسے کسز کے بارے میں خبروں کو نمایاں جگہ دی۔ سالوں سے قید

لوگوں کو بہت ترس آیا۔ یہ ان جیلوں میں بند کسی لوگ کے لیے وسیلہ بن رہا تھا یا صرف عدنان کے لیے نہ قدرت کی ہر جانتی تھی۔ لیکن اس تھوڑی سی حرکت سے شاید کسی کو بہت فائدہ ہوئے والا تھا۔

این جی او کا ایک نمائندہ جا کر عدنان سے جیل میں ملا۔ اسی این جی او نے مختلف کمیونیسٹر کے لوگوں کو اکٹھا کر کے واک کا اہتمام کیا۔ افق کو بھی بلایا گیا۔ لیکن افق نہیں گئی۔ اب تو اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر ایسے کسز حل ہو جائیں تو منظر عام پر آ لایا جائے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور نہیں تو کوئی صحافی اسی کے پاس نہ آجائے انٹرویو لینے۔ روک رہے اگر کوئی اسے ایسے ہی دیکھ لیتا تو اسے یقین ہوتا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ”اچھا! وہ تم ہو جو عدنان کے لیے اتنا سب کر رہی ہو؟ کون ہے عدنان؟“

انہیں اس نے کچھ نہیں کیا۔ اگر کیا تو ترس کھا کر انسانیت کے ماتھے۔

پھر اسے جانے کیوں کھوکھلے قہقہے بلند ہوتے سنائی دیے۔ عدنان گزرے اسے عبدالعزیز کا فون آیا۔

”عدنان ٹھیک ہی کہتا تھا کہ افق ہی اسے آزاد کروا سکتی ہے۔“ وہ شاید اس کے تعاون کا اپنے الفاظ میں شکر ادا کر رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ تقریباً چلا اٹھی۔

”ای ایم سوری۔ آپ ناراض مت ہوں۔“

عبدالعزیز نے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ میں نے صرف آپ کے کہنے پر چند این جی او کو اس مسئلے کے بارے میں بتایا تھا۔ جو کچھ کیا ہے وہ آپ نے اور ان لوگوں نے کیا ہے۔ آپ پلیز مجھے بتائیے کہ میں نے آپ میرا نام سامنے لائیں۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں مس افق! آپ مجھے خلاف نہیں پائیں گی۔ چند اخبارات میرا

انٹرویو لے چکے ہیں۔ عدنان کے فادر سے میں نے فنڈز منگوائے ہیں۔ یہی صحیح موقع ہے کہ ان این جی او کو فنڈز دیے جائیں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ چند پاکستانیوں نے رابطے کیے ہیں مجھ سے۔ وہ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔“

”آپ مجھے دوبارہ فون نہیں کریں گے۔“ اس نے ساری تمیز تہذیب ایک طرف رکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

عبدالعزیز نے اپنا وعدہ پورا کیا اور دوبارہ فون نہیں کیا۔ ویک اپ کل دی جا چکی تھی۔ عدنان جیسے چندہ اور لوگوں کے کسز نکل آئے تھے۔ سوشل میڈیا ان کسز کے لیے زیادہ فعال تھا۔ باقاعدہ احتجاج کے چارے تھے۔ آئے دن نئی نئی خبریں سامنے آتی تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کے بیانات سامنے آتے تھے۔ ستر و قاری سے عدالت میں چلنے والے ان کسز نے کچھ رفتار بگڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

این جی او سے کیا گیا فنڈز ریزنگ کا معاہدہ مکمل ہوا اور اسے بہترین کارکردگی اور این جی او کا رکن بننے پر سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ جسے اس نے فریم کروا کر ریک پر سجالیا۔

فرزام نے ہفتہ بھر پہلے کلج میں اس کا آن لائن ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ اس نے چھ ماہ کے ڈیرا ٹنگ کورس کے لیے کلج جوائن کر لیا تھا۔ فرزام کے آنے تک اسے فارغ نہیں رہتا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہ کلج ہی میں ہوتی۔ وہاں سے اکثر اسٹور چلی جاتی۔ ایک پاکستانی اسٹور پر انہیں ایک سائڈ کارنر مل گیا تھا۔ ”چیز“ کا لیبل اس کارنر پر لگا دیا گیا۔ اس نے کارنر کی سہولت کر لی۔ دو دن بعد وہ وہاں کا چکر لگاتی تھی۔ رات کو وہ اپنے کلج کے اسائنمنٹ پر کام کرتی۔ ہلکی پھلکی مصروف زندگی جاری تھی۔ سب ٹھیک ہی تھا۔ اس کے پاس عبدالعزیز کا مہینے کا ایک کہ وہ اسے ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہے۔ افق کو یقین تھا کہ وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اسے یہی بتائے گا کہ عدل کا کیس ختم ہو گیا ہے۔ اسے خبر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کیس ختم ہوتا ہے یا وہ چند سال اور جیل میں رہتا ہے۔

عدل کے بارے میں پڑھتے اور جانتے ہی وہ تھوڑی جذباتی ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ مضبوط تھی۔ اس کے اعصاب قابو میں تھے۔ عدل کتنا بھی بے گناہ تھا۔ لیکن اس کے لیے وہ دھوکے باز ہی تھا اتنے سال اگر وہ اسے یاد کرتا رہا ہے تو "شاید ڈوبے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق وہ افق کا سہارا لیتا رہا ہے۔ ماضی میں وہ اسے دعاؤں کے لیے کہتا رہا تھا اور اس کا عقیدہ بن چکا تھا کہ صرف افق کی ہی ہر دعا قبول ہوتی ہے اور ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔ اس طرح کی قید میں رہ کر کوئی بھی ایسے سارے ڈھونڈ سکتا ہے۔ ایسے وقتوں میں ایسے افراد کو پھر ماضی ہی یاد آتا ہے۔ پھر وہ ان ہی لوگوں کو یاد کرتے ہیں جو اچھے تھے، مخلص تھے۔ ایسے افراد کو دھوکا دیا جاسکتا ہے بھلایا نہیں جاسکتا۔ وقت کا دھار ابد لے لے ہی ایسے مخلص لوگ تھر کر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ افق نے اس سب پر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ عدل کے ساتھ جو ہوا وہ افق کے ساتھ برا کرنے کی سزا ہے۔ افق اتنے پارے دل کی تھی کہ اس نے یہ سوچا ہی نہیں۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے اندر سے اس شخص کی سب باقیات نکال پھینک رہی تھی۔

"عدل آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" عزیز کی آواز گونجی۔ فون پھسل کر اس کی گود میں آگرا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی فون کر لیا۔

"کیسے؟ آپ نے اپنا وعدہ توڑا؟"

"ہاں جی اوکا جو نمائندہ اس سے جیل ملنے گیا تھا۔ اسی نے ذکر کیا آپ کا۔ اس بار میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ آپ کا بہت شدت سے پوچھ رہا تھا۔ میں خاموش ہی رہا اور لا علمی ظاہر کی۔ لیکن کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے سختی سے کہا۔

"اوکے! میں نے آپ کو مطلع کر دیا ہے اس بارے میں۔" جواب دیے بنا اس نے فون بند کر دیا۔ بے

چینی گھبراہٹ میں بدل گئی۔ اس شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ یہاں ہے۔ اس کے لیے یہ سب افق نے کیا۔ افق جو یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ وہ اسے اب دیکھ بھی نہیں چاہتی۔ اب وہ شخص اس سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت کوشش کی اس نے کہ اسٹانمنٹ پر کام کرے۔ لیکن نہیں کر سکی۔ فرزام رات دن کر کے تھک جاتا تھا۔ وہ سو رہا ہو گا۔ ورنہ وہ اسے فون کر لیتی۔ اگر وہ سو رہا ہوتا تو اس وقت آن لائن ہی ہوتا۔ اٹھ کر نمل کے پاس آگئی۔ وہ ایک انگلش فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ نمل نے قریب رکھی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"کچھ اور لاؤں؟"

"نہیں۔" کہہ کر اس نے برا کا ایک پیس اٹھالیا۔

"شریٹن ہو؟" فلم کی ہیروئن کی لپ اسٹک پر نظر رکھ کر نمل نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"فرزام کو یاد کر رہی ہو؟" اس سوال پر وہ صرف مسکرائی۔

"فرزام سے کہو، ایک چکر لگا جائے۔ اتنا مصروف ہے کیا وہ؟" نمل کی نظریں اب بھی اسکرین پر ہی جمی تھیں۔

"بہت مصروف ہیں۔ ویک اینڈز میں بھی کام کر رہے ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے جلد ہی فارغ ہو کر آجائے گا۔"

یہ تو فرزام بھی اس سے کہتا تھا کہ رات دن دس لوگوں کی ٹیم کام کر رہی ہے۔ چھ مہینے کے اندر اندر کام کو مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ سوفٹ ویئر میں ٹیکنیکی خرابیاں جانچیں گے۔ پھر اسے اپلائی کیا جائے گا۔ مارکیٹ میں لایا جائے گا۔ اب جب وہ اس سے آن لائن باتیں کرتا تو چھوٹے چھوٹے جملے بنا جھجکے کہہ دیتا۔ وہ اسے بہت یاد آتی ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور کبھی کبھی اتنا کہ وہ کمانڈر لکھنے کے بجائے اس کا نام لکھ دیتا ہے۔ اب اسے یاد کرتے ہوئے سوتا ہے اور یاد کرتے ہوئے اٹھتا

ہے۔ مزید اسے دو عدد پر چاہئیں کہ کینیڈا سے پرواز کر کے وہ اس کے پاس آجایا کرے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ کینیڈا کے ساتھ معاہدہ چرا کر بھاڑ کر چھینک دے۔ ایک دن وہ لپ لپ پر ذرا آگے کو جھکا اور وہ انگلیاں باسکرین پر رکھیں۔

"میں تمہاری ٹاک کو پکڑ کر ایسے ایسے کرنا چاہتا ہوں۔" انگلیاں دائیں بائیں ہوتیں "اور پھر تمہاری رٹھوڑی کو ایسے پکڑ کر چرے کو اوپر اٹھانا چاہتا ہوں۔" جانتے ہی نشو سے لپ ٹاپ کی اسکرین صاف کی۔

"سب گلابی گلابی کیوں ہو رہا ہے۔"

وہ اسی اور گلابی ہو گئی۔

"اتم بہت خوب صورت ہو۔" ٹھہر کر سرگوشی کی۔

اس نے اولے ٹھوڑی کے نیچے بایاں ہاتھ نکالیا۔

"تمہاری آنکھیں جب ذرا سا جھک کر اٹھتی ہیں اور میری آنکھوں سے ملنا نہیں چاہئیں۔ اس پاس سے بچ کر نکل جاتی ہیں تو کمال لگتی ہیں۔ ہاں۔ بالکل ایسے ہی۔"

نشو نے پھر اسکرین صاف ہونے لگی۔

بانی کا وقت وہ ان باتوں کو بار بار سوچ سوچ کر گلابی ہوئی رہتی اور پھر اس کا جی چاہتا کہ فرزام ایسی ہی باتیں کرنا جائے بس۔ بلکہ وہ دونوں ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہیں۔ خوش ہونے کے سامان پیدا کرتے ہیں اور محبت کی طرف بڑھتے ہی جاتیں۔ نمل کے ساتھ فلم دیکھتے دیکھتے وہ اونگھنے لگی تو اپنے گھر میں آکر سو گئی۔ فرزام کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ ایسے ہی کسی خیمہ میں چلی جاتی۔ نعمت ہوتے ہیں وہ تعلق وہ رشتے جو ٹھیک ٹھیک کر سلا دیتے ہیں۔ سکون کی خیمہ کا باعث بنتے ہیں۔ والدین کی آغوش میں بچے ایسے ہی محبت سے گھیس سو جاتے۔ اور ایسے تعلق جو خیمہ بنیں۔

کلیں میں اس کی دو تین اچھی دوستیں بن گئی تھیں۔ انہیں چڑکی کلکیشن دکھانے اسٹور بھی لے گئی۔

وہ سب اس بات پر کافی حیران ہوئیں کہ وہ پہلے سے ہی زندگی میں اپنی کامیاب ہے۔ اس کامیابی کے لیے افق نے کافی پارٹنر بنائے تھے اور کامیاب ہونے کے لیے پارٹنر بنل لینے چاہئیں۔ محنت اور کام سے گھبراتا نہیں چاہیے۔

ان ہی دوستوں کے ساتھ وہ کبھی کبھار سیر کے لیے بھی چلی جاتی تھی۔ وہ لوگ اکٹھے خریداری بھی کر لیتے تھے کافی پیتے تھے، آکس کریم کھاتے تھے اسٹانمنٹ میں ایک دو سرے کی مدد کرتے اور فون پر گپ شپ لگا لیتے تھے۔

کلج سے نکل کر وہ سڑک پر آئی۔ اسے بس اسٹاپ تک پیدل جانا تھا۔ اسے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی وہ آرام آرام سے چل رہی تھی۔ اکثر وہ راستے میں آنے والے ایک ہندوستانی ریٹورنٹ سے لچ کر لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ اس کے مزاج اور بھوک پر تھا کہ وہ ریٹورنٹ سے لچ کر لے یا گھر جا کر نمل کے ساتھ۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ سوچ رہی تھی کہ ایک دم سے کسی نے پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ تیز تیز پیدل چلتے راہ گیر بھی رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"یہ میں ہوں۔" فرزام اس کے سامنے آیا۔ ریٹورنٹ کا دروازہ کھولے ایک امریکی کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ "سب ٹھیک ہے؟"

"سارے سربراہ کا مزا خراب کر دیا تم نے۔" فرزام بری طرح سے شرمندہ ہوا۔ "کلج سے آرہی ہو یا کوئی ہارر مووی دیکھ کر۔"

اس کے اوسان اور سانس بحال ہوئی جیسے "وہ اتو یہ تم ہو"

وہ اپنی جگہ پر بہت شرمندہ ہوئی۔ رات سے ہی ڈری ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے باہر۔ کھڑکی سے باہر۔ کوئی کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ کلج آتے ہوئے کوئی پیچھے آتے محسوس ہو رہا تھا کئی دنوں سے ایسے ہی چل رہا تھا۔ فرزام کو دیکھ کر خوش بھی نہیں ہو سکی۔ چہرے

سے کشمکش ہی نمایاں تھی۔
 ”مجھے لگا کہ خوشی سے تم مجھ سے لپٹ جاؤ گی۔ تم نے تو سب کو ہی چونکا دیا۔“ اس کا اشارہ راہ گیروں کی طرف تھا۔
 ”میں ڈر گئی تھی۔ میں حیران بھی ہوئی ہوں۔“ اس نے بات کو سنبھالا۔
 ”بہر حال میں بہت ناراض ہوں اب۔“ ہاتھ سینے پر باندھ کر فوجی مارچ کے سے انداز میں وہ آگے آگے چلنے لگا تیز تیز۔
 ”میں منلوں گی۔“ وہ پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ آئے گی۔

وہ منہ پھلائے چلتا ہی رہا۔ تیز سے تیز ہوتا گیا۔
 ”پلیز روکو۔“ ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے وہ ہانپنے لگی۔
 وہ اور تیز ہو گیا۔ اب وہ تقریباً ”بھاگتی ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔
 ”آئی ایم سوری۔“ دونوں کلن پکڑ کر بے چاری سی صورت بنا کر کہا۔
 فرزام نے اس کی ناک پکڑ لی اور دائیں بائیں نور نور سے جھٹکے دیئے لگا۔
 ”آہ مجھے درد ہو رہا ہے مسٹر۔“
 ”اس ہولناک چیخ سے میں بھی ڈر گیا تھا میڈم!“
 ناک بدستور دائیں بائیں ہلائی جا رہی تھی۔ کان بدستور پکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک فریم میں اچھی تصویر بنا رہے تھے۔

فرزام جمعہ کو آیا تھا اور دونوں رہ کر چلا گیا اس بار افق کا جی چاہا کہ اسے واقعی میں نہ جانے دے۔ اسے پکڑ کر گھر میں لاک کر دے اور خود بھی لاک ہو جائے۔ لیکن وہ صرف اس سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اب بھی ملنے کے لیے نہ آتا تو یقیناً ”اس کا دم نکل جاتا۔“
 ”چند ہفتوں کا ہی کام رہ گیا ہے۔ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ خیر ایسا سربراہ تو تمہیں اب نہیں دلوں

گا۔ بس تم تیار رہنا۔ ساری خریداری کر لیتا اپنی باہم مل کر کر لیں گے۔ بہت اچھے پیسے مل رہے ہیں مجھے بہت کچھ لے کر دے سکتا ہوں تمہیں۔ چاہو تو فرسٹ بنالیتا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چیزیں لکھتا۔ انکار نہیں کروں گا۔ دونوں ماؤں کو پہلے سے ہی پیسے بھجوا دیے ہیں اور تمہارے بزنس میں بھی پیسے انویسٹ کر دیے۔
 جاب کا کنٹریکٹ سائن کرتے ہی تمہیں امریکا میں یا جہاں تم کوئی ایک اسٹور لے دوں گا۔ وہی کیسا رہے گا؟ برطانیہ جانے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا ہے اب میں برطانیہ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اسے مجھ جیسا قاتل لڑکا نہیں ملنا چاہیے۔ عارضی شہری کے طور پر بھی نہیں۔ کیا معلوم وہ مجھے ہتھیار ہی لے۔ مجھ سے کہے کہ شہریت لے لو یہاں کی۔ لیکن میں انکار کر دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ کمپنی مجھے ساؤتھ ایشیا ہی بھیجے گی۔ میں اؤکے ہوں۔ وہ مجھے جہاں بھی بھیج دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“
 ”میں بھی اؤکے ہوں۔“
 ”مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔“
 ”یہاں سے سن کر یہاں سے نکال دی۔“ اس نے دائیں سے بائیں کان کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تم پریشان ہو افق؟“ وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن اسے لگا کہ وہ خود پر پردے ڈال رہی ہے۔
 ”ایسا کیوں ہو گا بھلا؟“ جواب نہیں دیا۔ سوال کر لیا الٹا کہ سوال کا جواب کیا دیتی۔ خوف نام کی ایک بیل اس کے اندر پھولتی پھولتی ہر شے سے لپٹی جا رہی تھی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ پردے ڈال رہی ہے۔ ہنسی اور مسکراہٹ کے اگر وہ یہ پردے ہٹا لیتی تو فرزام اس سے کئی سوال کرتا۔ ہر سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس اور اگر ہر سوال کا جواب دے بھی دیتی تو شاید فرزام کی تسلی نہ ہوتی اور ان دونوں میں کچھ نہ کچھ ضرور بڑبڑاتا۔ اس نے خود کو روکے رکھا اور اس سے کہا نہیں کہ کانٹریکٹ کو چر کر پھاڑ آؤ اور آؤ! بھاگ چلتے ہیں امریکا سے راتوں رات اور پاکستان چل کر آنا

نہیں گزارتے ہیں۔ آؤ! ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ لیکن یہ کہ تمہیں سکی اور فرزام اکیلا ہی واپس چلا جائے۔ لیکن واقعی صرف چند ہفتوں کے لیے۔ وہ اسے لینے اور پورٹ گئی۔ رات کو فرزام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بازو میں دیا اور دونوں نیو بری (New Bury) آگئے۔
 فرزام بہت خوش تھا۔ جیسے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہو۔ جیسے طویل محنت کے بعد اسکول کے بچے امتحان سے فارغ ہوتے ہیں اور جیسے ایک بے انتظار کے بعد کوئی خاص دن آتا ہے۔ آخر آئی جاتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ افق نے فرسٹ نہیں بنائی تھی۔ اچھا ہی کیا تھا کہ نہیں بنائی کیونکہ تا فرسٹ کے ہی وہ اتنا سب کچھ لے رہا تھا۔ اس نے اس سے جس فرکوٹ کا وعدہ کیا تھا ایک بڑے اسٹور سے وہ فرکوٹ لے رہا تھا۔
 ”جس فرکوٹ کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔“ ساتھ ساتھ لے رہا تھا۔
 وہ بار بار اس کی پسند کے کوٹ پہن پہن کر دیکھتی رہتی۔ خواہ اسے اس پر اچھا لگا وہ اس نے لے لیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں ہاتھوں میں طرح طرح کے بولڈنگ بگ بگ پکڑا پکڑا کر بگ بگ پسند کیے۔ بڑے بڑے شلڈر بگ بگ الگ سے لیے۔ اس وقت اس کا خریداری کا تجربہ اچھے اچھوں کو اتار دے سکتا تھا۔
 ”مگر جس میں مجھے کسی نے یہ کہہ دیا کہ میری کھوپڑی اتار دے۔ میں نے تو میں اس کا جبر اتار دوں گا۔ کیا تم جانتی ہو کہ میری وہاں کسی سے ایسے لڑائی ہو؟“ وہ انتہائی سنجیدگی سے سوال کر رہا تھا۔
 ”میں نے ایک روپے کسی کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے۔“
 ”تمہارے وعدے اس نے خود ہی کیے تھے اور تمہارے وعدے وہ یاد سے خود ہی پورے کر رہا تھا۔ اس کے پاس واقعی بہت پیسے آگئے تھے۔ افق نے اسے اپنا کریڈٹ کارڈ دیا تھا۔ لیکن اس نے اس کا بیک کھول کر اس میں سے چند ڈالر نکال لیے۔

”تمہاری طرف سے فی الحال آؤں کریم کھا لیتے ہیں۔“
 وہ ڈبل ڈیک آؤں کریم لے آیا۔ آؤں کریم اتنی بڑی تھی کہ وہ دونوں پندرہ منٹ سے اسے کھا رہے تھے۔ شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے نیو بری کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔
 ”تم ہمیں کھڑی رہنا۔ میں ابھی آیا۔ دیکھو! میرے پیچھے نہ آنا۔ اگر تم میرے پیچھے آؤ گے تو مجھے دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں تو میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان سڑک کے عین وسط میں بیچ بیچ زمین پر پھیل کر روئے لگوں گا۔“
 رش میں اسے ایک طرف کھڑا کر کے وہ کہہ کر اسے اپنی طرف سے الٹی طرف گھما کر اس کے پیچھے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں افق فوراً پٹی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑی جیولری شاپ میں جا رہا تھا۔ وہ مسکراتے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے ایک عدد انگوٹھی لینے جا رہا ہے۔ ایک ایسی انگوٹھی کا نہ اس نے وعدہ کیا تھا نہ ہی تذکرہ۔ وہ اسے پروپوز کرے گا۔ پروپوز کرنے کا بھی اس نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی اسے خواہش تو بہت ہوگی۔ پرانی انارکلی میں وہ اس سے شادی کا کہہ رہا تھا۔ اب وہ اس سے اپنی محبت کا کہہ گا۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ بتائے گا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔
 نیو بری کی پر رونق سڑکوں کی رونق مزید بڑھ گئی۔ رات کی چکا چوند میں اضافہ ہو گیا۔ گہما گہمی بڑھنے لگی۔ دو روز بیک بڑی بڑی دکانوں اور اسٹورز پر لگے بورڈز اور جگمگانے لگے۔ اپنی مام ڈیڈ کے ہاتھ پکڑے پارپ کارن آؤں کریم کھاتے مسکراتے بچے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نو جوان لڑکے لڑکیاں۔ یہ سب افق کو بہت اچھا لگا۔
 ”فرزام اس کے لیے انگوٹھی لینے گیا ہے۔“
 چند دنوں سے وہ چٹنی پریشان تھی۔ وہ پریشانی جاتی رہی۔ وہ افق سے صرف مسر فرزام بن گئی۔ ایک

عرے سے اس کی زندگی مستحکم تھی۔ لیکن اب وہ وقت تھا جب وہ بے حد خوش تھی۔ ایک عورت کو اپنی زندگی میں ہر مل اس ایک لمحے کا انتظار ضرور ہوتا ہے جب کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اس کے دل پر اس کا راج ہے اور وہ اس راج میں غلام بننے کے لیے بخوشی تیار ہے۔ اس گھٹنے ٹیک غلام پر خود کو لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ اسے اپنا سردار اپنے سر کا تاج پہننے کو جی چاہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر راج کرتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہو جاتے ہیں۔

ان گئے سالوں میں وہ فرزام سے متاثر ہوئی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ ہیرے کے دل والا تھا اور اس ہیرے کے دل میں اس نے اپنی تصویر دیکھ لی تھی۔ وہ دنیا میں سب سے پیارا تھا اور وہ اسے بھی سب سے زیادہ پیارا تھا۔

سڑک کے ایک طرف کنارے پر کھڑے افق یہ اعلان کرنے کے لیے تیار تھی کہ انسانوں میں ایک بے حد پیارے انسان "فرزام" سے وہ محبت کرتی ہے اور بے حد کرتی ہے۔ کرتی رہے گی اور کیے بنا رہے گی نہیں۔ اس اعلان کو کرتے وہ جھجکے گی نہیں۔ وہ وہاں سے گزرتے ہر شخص کو روک روک کر یہ بتا رہی تھی کہ وہ کتنی خوش قسمت ہوں۔ تم سب کتنے بد نصیب ہو۔ فرزام صرف میرے پاس ہے اور تم سب اس جیسے کے بغیر ہو۔ وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ وہ صرف میرا ہے۔ اب وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ آکس کریم والے کو بیگ میں سے نکال کر بہت سارے ڈالرز پکڑا دے اور کہے کہ سب میں ساری آکس کریم مفت بانٹ دے۔ سب کو آکس کریم ملنی چاہیے۔ سب کو مسکراتا چاہیے۔ اس پاس سے گزرتے لوگوں کو چاہیے کہ اسے "فراد" "فراد" مبارک باد دیں۔ سب اکٹھے ہو کر اسے چیر کر دیں۔ مل کر تالیاں بجا دیں اس کے لیے کوئی محبت بھر لوک گیت گائیں۔ ہر تہوار کی آمد کا جشن منایا جاتا ہے۔ محبت کی وقوع پذیری کا جشن بھی شہن سے منایا جاتا چاہیے۔ اس

جشن میں باقی سب جشنوں کو مات دے دینی چاہیے۔ محبت کی دھنک ابھر کر جب سامنے آتی ہے تو اس کے ساتھ جھول کر پڑنے لگے کوئی جی چاہتا ہے۔ خودی کے رقص ایسے ہی نہیں ہو جاتے۔ یہ واقعہ صرف محبت ہی واقع کرتی ہے۔ وہ عشق حقیقی ہوا مجازی جھوم جلنے کو دونوں میں ہی جی چاہتا ہے۔ نشو سے ہونٹ صاف کر کے افق چند قدم چل کر اس شاپ کی طرف گئی۔ جس طرف فرزام گیا تھا لیکن وہ اسے باہر نکلا نظر آیا۔

"کیوں آرہی تھیں میرے پیچھے؟" وہ خفا ہوا۔

"میں کب تک اکیلی کھڑی رہتی آخر؟"

"تھوڑی سی دیر تم اکیلی نہیں رہ سکتیں؟"

"نہ نہ۔" اس نے ساتھ تیزی سے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ فرزام کے ہاتھ میں کوئی شاپنگ بیگ نہیں تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھی اسے ہی پکڑا گیا تھا۔ انگوٹھی پھر یقیناً اس کے کوٹ کی جیب میں ہو گئی۔ افق نے نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لیا اس نے بازو اس کی کمر میں حائل کیا اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے؟" یہ سوال ایسے تھا۔ جیسے کیا ایک اور آکس کریم کھانی ہے۔ وہ اسے انتظار کروانا چاہتا تھا۔ ابھی یہ مرد گھٹنے ٹیکنے میں وقت لے گا۔

"ہاں! فوراً! کمال۔" جو اندر سے لائے ہو۔

"کہاں اندر سے؟" اس نے ذرا سی گردن تھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو کچھ نہیں لیا دیکھو! میرے ہاتھ فلاں ہیں۔" دونوں ہاتھ آگے کیے۔

"کوٹ کی جیب میں ہو گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ اس نے دائیں طرف کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی باہر نکلا۔ پھر بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی ہاتھ آگے کیا۔

"کچھ ہے ہی نہیں۔" مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

فرزام نے کہا۔ "کوٹ کا دایاں کونا اٹھا کر اس نے کمال۔"

فرزام کا ہاتھ اندر گیا۔ "آں۔ چلو! دیکھتے ہیں۔"

کچھ لمبی نہیں رہا۔

"وہ اس میں کچھ کھولے اسے۔"

"نہ نہ! افق! یہ خالی ہو تو وہاں سب کے درمیان نیچے بیٹھ کر میں دیکھوں گی۔"

"چھ! پھر ذرا آنکھیں بند کرو۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بھیڑ میں سے نکال کر ایک طرف کونے میں لے گیا۔ دونوں آنسو سامنے کھڑے تھے۔ ذرا دور ایک بیچ پر ایک درمیانی عمر کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کا انداز اور مسکراہٹ ایسی تھی کہ افق اور فرزام کی طرف ایسے ہی دیکھنے لگے۔ افق نے آنکھیں بند کر لیں اور بند کی ہی تھیں کہ تڑپ کر کھولیں اور بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹیں۔ جبکہ فرزام تو سامنے کھڑا تھا۔ مٹھی اس نے گھول لی تھی انگوٹھے اور شہادت کی انگلیوں میں انگوٹھی پکڑ لی تھی۔

"افق! یہی آواز سے وہ پیچھے دیکھنے لگی۔"

اس کی بد قسمتی اس کی فاش غلطی پیچھے کھڑی تھی۔

"تم آئی کیوں نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ "شام پانچ بجے کا وقت ہے۔ رکھا تھا۔ اب دس بجے رہے ہیں۔"

فرزام نے انگوٹھی کو مٹھی میں ہی بچھ کر فرزام دو قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر آکر کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نظر افق کو دیکھا۔ وہ اس وقت چکرا کر گرنے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ "تمہیں میں بعد میں پوچھتا ہوں۔"

فرزام نے ان سے تعارف کرواؤ۔ تمہارے کزن ہی ہیں۔ میں اپنا تعارف خود ہی کروا رہا ہوں۔ آئی ام ڈاکٹر عدنان غلام علی۔ آپ کہہ سکتے ہیں افق کا

اتفاق اس نے آگے کیا جسے تھا نہیں کیا۔ فرزام

افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتفاق عدنان کے آس پاس پھلے اندر میرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افق کو گئی بن گئی اور فرزام ہرا ہونے کے قریب تھا۔

"افق کا امان" فقرے کی باز گشت بہت جان لیوا تھی اور یہ باز گشت تھم ہی نہیں رہی تھی۔ کینیڈا میں ترتیب دیے گئے سارے جملے اس باز گشت کے محور میں جا پھنسے۔

"ایک ہفتہ پہلے مجھے یہ ملی تھیں۔ آج کے دن کا وعدہ کیا تھا دوبارہ ملنے کا۔ یہیں قریب میں ہی ایک ہوٹل ہے۔ میں کافی دیر سے وہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں تو یہ آئیں نہیں یہاں نظر آئیں۔ میرے رہا ہونے کو سیلبرٹ کرنا تھا۔ سب اتفاق کی وجہ سے ہی ہوا۔ ورنہ میں ابھی تک جیل میں ہی ہوتا۔"

افق نے فرزام کا بازو کھینچا۔ "چلیے! گھر چلتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے افق؟" فرزام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ چون رہا تھا اس کے بعد لگتا تھا کہ اگلا کچھ سنا ہی نہیں دے گا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" افق بمشکل کہہ سکی۔ سامنے کھڑا عدنان مسکرایا۔ "یہ کریڈٹ لینا ہی نہیں چاہتی۔ میں نے ٹیبل صرف دو لوگوں کے لیے ہی بک کر والی ہے۔ ورنہ میں آپ کو بھی ضرور انوائٹ کرنا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہوں گے۔" وہ فرزام کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ آخر میں گھٹیا انداز سے آنکھ ماری۔

شریف بیویوں کے شریف شوہر سر راہ ایسے الفاظ اور ایسے گھٹیا انداز پر گریبان پکڑ لیا کرتے ہیں۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" پھر سے یہی سوال سختی سے کہا گیا۔

"چلیے گھر پلیز۔" افق اس کا کوٹ کھینچ رہی تھی۔

"یہ مجھے بلا وجہ تنگ کر رہا ہے۔"

"میں تنگ کر رہا ہوں۔" وہ ہنسلا۔ "تم ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ ابھی چند دن پہلے تو تم مجھ سے ملی

اسٹورز کی چین نظر آرہی تھی۔ غلام علی غلام کو اتنا کے ذاتی طیارے کے مالک ہونے کا غور توڑتا تھا انہیں اس شخص آغا سے شدید نفرت تھی۔ اس شخص نے ہمیشہ انہیں ہرمیدان میں پیچھے چھوڑا تھا۔ کمینہ عیاش "لو" بے غیرت۔ وہ اسے بہت سے ناموں سے یاد کرتے۔ لاس ویگاس میں وہ جا جا کر کیا کرتا ہے۔ ایک دن غلام علی نے بہت رازداری سے ازبک بیوی کے کان بھرنے چاہے وہ پہلے تو اپنے شوہر کی طرح سنتی رہی۔

"وہ ایک ماہر جواری ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ باقی کی معلومات مجھے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہیں۔" مطلب آئندہ اپنی بکو اس بند ہی رکھنا۔ تب اسے ماریہ جنت نظیر نظر آئی تھی۔ جو حور بھی تھی اور ایک دنیاوی جنت کی مالک بھی۔ تب کیوں سب ٹھیک لگتا تھا؟ اب سب کیوں برا لگ رہا ہے؟ عدن یہ بات نہیں جان سکا۔ وہاں وہ دن رات ایک ہی کلام کرتا۔ "وہ افق کو یاد کرتا" ان دنوں اس پر افق کی محبت کا بھوت بری طرح سے طاری ہو گیا۔ اسے اس کے نام کے دورے پڑتے۔

وہ بھی تانے بانے بنا رہا تھا کہ اگر وہ آج یہاں نہ ہوتا تو ایک گھر میں افق کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔ اس کے بچے ہوتے۔ بے حد محبت کرنے والی بیوی ہوتی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ زندگی میں ان دو چیزوں کے علاوہ کسی تیسری کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ "سکون اور محبت"

اسے یاد آتا تھا کہ وہ اس سے کتنی بے لوث محبت کرتی تھی۔ ایسی محبت جو کچھ مانگتی نہیں پڑے سب دیتی ہے۔

"آئی اچھی پلاننگ میں یہ سب کیسے ہو گیا۔" وہ اپنے بل لہچا۔ جب سب افق کے ساتھ سارے منصوبے بنا چکا تھا تو وہ سب کیوں نہ مضبوط رہا۔

اتنے سالوں میں غلام علی نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ آسٹریلیا میں پڑھنے والا اس کا چھوٹا بھائی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تباہ ہو چکی تھی۔

غلام علی کے پیسے کے کنوئیں خالی ہو رہے تھے۔ ان گزرے سالوں میں ان کی کمزوری چکی تھی۔ فیکٹریاں نقصان میں ہی جاری تھیں۔ قرضوں کی قسطوں کی ادائیگہ ہو سکی۔ سو دور سو بڑھ گیا۔ یہ کھیل غلام علی کے ہاتھوں سے نکل گیا اور دونوں فیکٹریاں بینک نے ضبط کر لیں۔ جس فیکٹری میں آگ لگی تھی اس سمیت بینک نے فیکٹریاں غلام کر دیں۔ غلام علی کے پاس ایک چھوٹی تین کینال کی فیکٹری ہی بچی تھی۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ مریدین چلاتے چلاتے سا نیکل پر آگئے ہوں۔ لاہور ڈی ایچ اے کا بنگلہ بھی بک چکا تھا۔ سیالکوٹ کا گھر ہی بچا تھا۔ فارم ہاؤس پر بھی مزید قرضہ لے لیا گیا تھا۔

غلام علی چاہتے تھے کہ بس وہ جلد سے جلد واپس آجائے۔ اب بھی وہ اسے ایک چھوٹا سا اسپتال تو بنا کر دے ہی سکتے تھے۔ اسپتال کے کاروبار میں اتنا منافع ہے کہ دنوں میں ہی ان کا نقصان پورا ہو ہی جائے گا۔ پھر وہ تو امریکن ڈاکٹر بھی ہے۔ کتنے میں کیا جاتا ہے کہ اتنے سال اس نے امریکا میں پریکٹس کی ہے۔ امریکیوں کا علاج کرتا رہا ہے پاکستان میں انہوں نے اس کے جیل جانے کی خبر کو سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ وہ فیکٹری بیچ کر اسے ایک بڑا اسپتال بنا دے گا اور نہیں تو چھوٹے چھوٹے دو تین ہی بنالیں گے۔ غلام علی نے بہت اعلیٰ منصوبے بنا رکھے تھے۔

"حالات یہی رہے تو ہم فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔" بارہ کینال کے گھر میں رہنے والے غلام علی کو فٹ پاتھ کے نام سے ہی نفرت تھی۔ جبکہ یہی فٹ پاتھ گاہے بگاہے انہیں خواب میں دکھائی دیتا تھا۔

"تم بھاگ نہیں سکتے وہاں سے؟ کوئی ایجنٹ ڈھونڈ عدن! کوئی تمہیں کینیڈا کے راستے یا برازیل کے راستے نکال سکے۔ میں یہاں بھی ایسا ایجنٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔ سنا ہے یہ سیاد فام بہت ملتا ہے ان کاموں میں۔ بہت سوں کو امریکا لے آئے ہیں غیر قانونی۔"

اس نے سنتے ہی صاف صاف انکار کر دیا۔ "میں

بھائی جیساں گا اگر ایسے بھاگتے پڑا گیا تو ان کا کچھ نہیں میں بدل جائے گا۔ وہ مجھے دہشت گرد ہی سمجھ لیں گے۔ میں مر جاؤں گا یہیں مقدمہ بھگتے بھگتے جیل دیوارہ جیل نہیں جاؤں گا۔"

"مرد ہو عدن۔ زندگی میں خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔"

"میں سوئی چیتے جتنا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتا۔ صاف انکار۔"

"جتنے ڈر پوک ہو تم۔" نہیں غصہ آ گیا۔

"میں جیل میں رہا ہوں۔ پولیس والوں کی شکل دیکھتے ہی جان نکل جاتی ہے۔"

"امریکا کا پانی پی کر تم بزدل بن گئے ہو۔" وہ اسے انکار کرتے تھے۔

"امریکا نہیں جیل کا پانی پی کر۔"

"مرد ہی جیلوں میں جاتے ہیں۔"

"پھر وہی مرد کسی اور قابل نہیں رہتا۔"

"انہوں نے فون ہی بند کر دیا۔ ایک طرف اس کے کتنے ہی خوشی دوسری طرف اس کی بزدلی پر افسوس۔"

اس کی ہائی فائی فیشن۔ ایل ماں ڈپریشن کی مریض بن چکی تھی۔ وہ روتی پہلے تھی۔ بات بعد میں کرتی تھی۔ اس کی بہن نے یونیورسٹی کے ایک لائبریریئر

کلاس لڑکے سے خود ہی شادی کر لی تھی اور آج کل وہ بھی اس میں تھی۔ غلام علی کو ایک عرصہ منانے کے بعد اس نے اس لڑکے سے خود ہی نکاح کر لیا۔ اس کے

پاپ کے پاس دولت کے علاوہ کوئی دلیل نہیں تھی دی جانے کے لیے اور اس کے پاس دولت کے علاوہ ہر

چیز تھی اس لڑکے کے حق میں دی جانے کے لیے۔ اسے اپنی بہن کے بارے میں معلوم ہوا تو اسے خود پر

لوڑا افسوس ہوا۔ کاش لوہ بھی اپنی بہن کی طرح کا ہی

نے ہر چیز کی کتنی کر لی تھی۔ اسے سب مایا اور کھوکھلا نظر آیا۔ سب بے کار۔ اسے بہت احساس ہوا کہ زندگی کی اصل کامیابی اصل اور کھرے انسانوں کا حاصل کرنا ہے۔ انسانی تعلقات میں اول اتنا ضروری ہے۔ جذلوں اور سچائی میں اول۔ وہ جان گیا کہ برے وقت میں انسان کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ "پسے انسان کی"

قید کے عرصے میں وہ ایسی کان میں دیوارہ جہاں اسے کوئلوں اور ہیروں کی پہچان ملی۔ تاہم اس نے کوئلوں سے ہی خود ہی کو سیاہ کیا تھا۔ ہیرے کو تو اس نے ٹھوکر مارنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ افق کو۔ ملا کو۔

اس کی بہن فضا کو۔ اپنے اسکول دوست طاہر کی بہن فضا کو اپنے پیچھے پاگل کر دیا۔ آج وہی طاہر

اتوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کا ہیڈ تھا۔ اس کی بہن جس نے عدن کے لیے فینڈ کی گولیاں کھلی تھیں۔ ریڈ

کر اس کے لیے کام کرتی تھی اور وہ چار دوست جو اس کے ساتھ ڈی ایچ اے کے جنگلے میں رہے تھے۔ وہی

ایگل گروپ کے ممبر۔ آج بڑے بڑے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ایک تو امریکا میں ہی ہارٹ سرجن تھا۔ غلام

علی نے تعاون کے لیے جب رابطہ کیا تو اس نے صاف انکار کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور آئندہ سے ان کا فون سننا ہی بند کر دیا۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ ابن جی او

کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ غیلے گنبد میں رہنے والی

بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی ابن جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے

پوچھا کہ "کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بہت کر رہا ہے؟" تو اس نے بتایا کہ "ہاں ایسی لڑکی ان کے دفتر

میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔"

اس رات عدن نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہو گئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فعل ہو گئی۔

باہر نکلتے ہی وہ اب اس شادی کر لے گا۔ اس نے اور افق نے بہت انتظار کر لیا۔ بس۔ اسے اس کی ٹیٹھی آواز اور بھولی صورت یاد آئی۔ شرافت سے جھکا اس کا سر اور محبت سے بھرا اس کا دل۔ اب یہ دل کسی اور کا نہیں۔

کالج سے سیدھا وہ اسٹور آگئی تھی۔
”کوئی آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ اسٹور کے دور کرنے اسے بتایا۔

”کون تھا؟“
”نام نہیں بتایا۔ صرف پوچھ رہے تھے۔“
”آرڈر دیتا تھا؟“

”میں نے آرڈر کا پوچھا تو مسکرائے لگے۔ پوچھ رہے تھے کہ آپ کب کب آتی ہیں۔ میں نے کارڈ دے دیا تھا آپ کے ہیڈ آفس کا۔“ کچھ ہی دیر میں وہ اسٹور سے باہر آگئی۔ جب پیچھے سے کسی نے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

”فرزام۔“ ایسا صرف وہی کر سکتا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے؟“ ہاتھوں کو فوراً ہٹا لیا گیا۔ آواز پر وہ ایسے پلٹی جیسے سانپ نے کلٹ مار لیا ہو۔ جس پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ شاندار عمارت کا بد نما کھنڈر بنا عدن تھا۔ اس کی سرخ و سفید دودھیار رنگت، لمبے عرصے سے گرووں کے عارضے میں مبتلا مریض سی بد رنگی اور گد مٹی ہو چکی تھی۔ تھوڑا بہت جو گوشت جسم پر بچا تھا وہ ڈھلتی عمر کے بیماری زدہ مرد کی جھریوں بھری کھال جیسا تھا۔

اپنے وقت کا شاہکار عدن عرف المن، کھنڈرات بنا کھڑا تھا۔

”یہ فرزام کون ہے افق؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔ کون تھا جو اس طرح اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکتا تھا اور کون تھا جس کے ہاتھ رکھنے پر افق کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ صبح سے اس کا یہاں آکر انتظار کر رہا تھا۔ ریسٹورنٹ اسٹور کے سامنے تھا۔ لیکن

سڑک پار کر کے۔ کئی بار وہ اسٹور کے قریب بھی چلا گیا تھا۔ ریسٹورنٹ اوپر تھا اور دن کے شروع میں وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اس کی نظر ایک طرف اٹھی اسے گمان ہوا کہ یہ افق ہی ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا کہ کیا یہ افق ہو سکتی ہے۔ وہ کپ آؤس کریم کھا رہی تھی۔ نیلے رنگ کی پٹیل جینز پر اس نے مشرقی طرز کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہلکے خاکی کرتے پر اس نے کمرے سرخ رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے اور بالوں میں سرخ ہی ہیر بینڈ لگا ہوا تھا۔ دونوں کانوں میں ایر فون فکس تھے اور کپ سے نیچے سے آؤس کریم نکال نکال کر کھاتے ہوئے وہ ہنس رہی تھی۔ وہ یقیناً ”کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔“

”میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔“ فرزام کہہ رہا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے آس پاس دیکھا۔
”گردن گھماؤ مت بنا۔ اسے ذرا سا جھکا لو۔“

وہ ہنسی۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کے پاس چند منٹ ہی تھے بات کرنے کے لیے۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یقین کرے کہ سرخ اسکارف میں جو لڑکی شرارتی چال چلتی جا رہی ہے وہ افق ہی ہے۔

اتنے سالوں میں کیا اس نے صرف یہی ایک کام کیا کہ وہ اور سے اور خوب صورت ہوتی گئی۔ اس بار اس نے اپنے ساتھ کیا کیا۔ کیا کہ وہ اتنی خوب صورت ہو گئی اتنی براعتاؤں بوسٹن کی سڑک پر وہ ایسے چل رہی ہے۔ جیسے بوسٹن میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ چادر کا کونا منہ میں دبا کر سر کو جھکا کر بیدل چلنے والی۔ ہر لڑا پر گھبرانے والی۔ ڈر جانے والی، کس ادا سے ہنس رہی ہے۔ اسے دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اسے کوئی فکر کوئی غم نہیں ہے۔ عدن کا تصور ذرا الٹ تھا۔ اس میں ایک تصور خاص غالب تھا کہ وہ ادا اس آنکھیں لیے ہر طرح سے بہت ادا ہوگی۔ اپنے المن سے دور۔ اس کی جدائی میں کھلتی، اس کے پیار کے لیے تڑپتی، افق عبد القدوس۔

پہلے کرا اسٹور کے پاس ہی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ افق نے نفرت سے اسے دیکھا۔ عدن اس نظر پر حیران رہ گیا۔

”ہو آریو؟“ اس سوال پر بھی حیران رہ گیا۔
”میں کون ہوں؟“ اس نے ہنسنے کی صرف کوشش کی۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟“

اگلا سوال پہلے سے بھی برا تھا۔ انداز اس سے بھی بدتر تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیگ میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ موبائل ہاتھ میں نکال کر پکڑا۔

عدن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”تم پولیس کو فون کر رہی ہو؟“ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب افق کر رہی ہے۔

”آئی۔ ایم سوری افق۔ ایسے تو نہ کرو۔“ فون کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی افق نے اسے دیکھا۔

”تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟“ کتنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ تمہارے بیٹے نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔

”میں پھر سے سوری کہتا ہوں۔ لیکن تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ اس کے انداز اور کڑے تیور بدل پر وہ بری طرح سے الجھ گیا۔ ساتھ ہی اس کی کونواؤز رنڈھ گئی اور آنکھوں میں نمی نظر آنی لگی۔ افق کو بیابان ترس آیا۔

”کیا چاہتے ہو؟ اکثر عدن۔ کیوں آئے ہو یہاں؟“

”تمہیں شکریہ کہنے آیا تھا۔“ فی الحال وہ یہ کہہ ہی نہیں سکا کہ تم سے فوری شادی کرنے کے لیے آیا ہوں جو افق اب اس کے سامنے کھڑی تھی وہ چادر کا کونا منہ میں دبا کر بیٹھی افق نہیں تھی۔

”کیوں؟“ افق نے حیران ہونے کی کمال اداکاری کی۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم ہی مجھے آزاد کرواؤ گی؟“

”میں نے؟ میں نے کیا کیا؟ تم جیل میں تھے کیا؟“

عدن اس پر الجھ گیا۔ ”تی بڑی این جی او کا نمائندہ تم نے؟“ تو سمجھا تھا میرے پاس۔ مارش نام تھا اس

”میں نے خود مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔“

”تو تم بھی جیل میں تھے؟ وہ تمہارے پاس بھی چلا گیا؟“ عدن اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں جی او جن لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں تم بھی ہو۔ ہم نے عرب۔ بنگلہ دیش اور چند دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے تھوڑا سا کام کیا تھا اور بس۔“ افق نے کندھے اچکائے۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ عدن کو یقین ہی نہیں آیا۔

”تم کیا سمجھ رہے ہو؟ مجھے اس سے مطلب نہیں ہے۔“

”میں نے تمہارے پاس کوئی نمائندہ نہیں بھیجا تھا۔“

”اس نے خود مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔“

”تو تم بھی جیل میں تھے؟ وہ تمہارے پاس بھی چلا گیا؟“ عدن اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں جی او جن لوگوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں تم بھی ہو۔ ہم نے عرب۔ بنگلہ دیش اور چند دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے تھوڑا سا کام کیا تھا اور بس۔“ افق نے کندھے اچکائے۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ عدن کو یقین ہی نہیں آیا۔

”تم کیا سمجھ رہے ہو؟ مجھے اس سے مطلب نہیں ہے۔“

”تم ایسے کیوں کر رہی ہو افق؟“ وہ پھر سے رو دینے کے قریب ہو گیا۔

”کیسے؟“

”مجھے کیوں بن رہی ہو۔ اتنے سالوں بعد ملی ہو۔ کوئی حال احوال پوچھو۔ کوئی بات کرو۔ میں پاگل ہو رہا تھا تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لیے۔“

”تم نے کہا، تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جب کچھ کیا ہی نہیں تو کیسا شکریہ۔“ افق نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ صاف جھوٹ۔ تم تو جھوٹ بولتی ہی نہیں افق! اب کیوں؟ میں جانتا ہوں، تم ناراض ہو، مجھ سے۔“

اس سب پر افق کا جی چاہا کہ وہ دھکا دے کر اسے سڑک پر گرا دے۔ اب یہ شخص اس سے اور کیا چاہتا ہے۔ اس کی سب خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی چھوڑ گیا تو اب اور کیا چاہتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں اس کی مدد ہو گئی تھی۔ اس مدد کو اس نے انسانیت کے خاتمے میں لکھ دیا تھا۔ عدن کے خاتمے میں نہیں۔

”تم نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا۔“ عدن کی اگلی

بات افق کو چاٹنے کی طرح لگی۔
 "کون سی محبت؟" افق کا سر گھوم گیا۔ اب ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ شاید بہت غلط ہونے جا رہا ہے۔

"ہماری محبت۔" اس نے بڑے دھڑلے اور جوش سے کہا۔

"ڈاکٹر عدنان۔ زبان سنبھال کر۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ "میری محبت میرا شوہر ہے اور بس۔ اس چکر کو جس میں مجھے پھنسا یا تھا اسے محبت کا نام مت دو۔"

قید سے پہلے "تم دہشت گرد ہو۔" اس پر اسماعیل بکلی بن کر گر ا تھا۔ رہائی کے بعد "میری محبت میرا شوہر" وہی بکلی بن کر اس پر گرا۔ حیرانی، صدمہ، خوف، لاچارگی، بے بسی، دکھ، سب آگے پیچھے اس پر دارو ہوئے۔ جب اسے مارش نے افق کے بارے میں بتایا تو وہ بھی سمجھا کہ قسمت افق پر مہمان ہو گئی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح اتنی تری کر لی ہے کہ وہ امریکا تک آپہنچی ہے۔

"تم نے شادی بھی کر لی افق؟" یہ بازی بھی ہاتھ سے گئی۔ عدنان کا یہ سوال ایسے تھا کہ تم نے تو مجھے موت کی ہی سزا سنائی۔ اس کا گدہ میلارنگ سیاہ پڑ گیا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکلے۔

ایک بار پھر سے افق کو اس پر ترس آیا۔
 "کیوں نہ کرتی؟" اس نے بہت اعلیٰ سے پوچھا۔
 عدنان کو تو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کا گریبان نہیں پکڑ رہی۔ کوئی سوال نہیں کر رہی۔ اس نے بمشکل سر کو ہلایا۔

"ہاں کر لی چاہیے تھی۔" اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر وہ مخالف سمت میں چلنے لگا۔

"دوبارہ کبھی میرے راتے میں مت آنا۔" افق کی آواز اس کے پیچھے آئی۔ اس نے تائید میں سر کو ہولے سے ہلا دیا۔ اب وہ ایک ایسے انسان کی طرح سڑک پر چل رہا تھا جو نہ کسی میدان کا کھلاڑی تھا، نہ ہی تماشائی۔ دنیا کے سب ہی کھیل تماشے اس کے لیے

ختم ہو گئے۔ بے نام قدم ہی انھیں گے اب۔ جو کبھی بھی رک جاتے ہیں اور کسی سمت بھی نہیں جاتے۔

ساری رات وہ سڑکوں پر گشت کرتا رہا۔ اندھے کا فائدہ اٹھا کر دوتا بھی رہا۔ دراصل اب ہی وہ محض معنوں میں خالی ہاتھ ہوا تھا۔ افق کے اب کبھی نہ ملنے پر اسے اصل دکھ ابھی ہوا۔ وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔ اس پر زیادہ ہوا۔ ہاں صرف شوہر۔ اس نے اپنی تم آنکھیں دائیں ہاتھ کی ہتھکڑی سے صاف کیں، وحشت زدہ پاگل آنکھیں جو صدمے اور دکھ میں جامد بھی ہو جاتی ہیں اور تیزی سے پھر پھڑکنے بھی لگتی ہیں۔ وہی نفسیاتی دورے کی کیفیت جو اسے قید کے دوران پڑتے تھے۔

اتنا رو کر اتنا پچھتا کر بھی عدنان روز اسٹور کے قریب چلا جاتا۔ دو چار چھ دن افق وہاں آ ہی نہیں رہی تھی۔ عدنان کو ہنسی آتی۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ تھوڑی سی دیر کے لیے آئی اور چلی گئی۔ فاصلہ رکھ کر عدنان اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک جا پہنچا۔ پھر وہ روز اس کے گھر تک جانے لگا۔ وہ اس کے شوہر کے انتظار میں تھا۔ افق اکیلی ہی گھر سے باہر نکلتی نظر آتی۔ وہ سمجھ گیا کہ افق نے اس سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ کیوں بولا ہے۔ یہ پوچھنے کے لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ کالج آ گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی افق کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا افق! تم مجھ سے اتنا کترا کیوں رہی ہو؟ میں وہی امان ہوں جو تمہاری جان ہے۔"

عدنان نے کالج کی طرف جاتی سڑک پر اسے جالیا تھا۔ افق نے سختی سے اپنے لب پیچھے اور ایسے ظاہر کیا کہ نہ اسے جانتی ہے نہ ہی اسے سن رہی ہے اور تیز چلنے لگی۔

"تم اتنا سخت ناراض ہو مجھ سے۔ میں نے تمہیں فون نہیں کیا اس لیے۔ میں حالات میں پھنس گیا

تھا۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ تم میری بات تو سنو۔ تم اس طرح نہ موڑ کر کیسے میرے بغیر رہ سکتی ہو۔" افق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص کتنے جوش سے اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔

"کیسے حالات؟" اس نے پوچھا۔
 عدنان امریکا نوکری کے لیے آیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا۔ جہاں اہمالی کیا تھا وہاں سے فوری کل آگئی تھی۔ تجارتی کرنے میں میں اتنا مصروف ہو گیا کہ تمہیں ایک فون نہیں کر سکا۔ سوچا تھا امریکا آکر لوں گا۔

"تو اسپتال تمہارا اپنا نہیں تھا جہاں تم نوکری کرتے رہے ہو؟"

وہ سمجھ رہا تھا کہ افق کو کچھ نہیں معلوم اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عزیز سے بھی مل چکی ہے اور آکر کل بھی بڑھ چکی ہے۔ وہ اسے وہی افق سمجھ رہا تھا جو ٹیکسری جایا کرتی تھی۔ ایف اے میں ٹیل ہو گئی تھی۔ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

"یہ کسی آغا عباس حیدر کا تھا۔"

"گورو آغا عباس حیدر تمہارے سر نہیں تھے؟"

اب عدنان کا حلق خشک ہو گیا۔

"ان کی بیٹی۔ تمہاری بیوی۔ ماریہ۔ تمہارے بچپن کی محبت۔"

عدنان کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ وہ نہ صرف اس کی شادی۔ بلکہ ماریہ تک کے بارے میں جانتی ہے۔ وہ اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہے؟

"میں اسے چھوڑ چکا ہوں۔" اسے یہی بات

مطلقات اس نے لی تھی تم سے۔" افق کی معلومات

میں اس لیے ناراض ہو کہ میں نے ماریہ سے شادی کر لی؟ پاپا نے زبردستی۔

"میری طرف سے تم دنیا میں موجود ہر ماریہ سے شادی کر لو۔" افق نے تمسخر اڑایا۔

"تو میرے راتے میں ایسے مت آیا کرو۔ میں اپنے شوہر کو بتا دوں گی۔ میرا شوہر روایتی پاکستانی بھی

ہے اور امریکا کالاء تو تم جانتے ہی ہو۔ دونوں اگر مل گئے تو۔"

عدنان جس کا شرمندگی سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ افق کے اس دھمکی بھرے انداز سے آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اسے دو دو پیسے کے کام کرتے دکھا تھا۔ ہمارے ملازم۔ جوتیاں اٹھانے والے۔ گندے برتن دھونے والے۔ آواز پر جی کہنے والے۔ ترقی کر کے کسی بھی آسمان پر جا نہیں۔ کسی کے لیے وہ تب بھی ملازم ہی رہتے ہیں۔

"شوہر کو؟" وہ ہنسلا۔ "کس شوہر کو جو سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہاں ہے وہ۔ بلاؤ۔"

افق نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنی بات کر کے بھی بے وقوفی ہی کی تھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آگے بڑھی اور عدنان نے اسے آگے بڑھتے دیکھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکنا چاہا۔

"میں ہر بار تمہاری یہ جرات معاف نہیں کروں گی۔" وہ حلق کے بل چلائی۔

"تمہیں میری بات سننا ہی ہوگی۔" وہ بھی چلایا۔ "دورنہ میں بار بار تمہارے راتے میں آؤں گا۔ تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں ایک بار مجھے موقع دینا ہی ہوگا۔"

افق اس سے ڈرتی نہیں تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اب ڈر گئی۔ وہ کالج تک اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اب بار بار آئے گا۔ گھر بھی آ جائے گا۔ وہ نہ جانے کیوں ایسے پاگل ہو رہا ہے۔

اس کی بات آخری بار سننے کے لیے وہ قریب کی کافی شاپ میں آگئی۔

"تم سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ گیا تھا۔ جہاں! کس کی قسم کھاؤں کہ تمہیں یقین آجائے۔ میں نے تمہارے لیے اپنے خاندان کو بیٹا کو بھی منایا۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی دی۔ دو دن ہو گئے ہیں۔ ماما بپا ہو گئے تو ہو میں بیٹا کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اپنے باپ کے لیے میں اتنا بھی نہ کر سکا کہ اس کی مرضی سے شادی کر لیتا؟ کس منہ سے تمہیں فون کرتا؟ سب بتاتا۔"

مجھ پر الزام لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ ماریہ نے طلاق لے لی۔ اس سب میں میرا قصور کہاں ہے؟ میں نے نہیں بست یا دیا الفت۔ بست میں نے ہمیشہ صرف تم سے محبت کی۔ تمہارا کتنا احترام کرتا رہا ہوں میں۔ اتنے سال میں تمہارے لیے روتا رہا ہوں اور تم ایسے دور جاری ہو۔ مجھ پر کچھ رحم کرو۔ اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرے پیار نے زبردستی میری شادی کر دی۔“

افت صرف آخری بار اس کی بات سن رہی تھی۔ تاکہ وہ بار بار اتنی بات کہنے کے لیے اس کے راستے میں نہ آئے۔ اسے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ جھوٹ اور کتنا بوجھ بول رہا ہے۔

”میں نے سب سن لیا ہے۔ ساری باتیں۔ تم اپنی زندگی میں خوش رہو۔ اور مجھے میری میں رہنے دو۔“

”تمہارے بغیر میں کیسے خوش رہوں؟“

افت نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ ”میں اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوں کہ اس نے مجھے فرزام دیا۔“

”مجھے اس کی قسمت پر رشک ہے۔“

”یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ مت جاؤ۔ تم تو کہتی تھیں کہ تم میرے بغیر نہیں سکتیں؟“

”تب میں بے وقوف تھی۔“ اس نے بہت عتاب سے کہا۔

”تم اب بے وقوف بن رہی ہو اور مجھے بتا رہی ہو۔ تمہارے اندر آج بھی میں ہی ہوں۔ ورنہ تم میری مدد نہ کرتیں۔ تمہاری اماں نے زبردستی تمہاری شادی کروادی اور تمہاں کہیں۔“

”تمہارے باپ نے تمہاری زبردستی شادی کی اور تم مان گئے۔“ کرنے پر آئی تو کڑے طنز افت کے پاس بھی بہت تھے۔

”میں مجبور تھا الفت۔“

”میں مجبور نہیں تھی۔ میں چودہ جماعتیں پڑھی۔ ایک عاقل و بالغ لڑکی تھی اور پورے ہوش و حواس میں

فرزام کو تا عمر کے لیے ”ہاں“ کی تھی۔ اپنے منہ سے اس کے عین سامنے ہو کر۔“

”حالات کے پیش نظر ”ہاں“ کر دی ہوگی۔ محبت نہیں۔ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ محبت تم صرف مجھ سے کرتی ہو۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتیں۔“ اتنا جانتا تھا الفت کو۔ اسی لیے اتنا دور تھا اس سے۔

”ہاں! شاید صرف خلی خلی محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ جذبہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ میں فرزام کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں۔ ڈاکٹر عدنان۔ اور کسی کی جان بے بھی سکتی ہوں۔“

اس نے ٹھہر ٹھہر کے عین اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ الفت کتنا برا بھلا بول رہی ہے۔ خلی خلی دعوائیں۔

عدنان تڑپ اٹھا۔ الفت کے منہ سے کسی اور کے لیے یہ سن کر اس کا جی اس شخص کو مار دینے کو چاہا۔

”تو اس بندہ کو اپنی۔“ وہ چلایا۔ ”جھوٹ مت بولو۔“

افت نے پروا بھی نہ کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ پیچھے لڑکا۔

”تم نے کہا تھا تم میرے بغیر سانس نہیں لیتیں۔ تمہارا دن رات ہوں میں۔ مجھے سوچ کر تمہیں نیند آتی ہے اور میں تمہارے سب ہی خواب ہوں۔“

افت آگے آگے تھی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اسے تال میں گراتا جا رہا تھا۔ اس شخص سے اب اور نفرت کرنے لگی۔

”تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟“ پلٹ کر وہ چلائی۔ وہ اس کے پیچھے ہی آتا جا رہا تھا۔

”فرزام کو چھوڑ دو۔ آؤ! ہم شادی کر لیں الفت۔“

افت ہکا بکا رہ گئی۔ کس ہمت اور بے غیروئی سے اسے کہہ رہا تھا یہ سب۔ اسے چھوڑ جانے والا۔ صفائی سے جھوٹ بولنے والا یہ تو فتح بھی کیسے کر سکتا تھا۔

”تمہارے جیسے دو کوڑی کے انسان کے لیے اسے

چھوڑ دو؟ جس نے ایک امیر باپ کی بیٹی سے شادی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ اس شخص کے بیٹے کے ساتھ جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔“

افت بات کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی عزت کا پرہ تھا۔ اسے وہ چاک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اب عدنان کے منہ پر یہ بات ماری کی پڑی۔ آخری بات سن کر عدنان سانس میں رہ گیا۔

”تمہارا کہینہ باپ۔“ سوچوں والا گدھ۔ جب اپنی ماں کے علاج کے لیے تم سے مدد لینے تمہیں ڈھونڈتی میں وہاں گئی۔ تو اس نے میرے آگے پیچھے اور میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔ تمہارے باپ نے میرے سامنے تمہیں فون کیا تھا۔ تم اور ماریہ جب ہنی مون پر تھے اور تم چاہتے ہو کہ اب بھی میں تمہارے جیسے انسان کا احترام کروں؟ تم سب بات کروں؟“

”ہو نہ ہو۔ سفید جھوٹ۔ سراسر الزام۔“ وہ الٹا پلٹ گیا۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو وہ گدھ کہنے اور ایسے الزام لگنے پر اس کی گردن بھاڑتا۔

”تم اپنے باپ سے جا کر پوچھو۔ ہاں! میری وجہ سے تم باہر کھڑے ہو اس وقت۔ شاید اللہ میرے ہی دلے لے لے۔“

”میں باہر لانا چاہتا تھا۔ جو تم سے مدد لینے کے لیے گئی تھی اسی کے ذریعے۔ جاؤ! جا کر بتاؤ اپنے باپ کو کہ الفت ہے جس نے تمہاری مدد کی ہے۔ عزت بھرا کر بھاگ جانے والی کے ہاتھ سے مدد کا یہ پتھر بہت دور وار ہے۔ یہ پتھر تم دونوں کو بے یک وقت لگا ہے۔“

”تم پتھر پتھر بیٹا تم نے مجھے۔ بہت ذہین نہیں ہوں۔“

”میں تم سے اب ہمیشہ دور ہی رہوں گی۔ اتنی سمجھ دار تو ضرور ہوں۔“

افت طعنے لگتی۔ عدنان بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ماں اور باپ صرف یہ دو ایسے رشتے ہیں کہ کتنے بھی گناہ گار ہو ان کا کسی تیسرے کے منہ سے ان کے گناہ نہیں نکلتے۔ اپنے باپ کو الفت کے بارے میں بتا بھی چکا تھا۔ مگر بھی اپنے بیٹے کی پسند کے ساتھ۔ الفت کے ہاتھ فون لا کر اسے اس نے فون کیا۔

”اپنی کہیں کہیں آئی تھی کبھی؟“

”کون الفت؟“ لمحہ بھر کے تال کے بعد کہا گیا۔

”جس کی عزت پر آپ نے ہاتھ ڈالا تھا۔ جو میرا پوچھنے ڈی ایچ اے والے ہنگامے میں آئی تھی۔“ آخری حد پر تھا محل کی۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“

”ہاں نہ میں جواب دوں۔“ تن کر کہا۔

”تو اس بندہ کو گدھے۔ اپنے باپ پر الزام لگا رہے ہو؟“

”سی الفت نے بوشن میں مجھے اس سیل سے آزاد کر دیا ہے۔ جہاں زمین پر میں نے اڑیاں رگڑی ہیں اور دیواروں سے سر لکھ لیا ہے۔ اس۔“

”کیا بکواس ہے؟“ فون بند ہو گیا۔ عدنان جان گیا۔ الفت سچ کہہ گئی ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی سرکرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اسی لڑکی کے ساتھ جس کا ذکر وہ ان سے کر چکا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ سب کچھ۔ عزیز کے ہاتھوں جب وہ بار بار پیغام بھیجوا تا تھا کہ الفت کے گھر جائیں۔ اسے عدنان کے بارے میں بتائیں تو اسے ایک ہی جواب ملا تھا کہ وہاں کوئی ایسا گھر نہیں ہے۔ نہ ہی وہاں کوئی الفت رہتی ہے۔

وہاں کوئی گریبا ہی نہیں تھا۔ اس کا باپ کس منہ سے وہاں جاتا۔ زندگی کے اس حصے میں باپ نام کا بھرم رکھے اس شخص کی عزت بھی اس کے اندر سے گئی۔ تو اب سب کچھ چلا گیا عدنان کے پاس سے۔ عدنان خالی ہاتھ رہ گیا۔ اس سے اچھا تو وہ امریکی سیل میں ہی تھا۔ سر ہی پھوڑنا ہے تو آزادی میں ہی کیوں۔ پانکلوں کی طرح اس نے ایک ہی سڑک کے دس چکر لگائے۔

بڑھتا رہا۔

اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ جو بچا تھا اسے چھین لیا گیا۔ اب اسے زندہ رہنا ہے تو صرف اپنی مرضی کے ساتھ۔ اپنے من پسند لوگوں کے ساتھ۔

چند دن وہ عزیز کے ساتھ مقدمے کی سماعت میں مصروف رہا۔ چند اخبار والوں نے اس کے تفصیلی

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

کاتب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ

کا شجرہ منت حاصل کریں۔

قیمت - 300/- روپے

بذریعہ اک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ابن نے صرف نفی میں سر ہی ہلایا۔ اسنے سے ہی
انسان کے اندازہ ہو چکا تھا کہ بات اتنی بھی آسان
نہیں تھی۔ اب اس یقین پر جواب دے دینے پر بھی
پہل نہیں ہوگا۔ سر تیزی سے نفی میں ہلتا رہا۔
”یہ کیا نہیں ہے فرزام۔“ آواز اور ٹھیک گئی۔
”پھر کیسا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب؟“

”میں نے میگزین میں اس کے بارے میں پڑھا
تھا۔“ وہ جانتی تھی۔ اس سلسلے میں پوچھا گیا اگلا سوال
تھوڑے سے بچے کے یقین اور اعتماد کی بھی موت
کر دے گا۔

”پھر۔“ اس کے لیے پہلی بار فرزام کا انداز سخت
تر ہو گیا۔ اس ”پھر“ کا جواب تو وہ خود نہیں جانتی تھی۔
اس ”پھر“ کا جواب ہی اسے لے ڈوبے گا۔ یہ ”پھر“
بہت الجھا ہوا تھا۔

”میں اس کے وکیل کے آفس گئی۔“ اس کی آواز
اچانک گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ الفاظ سارے غائب
ہو گئے۔

”پھر اس کے وکیل کا کیسے معلوم ہوا؟“
”میں نے سچ کیا تھا۔“ شرمندہ سے وہ اور
شرمندہ ہو گئی۔

”یہ اوکے بہت جان لیوا تھا۔“
”تم آفس کیوں گئیں؟ وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ اپنا اور
اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔“

”اگل تھی جو گئی۔ خود نہیں جانتی
کیا سب بالور سمجھا نہیں سکتی تھی۔“

”میں بالکل تھی فرزام! جو چلی گئی۔ خدا جانتا ہے۔
میں نے اس کی وجہ کے گئی۔ وکیل نے میری بہت منت
کی۔ مجھے اکسایا۔ انسانیت کے واسطے دیے۔“

”تم نے انسانیت کے نام پر یہ سب کیا؟“ وہ بظاہر
بہت مطمئن سے یہ سب پوچھ رہا تھا۔

”میرا یقین کرو۔ حالات ایسے۔“
”میرا یقین کرو۔ حالات ایسے۔“

”میرا یقین کرو۔ حالات ایسے۔“

تو ایک بیل گئی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھی وہ مسلسل
فون کر رہی تھی۔ اب وہ اسے سب سچ سچ بتا دے گی
اسے چھپانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ ناراض ہو
ہوگا۔ لیکن مان ہی جائے گا۔ بات بگڑ گئی تھی تو سہجہ
بھی جائے گی۔

دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو ہر طرف اسے فرزام کا
غصہ بکھرا نظر آیا۔ شاہنگ بیگم ادھر ادھر بکھری
پڑے تھے۔ جیسے ایک ایک کو اٹھا کر پھینکا گیا ہے
سارے جوتے، بیگ، کوٹ، کپڑے، شیشے، پتھر
جیوری، ادھر ادھر بکھری پڑی تھی۔ کل دن کی
ٹوٹا ہوا تھا۔

”فرزام!“ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔
”ڈانگ بیل پر سر رکھے بیٹھا تھا اور ایسے بیٹھا تھا جیسے
کہیں سے بے عزت کر کے نکالا گیا ہو۔ اس نے
اٹھا کر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

”مجھے وہاں اکیلا چھوڑ آئے۔ مجھے سنتے تو سی۔“
راستے بھر وہ روتی آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھرے
رونے لگی۔

”لے لی تم نے اس کی ٹسٹ؟ کیسا برا ڈر؟“
”جو اس کر رہا تھا وہ۔“ وہ چلائی۔ ”جھوٹ بول رہا
تھا۔ میں نے نہ تار کر غلطی کی۔ اب نہیں کر دوں گی۔“
فرزام اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔ جیسے اسے سن
نہیں رہا۔

”پلیز میری بات سنو فرزام۔ میں نے مان لیا کہ
میں نے غلطی کی۔ میرا یقین کرو۔ میں سب بتا دیتی
ہوں۔“

”سن آیا ہوں۔ تم نے اس کی
کی۔“

”دیے نہیں۔ جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔“
”پھر کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں
ہے؟“ وہ ایسے جرح کر رہا تھا۔ جیسے مقدمے کا فیصلہ
پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب تو صرف وہ ایسے ہی سوال کر رہا
ہے۔ ”تم اسے بھولیں نہیں؟ تم نے اسے ڈھونڈ

ایک اور تھپڑ سے اپنا ہاتھ روک کر افق اسے وہیں
کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔
فرزام کا فون بند جا رہا تھا۔ پہلے جب اس نے کیا تھا

انٹرویو بھی لیسے۔ عزیز اسے اپنے ساتھ چند دوسرے
اداروں میں لے کر گیا، جو مزید اس کی مدد کر سکتے تھے وہ
پہنتے سے کچھ زیادہ دن مصروف رہا۔ فارغ ہوتے ہی
اس نے افق کی نگرانی شروع کر دی۔ اب وہ گھر سے کم
ہی باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب بھی نکلتی، فرزام ساتھ
نہیں ہوتا تھا۔ اسے فرزام کے آنے کا انتظار تھا۔
ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک دن افق بہت بن ٹھن کر ایر
پورٹ گئی۔ اسے وہ شخص دیکھنا تھا جس کے لیے وہ
جان لے بھی سکتی ہے تو اس کا خیال تھا کہ پھر یہ
”جان“ لینا فرزام کی ہی سی۔ فرزام کی جان لے لینی
چاہیے۔

اسی دن شام کو وہ دونوں اکٹھے باہر نکلے۔ وہ ان کے
پیچھے ہی تھا۔ بس ایک بار اس نے انہیں ایک سڑک
سے گم کر دیا تھا۔ دیکھتے وہ انہیں نیوہری میں ڈھونڈتا
رہا۔ جب وہ اسے دوبارہ نظر آئے تو دونوں آمنے
سامنے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔
فرزام کی جان نکالنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ان
دونوں کے پاس چلا گیا تھا۔

”پھر مار کر وہ اس کا گریبان جھنجھوڑ رہی تھی۔“ تم
نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا؟ اتنا جھوٹ بولا؟ میں نے
تمہاری مدد کی۔“ وہ ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔

”تم نے میری مدد نہیں کی۔ تم ہی نے کہا تھا کہ تم
نے میرے باپ کے منہ پر پھینک دے مارا ہے۔ اس
تھپڑ کے بارے میں میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“ خود کو
اس کے ہاتھوں سے چھڑوا کر اس نے اطمینان سے
کہا۔

”تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ برا ہی کیا نا۔
تمہاری مدد کر کے میں خود اپنے ساتھ برا کیا۔“
”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا افق! چھوڑ دو
اسے۔ تم صرف مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں ہوں
تمہارا مان۔“

ایک اور تھپڑ سے اپنا ہاتھ روک کر افق اسے وہیں
کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔
فرزام کا فون بند جا رہا تھا۔ پہلے جب اس نے کیا تھا

انسان بھی۔

”مجھے معاف کر دیں فرزام۔“ اس کے پاس فرزام کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ سوال کے نام پر اب اس کے پاس مانگنے کے لیے صرف معافی ہی تھی۔

”تم کس دن آفس گئیں؟“

”جس دن آپ کامیاب آئے تھے کہ گھر سے باہر نہ جانا۔“ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنے بھی بول رہی تھی۔ وہ حیثیت میں دو کوڑی کے بھی نہیں تھے۔ ایک بچہ جو بچ کے سامنے بول کر کسی کو پھانسی سے پھالتا ہے۔ اگر بروقت نہ بولا جائے تو بعد ازاں بے شک ساری دنیا کے سامنے بلند و بانگ بولا جائے۔ پھر وہ بچہ صرف ایک گونج ایک اعلان ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

”مجھے معاف کر دیں فرزام۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا۔ میرے اور اس۔“

اسے درمیان میں ہی ٹوک کر وہ خود اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ دروازہ لاک کر لیا۔ لکھوں میں ہی اس نے اس دن سے اب تک کی ساری فلم آنکھوں میں چلائی۔ اس کے سارے جھوٹ فرزام کے کانوں کو سنائی دے گئے۔ افق لاؤنچ میں کھڑی رہ گئی۔ گھٹنے ٹیکنے والا مرد مقل ہو کر اکیلا ہی بیٹھ گیا۔ انگوٹھی نہ جانے کہاں گئی۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر۔ یا اس گھر کی پہلی بار افق نے اپنی قسمت کو کوسا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ رونے لگی۔ فرزام کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔ شاید اسے سر راہ ہی پھینک دیتا۔ گھر سے نکال دیتا۔

عدن نامی وہاں سے ہمیشہ ناکام کروا دیتی تھی۔ آج وہ فرزام کے آگے بھی ٹپل ہو گئی۔

اگلے دن وہ صبح ہوتے ہی چلا گیا۔ وہ گھر میں ہی اس کا انتظار کرتی رہی۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ اس سے بہت ناراض ہے۔ وہاں ہی جائے گا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔

رات گئے وہ آیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ اس

نے کوشش کی بات کرنے اور کمر کھلانے کی۔ مگر اس نے بات کی نہ ہی کمر کھلا۔ آنے والے چتر اور دن بھی ایسے ہی چلتا رہا۔ پیرس جانے والا جواز اور خریدی گئی اتنی ساری چیزیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ سارا وقت روٹی رہتی۔ دونوں کے درمیان وقت اور حالات کی جو خلیج تھی اور جسے دونوں ہی جانتے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ختم کر رہے تھے۔ وہ خلیج ایک دم ہی پھیل کر انہیں بہت دور لے گئی۔ اب جب وہ اس کے قدموں میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ غلطیاں نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ کچھ غلطیاں لے ڈالتی ہیں اور کچھ چل کر ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔ عدن یہ تینوں غلطیاں تھا اور یہ تینوں افق سے ہوئی تھیں۔

اس کے باپ کو پہچان لینے پر بھی وہ اس کی خصلت کو نہیں جان سکی۔ آخر خون تو ایک ہی تھا۔ وار کر دیا ناعدن نے اس پر۔ ایسا دار کہ اس کی جان ہی نکال لی۔ اگر انسانیت کے نام پر اسے یہ سب کرنا ہی تھا تو فرزام سے کیوں چھپایا؟ یہ غلطی اسے ملیا میٹ کر چکی تھی۔ اب اسے وقت کا ہی انتظار تھا کہ فرزام اس پر یقین کر لے۔

جس کمپنی کے ساتھ وہ کینیڈا کام کر کے آتا تھا۔ اسی کی ایک مشترکہ کمپنی میں وہ کام کرنے لگا۔ آفس کے پہلے دن جو اسے پھولوں کے بکے ملے۔ اس نے ٹپل پر بیٹھ دیا۔ سارے منصوبے خاک ہو گئے۔ وہ وہاں لمبی چٹھی اور یورپ کی سیر۔ صرف اس کی پیاری ہوئی افق اور ساتھ صرف وہ۔

افق نے کالج جانا چھوڑ دیا۔ اسٹور جانا بھی چھوڑ دیا۔ وہ اس حالت میں ہی نہیں تھی کہ کہیں جاتی۔ سارا دن لفظ جوڑتی رہتی اور فرزام کی طرف نظر اٹھتے ہی اس کا دم نکل جاتا۔ وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ ناشتا کر کے نہیں جاتا تھا۔ گھر آکر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رات رات بھر افق وہ نہ

پائیں کرتی رہتی۔ وہ فرزام کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن وہ فرزام کے ساتھ ایسے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اسے بتا نہیں سکتی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی راستے پر ایک ساتھ چلتے چلتے ایک دوسرے کی پشت پر آ گئے۔

ایک روز وہ حسب معمول رات گئے آیا تو اس نے لے لی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”خدا کے لیے میرے ساتھ ایسے نہ کرو فرزام! مجھے کروڑوں برا بھلا کہو۔ لیکن ایسے نہ کرو۔“

سارا دن بھی وہ روٹی رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی روٹی تھی۔

اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس سے آزاد کروایا۔

”اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا افق! تم نے مجھ سے سب کچھ چھپایا۔ جھوٹ پر جھوٹ بولا۔ کئی بار میں نے تم سے پوچھا۔ تم ٹھیک ہو۔ تم یہی کہتی رہیں کہ تم ٹھیک ہو۔ ان دنوں تم اس سے مل رہی تھیں نا؟ چھپ کر آنا کچھ کر رہی تھیں۔“

”میں اس سے نہیں ملی تھی۔ وہ میرے راستے میں آتا تھا۔“

”کیوں اس شخص کے لیے تم اس سوئیل کے آفس چلی گئی تھیں۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم ہٹا کسی وجہ کے لیے گئی تھیں۔ تم اس شخص عدن کے لیے نہیں گئیں۔“

”میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میرا یقین

میں مجھے یقین دلاؤ افق۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا ہی تو یقین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تم نے اس یقین کا بہت غلط استعمال کیا۔ تم نے میرا اعتماد تار تار کر دیا۔ اتنے سال سے مجھے ساتھ ہو۔ مجھے جان نہیں سکیں۔ تم نے مجھ سے اتنے جھوٹ بولے۔ جس نے شادی سے پہلے ہر کھسکے بچ کو سن کر بھی تمہیں اپنا یا۔ اگر تمہیں اس شخص سے نفرت ہوتی تو تم اس میگزین کو ہی بھاڑ کر پھینکتیں۔ یہ ہوتی تمہاری نفرت۔ اپنے قدم باہر

کی طرف بڑھانے سے پہلے تم میری طرف آئیں۔ سالوں پہلے میں نے ہزاروں بار یہ شکوہ کیا تھا کہ کس قوت نے مجھے برطانیہ سے نکل باہر کیا۔ تم سے شادی کرتے ہوئے مجھے اس قوت پر بہت پرہیز آیا۔ میں نے لاکھوں بار شکر ادا کیا کہ مجھے افق کے لیے بروقت وہاں سے نکل دیا گیا۔ رومی سے دور کر دیا گیا۔ آج مجھے یقین ہوا ہے افق! کہ مجھے تو تم سے میرے ناکرہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے ملوایا گیا ہے۔ جس کے بعد میں کسی اور قابل ہی نہ رہوں۔ بس تم ہی میرا یہ انجام ہو۔ ہر خواب کی اجڑی تعبیر۔ زندگی میں جس تباہی سے میں بچتا رہا اس تباہی کو خود اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم اس شخص سے نفرت کرتی ہو۔ اور یہ سب کچھ تم نے نفرت میں کیا؟ اس نے جانے یہ وقت کتنا وقت لے گا۔ پھر سے محبت کے لیے۔“

فرزام چلا گیا۔ افق کھڑی رہ گئی۔

اب اکثر وہ اسے آن لائن رومی سے بات کرتا نظر آتا۔ افق نے چھپ کر عدن سے بات کی تھی۔ وہ سامنے کرتا تھا۔ مسٹر فرزام کے گھر میں مسٹر فرزام اجنبی ہو گئیں۔ دنیا کے ہر کام سے افق کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ایک فرزام کے علاوہ اسے کسی کی فکر نہ رہی۔ ایک اسی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہ رہا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے سب سے برا غم بن گیا۔

وہ آفس سے جلدی آ گیا۔ اسے آواز دے کر سامنے صوفے پر بٹھایا۔ دونوں کے درمیان آواز دے کر بلائے اور ایسے موقع پر آنے سامنے بیٹھنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی شکل کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں دے لے۔

”میں کاغذات بنوا رہا ہوں۔ اسلامک سینٹر گیا تھا۔“

”کیسے کاغذات؟“ اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”ملاقات کے۔“ کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا۔

نہیں اتنے آرام سے بھی نہیں کہہ۔ قیامت دونوں طرف ہی آئی تھی۔

سچی بات

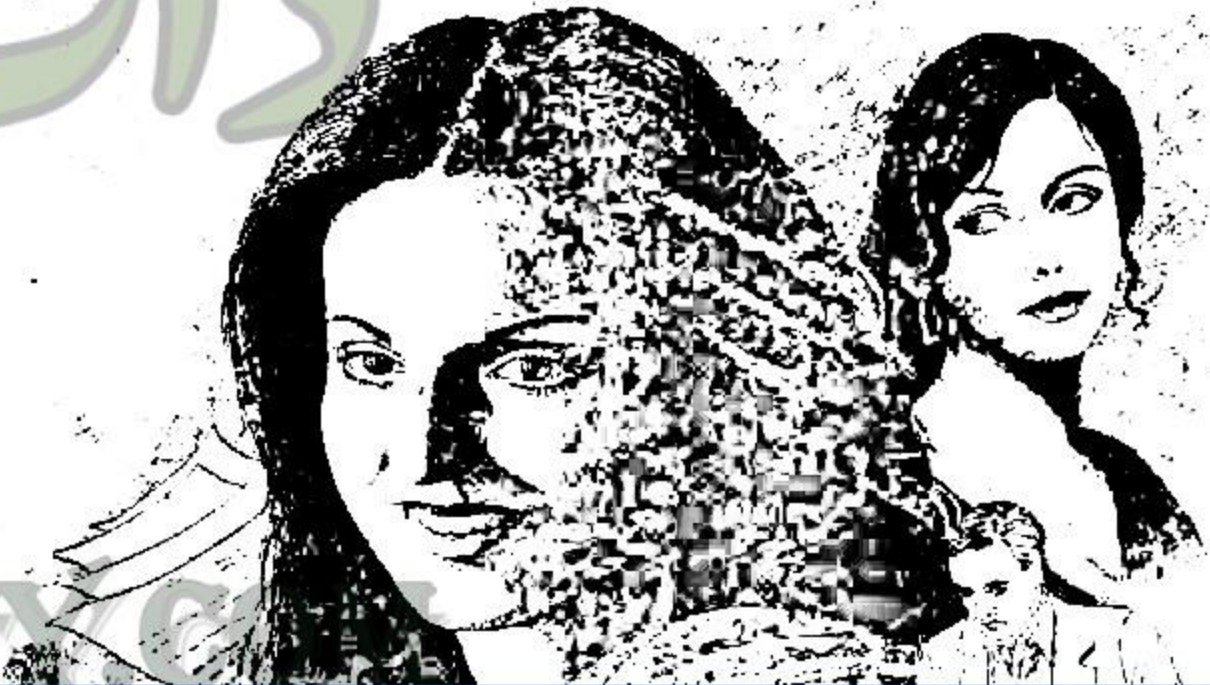


میرے لیے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ میں پچھلے پانچ چھ سال سے جیل میں تھا۔ مجھے میرا قاتل دیکھ لیا اور امیر کبیر پاپ بھی آزاد نہیں کر دیا۔ لیکن اپنی نے کر دکھایا۔ یہ ہے اس کی محبت کی طاقت۔ وہ بہت قاتل لڑکی ہے۔ کس کس سے جا جا کر ملی۔ میرے لیے درخواستیں دیں۔ صحافیوں سے ملی۔ پاکستانی کیونٹی سے واک کر دلی۔ اتنی بڑی امن جی او کو میرے لیے فعال کر دیا۔ کون کون آکر ہاں مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے ان جی او کو فنڈز بھی دیے۔ یہ سب کیوں کیا اس نے؟ کس لیے؟ وہ میرے بغیر سانس نہیں لیا کرتی تھی۔ ایک بار پاکستان میں بھی جیل چلا گیا تھا۔ رو رو کر بیمار ہو گئی تھی۔ وہ رات رات بھر دعا مانگتی کرتی تھی میرے لیے۔ اس وقت وہ میرے لیے دعا کر سکتی تھی۔ اس بار اس نے سب کر دکھایا۔ کیا یہ کم ہے سمجھنے کے لیے کہ وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہے؟ اتنے سال اس نے میری گمشدگی کا ہی سوگ منایا ہے۔ میری

جو اس سے ناراض تھا۔ بلاشبہ۔ بہت ناراض تھا۔ لیکن آج عدن اس کے آفس میں آیا تو اس نے وہ ناراضی بھی چھوڑ دی۔
”کیوں آئے ہو؟“ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور معدوم ہو گئی۔
”مفتی کے لیے۔“

”تو اس بند کرو۔ تیز سے بات کرو۔ بیوی ہے وہ میری۔“ فرزام کا توجہ چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے سورنہ اس کا گلا ہی دبا دے۔
”بیوی وہ تمہاری ہے۔ لیکن مجھ سے محبت کرتی ہے۔“
”اسے تم بے وقوف بنا کر بھاگ گئے۔ اب پھر سے آگئے ہو۔“

”بے وقوف تو تم ہو۔ جو اس کے ساتھ تعلق کا رشتہ سمجھ رہے ہو۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے



زبردستی شادی کر دی گئی تھی۔ اپنے باپ کی بیماری کے ہاتھوں میں مجبور تھا۔ تمہارے لیے اسے بھی نہ چھوڑنا۔ وہ تو نہ ہنسی ہوگی نہ ہی روتی ہوگی۔ زندگی کو مر کر گزارا ہوگا۔ تم اسے کبھی نہیں جان سکتے۔ اس کے اندر کا بھید نہیں پاسکتے۔

خاصوشی کا وقفہ اس نے اپنی مرضی کالیا۔
”اور نہیں تو اتنا ہی سوچ لو کہ اس جیسی شریف لڑکیاں محبت کے کھیل بار بار نہیں کھیلتی۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو پہلی محبت کا جو پودا اپنے اندر لگا چکی ہیں اسی کے پیچھے اپنی قبر بناتی ہیں۔ اسے اکھاڑ کر نہیں پھینکتیں۔ حالات سے مجبور ہو کر اگر اس نے شادی کر بھی لی تو۔ کیا وہ تم سے محبت بھی کرتی تھی؟ اگر کہہ بھی دیا ہوگا۔ جیسا کہ مجبور مشرقی لڑکیاں کہہ ہی دیتی ہیں۔ تو کیا وہ سچ سچ کرتی ہے؟ اپنی ماں کی وجہ سے تم سے شادی کر لی ہوگی۔ یا سارا چاہیے ہوگا۔ اس کا تو کوئی بھائی بھی بڑا نہیں تھا۔ تمہیں اس نے سارا بتایا۔ لیکن جان ابھی تک اس کی میں ہی ہوں۔ اس نے مجھے دکھا۔ میرے بارے میں جانا تو یا نہ نہیں رہ سکی۔ دیکھو! ہمارے تعلق کی مضبوطی کہ وہ میری طرف بھاگی آئی۔ عقل سے کام لو! اسے چھوڑ دو۔ اسے مجبور نہ کرو۔ اپنی ماں یا تمہارے کسی احسان کے وجہ سے وہ تو شاید تم سے نہ کہے۔ ایسے ہی مجبوری سے تمہارے ساتھ بندھی رہے۔ آزاد کرو اسے۔ اور پھر دیکھو کہ کیسے بھاگی آئی ہے میرے پاس وہ۔ وہ مجھ سے یہاں بار بار چھپ چھپ کر ملتی رہی ہے۔ تب تم یہاں نہیں تھے۔ اس نے تمہیں بتایا کہ میں نے اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے؟ چلو! میرے ساتھ اس کا کافی شاپ جہاں اس نے کافی پی تھی۔ کوئی ایک آدھ تو تمہیں ضرور بتا دے گا کہ وہ میرے ساتھ وہاں جاتی رہی ہے۔ اور کتنی باتیں بتاؤں کہ تم بہ یقین کر لو کہ وہ میرے لیے بنی ہے۔ تمہارے لیے نہیں اسے آزاد کرو۔“

فرزام تم صدمہ سے ستارا ہا۔ ستارا ہونیا کا کوئی بھی مرد ہوتا وہ عدین کو سنتا۔ عدین کا یقین کرتا۔ افق پر

شک کرتا اپنی قسمت پر روتا۔ اور نہیں تو اس سارے نقصان پر اس سب پر خود کشی تو ضرور ہی کر لیتا۔ وہ سب سنتے سنتے فرزام کہیں کانہ رہا۔ وہ شخص اپنا مرضی سے بول کر چلا گیا۔ وہ فلاح تھا۔ آیا اور چلا گیا اور فرزام شکست خوردہ وہیں بڑا رہا تھا۔ اس نے ماں کو فون کرنا چاہا۔ گلا پھاڑ کر رونا چاہا۔ نہ فون کر سکا نہ ہی رو سکا۔ وہ اس سے محبت کرنا ہے اور وہ وہ عدین سے پہلی محبت۔ مشرقی عورت۔ ٹھیک کہا اس نے۔ افق جیسی لڑکی محبت کا کھیل نہیں کھیلتی۔ محبت ایک ہی کرتی ہے اور اسی محبت میں خود کو دفن دیتی ہے۔ اس سے متاثر ہوتے۔ اس کے قریب آتے۔ اس سے محبت کرتے۔ فرزام عین وقت پر لٹ گیا۔ اب وہ کسی بل سے چھلانگ لگا دینے کے ہی قابل رہ گیا تھا۔ اب ایسے انجام کے ساتھ وہ کیسے زندگی جیسے گا۔ کسی کو بتائے وہ اس سے چلا آیا۔ مجبوری کے ان دونوں کے رشتے کو اسے ختم ہی کر دینا چاہیے۔

وہ ناراض ہے۔ وہ ملن جائے گا۔ لیکن وہ تو طلاق کی بات کر رہا ہے۔ وہ اس انگوٹھی کے انتظار میں تھی جو جلد ہی دوبارہ اسے پیش کی جائے گی اور وہ اسے باہر کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس قدر پتھر دل ہو چکا ہے افق کے لیے اتنا متغیر۔ اس کے جسم پر چھوٹیاں لوٹ کھسوٹ کرنے لگیں۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ فرزام نے اس کے لیے دیکھنے پر اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر میں وہ روٹ گھوم رہا تھا جو صرف کام کرتا تھا۔ نہ ہنستا تھا۔ نہ بولتا تھا۔ نہ ہی زندگی میں زندہ تھا۔ وہ اندر رہا پر سے مرده ہو چکا تھا۔

افق کی نظر اس فرزام پر تھی۔ خس کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کا سمندر تھا اور جواب آنکھیں بدل رہا تھا۔ اب وہ شاید روی کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس کا یقین ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فرزام نے سچ مان ہی لیا تھا کہ انارکلی بازار میں شادی کا سن کر بت بن جانے والا وہ عدین کی محبت کا سوگ ہی منا رہا تھا۔ وہ بھول گیا

کہ نیروی میں اس کے ساتھ وہ کس قدر خوش تھی۔ اس نے ان لیا تھا کہ وہ اس وقت وہ خود پہلا چکی تھی۔ ایک پہلی ہوئی زندگی گزار رہی تھی۔ ایک بچھونے کی زندگی۔
”مجھے طلاق دے دو؟“ صرف سوال نہیں تھا یہ۔
”تمہیں اور کیا چاہیے؟ تمہیں عدین ہی چاہیے تو تم آزاد ہو۔“

واقعات اتنے معمولی اور عام بھی نہیں تھے۔ جتنا کہ بظاہر نظر آرہے تھے۔ کوئی شخص سر یا زار کسی دوسرے کی بیوی کا ہاتھ پکڑ لے اور کہے کہ یہ مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی ہے تو یہ بات اتنی عام بھی نہیں رہتی۔ کوئی ایسے ہی کسی کی بیوی پر بات نہیں کرتا۔ صاف دل کے بڑے دل کے شوہر اگر خاصہ پی بھی جائیں تو دونوں میں بل ضرور آجاتے ہیں۔ شک اور دوسرے تو شیطان کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔ جسے ہمیشہ اٹھائے رکھتا ہے اور ناک کر موقع سے انسان پر وار کرتا ہے اور زہر پھیل کر نس نس تک چلا جاتا ہے۔ تو یہ وار فرزام پر بھی کام کر گیا۔ تب ہی اس کا انداز زہر خنک تھا۔ جان لیوا تھا۔

”مجھے صرف فرزام چاہیے۔“ پانی افق کے سر پر سے گزر چکا تھا۔ اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرزام کی زندگی سے نہ وہ جانے کی سنہ ہی اسے جانے دے گی ہر کام کو پھرتی اور دل جمعی سے کرنے والی افق فرزام پر اپنی ساری جان لگا دے گی۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے میں دے گی۔

وہ مسخر سے ہنس۔ ”یہ فرزام تمہارے پاس پچھلے عین مل سے ہے۔ کبھی تم اس کے پاس آئیں؟ اس فرزام سے تمہارا دل بھل رہا تھا۔ بس تمہیں ایک سہارا مل گیا تھا۔ گندم کی بھوسی میں جیسے آگ لگتی ہے اور بجھتی نہیں۔ ایسے ہی فرزام میں عدین آگ لگا گیا تھا۔ بس یہ آگ بجھ نہیں رہی تھی۔“

”نیک۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ غلط ہے۔“
اس نے اس کی بات کو دور میان میں ہی اچک لیا۔ اس نے اپنے لیے کئے والے ہر رشتے کے لیے انکار

کر دیتی تھیں۔ تمہارے شک اگر مجھے نہیں کہہ دیا۔“
”یہ غلط ہے فرزام! یہ زیادتی ہے میرے ساتھ۔ یہ جھوٹ ہے۔ شک اگر نہیں۔“
”پھر کیا تمہیں مجھ سے محبت تھی؟“

”محبت تو ہم دونوں کو ہی نہیں تھی نا۔ ہم نے ایک دوسرے کو جان کر ہی ہاں کی تھی۔ میں نے سب سچ بتا دیا تھا۔ میں تب نہیں کرتی تھی۔ مگر اب بہت محبت کرتی ہوں فرزام“ اس نے ایسے وقت میں اپنی محبت کا اعلان کیا۔ جب اسے کوئی وقت ہی نہ دی گئی۔

”کب کی تم نے مجھ سے محبت؟ میرا تمہارا محبت کا معاہدہ نہیں تھا ایمان داری کا تو تھا۔ مجھے تم اچھی لگیں۔ تمہاری شرافت تمہارے کام تمہارے اصول۔ بہت متاثر تھا میں تم سے۔ میرا ایمان تھا کہ صرف ایک افق جیسی لڑکی میری زندگی کو تباہ نہیں کرے گی۔ میں نقصان میں نہیں رہوں گا۔ میں بہت خوش نہ رہا تو ناخوش بھی نہیں رہوں گا۔ تمہارے جس حسن پر دنیا مارتی ہے نا۔ اس پر میں نے کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔ جو حسن تمہارے اندر تھا اس پر میری نظر تھی۔ گزرے سالوں میں میں نے روی کو یاد کیا۔ ماکہ مجھے یاد ہے کہ مجھے روی جیسی غلطی دوبارہ نہیں کرنی۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے مجھے بہت بار اس کے فون آئے۔ لیکن اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں اس سے بات کرنا میں نے گوارا نہیں کیا۔“ آنسو کا گولہ اس کے حلق میں اٹکا۔

”تم سے متاثر ہونا میں تمہارا مقید ہو گیا۔ تمہارے بغیر رہنا محال ہو گیا۔ پہلے تمہیں پرکھ رہا تھا۔ پھر تمہارے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن صرف تمہارے لیے کہ تم باغی کے ہر طرح کے دکھ سے باہر نکل آؤ۔ تم اتنی مستحکم ہو جاؤ کہ تم۔ تمہیں مجھ تک آنے میں کوئی مسئلہ نہ پیش آئے۔ اس الٹ پلٹ میں میں کہیں کا نہیں رہا۔ جس خوف سے بچتا رہا اسی سے محبت کرنے لگا۔ قسم کھاتی تھی میں نے کہ کسی عورت پر یقین نہیں کروں گا۔ بہت یقین کیے تھے میں نے روی پر۔ قسم توڑی اور نقصان بھی خود ہی اٹھایا جسے

انگوٹھی پہنانا تھی وہ تقریباً دو ہفتا تھا۔ جسے تالیاں بجاتا تھیں وہ سن کر سن ہو رہی تھی۔

”تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا افتخ؟ دل میں اسے چھپائے تم میرے ساتھ رہیں۔ دوسرے دور۔“

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بار بار یہی کہوں گی، باقی باتیں حالات نے پیدا کر دی ہیں۔ بظاہر وہ سچ ہیں۔ پر وہ وہ جھوٹ ہیں۔ صرف ایک بار میرا یقین کہ میرے ڈرنے مجھے دور رکھا۔ مجھے محبت کرنے سے ڈر لگتا تھا۔“

”محبت سے نہیں افتخ! کسی اور کے ساتھ محبت کرنے میں۔ تم وہی لڑکی ہو جو پہلی محبت کے نام پر زندہ رہتی ہے اور اسی پر مرجاتی ہے؟“

”ہاں! میں وہی لڑکی ہوں جو محبت کے لیے جیتی اور مرجاتی ہے اور وہ تمہاری محبت ہے۔ میری اس اس نادانی کو محبت نہ کہیں۔ میرے شوہر کے برابر کوئی نہیں آسکتا۔“

”اس نادانی کو۔“ فرزام نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”اپنی اہل کالفاظ کر رہی ہو۔ معاشرے کا۔ خاندان کا۔ مجبور ہو یا احسن اتار رہی ہو۔ آج تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔ مجھے ہی تمہیں چھوڑ کر رومی کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ تم نے وار میں اسے بھی بات دے دی۔ وہ صاف صاف انکار کر گئی۔ انگوٹھی منہ پر مار دی اور تم روایتی لڑکی ڈر پوک اور شریف۔ پہلی محبتوں کو سینے سے لگائے رکھنے والی۔ تمہیں تو مجھ سے دور جانا آیا۔ نہ ہی قریب کرنا۔“ غم و غصے سے وہ تقریباً پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اس کی آخری بات نے افتخ کو اندر تک ہنس ہنس کر دیا۔

تو اب اسے بار بار رومی یاد آ رہی ہے اور اب یہ خود رومی کے پاس جانا چاہ رہا ہے۔ اب وہ رومی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

”تمہارا وہ امان تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہے۔ جس کے لیے تم نے اپنی محنت سے جمع کیا گیا پیسہ فنڈز میں دے دیا۔ اگر تمہارے اکاؤنٹ میں اور پیسے بھی ہوتے تو تم وہ بھی دے دیتیں نا؟“

”کیوں اس کی ہے اس نے سراسیمہ میں نے کہا۔“

”میں نہیں دے دے۔ اس کی بات پر یقین ہے۔“

یقین دراصل بروقت سچ بولنے پر کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ افتخ! اس کی گئی باتیں اب تک سچ ہی نکلی رہی ہیں۔ کیا اس کا کام سب سچ نہیں؟ اگر وہ نہ ملتا تو مجھے بتائیں یہ سب؟ شاید بتائے ہی چھوڑ جاتیں۔ شخص تمہارے کلج آیا۔ پھر اسٹور تک۔ تم لوگ کافی شاپ میں ملے۔ اس کے وکیل کے پاس تم بار بار جاتی رہیں۔ اور کیا کچھ تمہیں کرنا تھا افتخ؟ کیا کچھ اور اتنا کچھ چھپایا تھا تو بتانا کیا تھا؟“

”کہ مجھے تم سے۔ صرف تم سے محبت ہے۔ صرف اپنے شوہر سے۔ اپنے فرزام سے۔ بہت بڑی غلطی کر دی میں نے۔ دھوکا نہیں دیا۔“

”اب بھی کہہ رہی ہو محبت کا۔ اب بھی۔ کیا ابھی اور میرے نام کا سارا چاہیے؟ جب تک ڈاکٹر عدنان کا کیس ختم نہیں ہو جاتا۔ کیا تب تک؟“ وہ واقعی پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اس کا دل غم جو جو کچھ سوچ رہا تھا اسے جلنے لگا۔ بغیر وہ زبان پر لا رہا تھا۔

صوفے پر گرے ہوئے انداز سے بیٹھی وہ اونچی آواز سے بچوں کی طرح رونے لگی۔

”میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں فرزام۔ میرا یقین کر لو۔ چلو ہمسایہ چلیں۔ میں نے کہا میں کہ میں محبت کرتی ہوں۔ لیکن مجھے کتنا ضرور تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میں تمہارے پیروں میں گر کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا۔ لیکن میں نے ایک بل کو بھی دھوکا نہیں دیا۔ میں کس کی گواہی لاؤں کہ تمہیں یقین آئے۔ صرف اللہ ہی ہے جو سب جانتا ہے فرزام! اسی اللہ پر جو سب جانتا ہے، یقین رکھ کر میرا یقین کر لو۔ اسی خدا کے لیے میری بات مان جاؤ۔ صرف ایک بار خدا کے لیے۔“

جس وقت وہ یہ بات کر رہی تھی، ٹھیک اسی وقت تیل دی گئی۔ فرزام نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ افتخ گئی۔

خوش ہوئی۔ اٹھ کر اندر جانے لگی۔ لیکن جسے اس نے دیکھا۔

فرزام نے پردہ کر دروازہ کھولا۔ سامنے نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر اس کی کینٹی کی رگیں پھڑک کر تھیں۔ وہاں عدنان کھڑا تھا۔

اس کی شکل پر وہی تاثر تھا جو میدان جنگ میں دشمن کے سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھڈے مارنے والوں کی آنکھوں میں ہوتا ہو گا۔ وہ عدنان آگیا تھا۔ اپنی فتح کا جھنڈا فرزام کی لاش پر گاڑنے۔

”افتخ! مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔“ اس نے ذرا سہجک کر سرگوشی کی۔

چوٹ یقین مقام پر لگی۔

”تمہیں پورا حق ہے۔“ فرزام ذرا اسی بلند آواز میں بولا۔ ”وہ بے انتہا غصے میں نظر آنے لگا۔ اس کا جی دانا کھوٹا مار کر اس خبیث کو چت کر دے۔ اسے کھانا مار دینا چاہیے تھا لیکن وہ باہر نکل گیا اور عدنان اندر آیا۔ افتخ دروازے کی طرف جب تک آئی کہ فرزام باہر جا چکا تھا۔

”فرزام! بند ہوتے دروازے تک یہ آواز پہنچی۔ عدنان دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”جانے دو اسے۔ اس نے ہی مجھے بلایا تھا کہ میں اگر تمہیں لے جاؤں۔“

افتخ نے اسے دھکا دیا اور لپک کر باہر نکل۔ سیر دھیاں پھلا گئی۔ نیچے آئی۔ فرزام وہاں نہیں تھا۔ وہ بار کنگ کی طرف لپکی۔ فرزام کی کار تیزی سے وہاں سے نکلی اور وہ چلا گیا۔ اس نے نیچے آئے میں دیر کر دی۔

نہیں۔ اس نے ہر معاملے میں دیر کر دی۔ عدنان سے حلق ہر بات بتانے میں۔ اپنی زندگی میں فرزام کو اس کا مقام کھلنے میں۔ وہ اسے چھوڑ رہا ہے۔ یہ صرف عدنان کی وجہ سے ہی نہیں ہوا۔ یہ افتخ کی وجہ سے ہوا۔ افتخ کی آنکھیں جھللائیں۔

فل کے رستے جان کیسے نکلتی ہے۔ وہ آنسوؤں کی ندیوں میں بہا سکتی تھی۔ واقعات ایسے کیسے بنتے ہیں۔ سہ ایک ایک کو سمجھا سکتی تھی۔ برسوں پہلے اس نے

اپنی عقل پر ماتم کیا تھا۔ جب وہ عدنان کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ برسوں بعد بھی وہ اپنی عقل پر ماتم ہی کر رہی تھی۔ وہ عدنان کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکی۔

اب وہ حلق پھاڑ کر اعلان کر سکتی تھی کہ وہ فرزام سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اب اس اعلان کو کون وقت دے گا۔ یہ ایسے ہی ہونا بھی کسی کے مرنے کے بعد اس کی پیدائش کا اعلان کیا جائے۔ پھر ایسی خبروں سے کسی کو کیا سروکار۔ فرزام تو جا چکا تھا۔۔۔۔۔

کھڑے کھڑے افتخ پر بہت سی حقیقتیں وارد ہوئیں۔

وہ اس وقت اسے تنہا کر گیا ہے۔ یہ چھوٹی بات ہے۔ بڑی بات تب ہوگی۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر نہ آئے۔

شاید ایک لمبی مسافت اس کے انتظار میں تھی۔ یا ایک طویل کرب۔

کیا وقت اسے اور سبق دنا چاہتا تھا یا وقت واقعی بے رحم بن کر اس سے کچھ چھین لینا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر سے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ اجنبی لوگ بھی اسے دیکھ لیتے تو ضرور اس سے پوچھتے ”کیا ہوا؟“

وہ زیر لب اللہ کو یاد کرنے لگی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو مجسم اللہ (دعا کی صورت جڑے ہاتھ) بنی کھڑی تھی۔

عدنان کھڑکی میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں ایسے کھڑی تھی۔ جیسے اپنے ہی ہاتھوں اپنے تخت و تاج کے ٹکڑے کر ڈالے ہوں۔ جیسے اپنے ہی مروہ و جود پر کھڑی ماتم کر رہی ہو۔ ذرا سادہ۔ تھوڑا سادہ دھندلا ہی سہی عدنان دیکھ رہا تھا کہ وہاں کون کھڑا ہے۔ وہاں امان کی افتخ نہیں کھڑی تھی۔ وہ اس کے لوٹ آنے پر نہیں کسی اور کے چلے جانے پر ماتم کنل تھی۔

کیا وقت ایسے بدل جاتا ہے۔ اگر یہ وقت ہی ہے تو عذاب کا مستحق ہے۔

عدنان نے صاف شیشے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ افتخ کو خود میں بھیج لینا چاہتا تھا۔ وہ اس میں حلول کر جانا چاہتا

تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے جتنا چاہتا تھا ان سالوں میں اس پر کیا گزری۔ اس نے ایک ایک ساعت اس کے لیے جمع کر رکھی تھی۔ وہ گزری ساری ساعتیں اس کی جھولی میں ڈال دیتا چاہتا تھا۔ وہ اب اسے ٹھیک ٹھیک بتانا چاہتا تھا کہ اس کی محبت اس پر کب اتری۔ اس محبت پر اس کا ایمان کب مکمل ہوا۔ اس کلمہ صلیت کا لفظ لفظ وہ اس پر آشکار کر دیتا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتائے گا کہ قید کے ان برسوں میں اس نے کتنی بار اسے بکرا۔ کتنی بار اس نے اسے خواب میں دیکھا اور آنکھ کھل جانے پر رویا۔

”وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔“ اس نے غلطی کی۔
”وہ واپس آ گیا ہے۔“ غلطی کی اصلاح ہو گئی۔
افتخار بھلی سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ اسے اس پر ترس آرہا تھا۔ بہت آرہا تھا۔ لیکن خود سے زیادہ نہیں۔ ترس اس نے پہلے خود پر کھالیا تھا۔ اس نے ایک بڑے عذاب وقت کاٹا تھا۔ زیادہ رحم کا مستحق وہ ہی تھا۔ افتخار سے دور عدنان اس سے زیادہ ہارا کھڑا تھا۔ وہ کیسے افتخار پر ترس کھا لیتا؟ اتنا ظالم کیسے ہو جاتا کہ خود کو ہی مار ڈالتا؟ عدنان کے اندر افتخار کے لیے اب محبت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جتنی افتخار کا خیال تھا اس کے اندر فرزام کے لیے ہے۔

وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس حال کو پہنچی کھڑی ہے۔
وہ کس حال کو پہنچ چکا ہے۔ وہ کیوں نہیں پلٹ کر دیکھتی۔

وہ اپنے نفع کی طرف کیوں نہیں پلٹ رہی؟
”یہ جو آسمان کا رنگ ہے۔ یہ کتنا پیارا ہے امان! مجھے اتنی دیر سے کیوں معلوم ہوا کہ آسمان اتنا خوب صورت ہے؟“

”تمہاری آنکھوں میں امان آسا ہے۔ اب تمہیں خوب صورتی کا ہر بیان معلوم ہو گا۔ کو لائن جی! شکریہ۔“

”اے اللہ شکریہ۔ میری آنکھوں کو امان دیا۔ یہ بند ہوئی ہیں تو اندھیرے پر بھی فدا ہوئی ہیں۔“
”میں ان پر فدا ہوں۔“

عدنان نے اپنی کئی آنکھیں صاف کیں۔ اب اسے افتخار کی نفرت ملے گی۔ ایک لمبا عرصہ ملے گی۔ فرزام اسے طلاق دے دے گا۔ وہ عدنان سے نفرت کرے گی۔ ٹھیک کرے گی۔ افتخار کی ہے تو نفرت ہی سہی۔ اسے ایک طویل انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی جیسی محبت پلنے کے لیے۔ اور وہ توافق ہے۔ مستقل نفرت پال ہی نہیں سکتی۔ محبت کے بنا وہ ہی نہیں سکتی۔

وہ ضرور کرے گا یہ انتظار۔ اب وہ صابر بن جائے گا۔ اب وہ سب کرے گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا۔ اب بریم امرت ہی پینا ہے۔ یہی خضر اب اسے زندہ رکھ سکے گا۔ ایک ایک بوند کے لیے وہ ہر حد سے گزر جائے گا۔ وہ افتخار کے لیے ہر بات میں اتر جائے گا اور اسے بھی ٹھیسٹ لے جائے گا۔ وہ اندر رہا ہرے افتخار ہو چکا تھا۔ اس کی ذات میں صرف اسی کا عکس جھلکا رہا تھا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتا۔ اسی لیے وہ فرزام کے پاس گیا تھا۔ ایک سپر پاور ملک کی بدنام زمانہ جیل میں وقت گزارنے والے کو ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا کہ اسے کس وقت ان دونوں کے درمیان دخل دینا ہے۔

وہ اس بلڈنگ کے آگے پیچھے ہی ٹھہر رہا تھا۔ فرزام آفس سے فوراً ہی اٹھ آیا تھا۔ وہ کیوں جلدی آیا تھا۔ عدنان نامی نام نہاد و ہشت گرو جاتا تھا۔ الٹی انگلیوں کے کلن گروہ سیکھ چکا تھا۔

افتخار ٹخنوں کے بل زمین پر ڈھسے گئی۔ بوسن میں آج یہ کیسی رات اتری تھی۔ اتنی اندھی۔ اس رات نے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ یہ اندھا پن ستارہ صبح کو نکل رہا تھا۔ یہ اندھیرا۔ اندھیرا۔

زندگی میں وہ اتنے صدمات سے گزری تھی۔ وہ کسی ایک بھی صدمے سے مر کیوں نہ گئی۔ مرنے کے لیے یہ آج ہی کی رات کیوں؟

اسی صدمے سے کیوں؟
کیا حس ساعت ابھی بھی اس کے پیچھے ہیں؟
پیچھے ہی ہوں گی۔ ورنہ وہ گھرے ہوتے اندھیرے میں حلق نہ کر رہی ہوتی۔

اس کا جی چلا ڈیوٹا ہو کر دروازہ درجہ تک جائے۔ یہ دیوڑھی اس نے فرزام پر غاہ کیوں نہ کی اہلیٹ جانے لگے۔ اسے حوصلہ ہی سہی۔ قدم بوسی کے لیے خاک ہی سہی۔ یہ بھی کم تھا اس پہلے شخص کے لیے جس عزت بنا ہے اس کی طرف دیکھا اور شرافت سے اپنی عزت بنا لیا۔ بلور جان کر رخ روشن کیل بدل میں ایک شخص دعا کی طرح رکھا۔ ایسی دعا میں جن پر خدا سے خاص وعدہ لیا جاتا ہے۔ وہ اس پر زندگی کے رخ روشن کرنا رہا۔ اس پر لمحہ بہ لمحہ فدا ہوتا رہا۔ وہ ایک ایسا دل لہی تھا۔ جس نے کبھی پرستش کیے جانے کی خواہش نہ کی۔ بس ہاتھ جوڑے بیٹھے رہنے پر ہی نازاں رہا۔ رشتے اور تعلقات میں کون ایسا کرنا ہے۔ کون ہے جو باقی کے عیبوں کو فراموش کر کے دیوتا بناتا ہے۔ کون ہے جو تعلق کو مقدس فریضے کی طرح سرانجام دیتا ہے۔ ایسی عبادتیں کون کرتا ہے جو فرض نہیں ہوتیں۔ لیکن فرض کر لی جاتی ہیں۔ محبت سے محبت کے لیے یہ صرف محبت ہی ہے جو اس مقام تک لے آئی ہے۔ یہ کرشمے محبت کے ہی ہیں۔

شیریں حسن پر اس کی چاہت قائم نہ تھی۔ حسن جس پر نظر پڑنے ہی شاہراہ قائد اعظم کی طرف عدنان کے لیے ساکت و جلد ہو گئی تھی۔ وہ نیلی گہری آنکھیں جن میں عدنان کا دل ڈوب گیا تھا۔
”مجھے معلوم ہو گیا، صرف ایک ہیٹلن کے لیے جنگ کیوں کی گئی۔ میں تاریخ کے اس افسانے پر ہنسا کرتا تھا۔ اب یہ تاریخ مجھ پر ہنس رہی ہے۔“
افتخار تمہارے لیے تو عالمی جنگ بھی کم ہے۔

وہ عدنان کی وہ ہیٹلن تھی جو لاکھوں انسانوں کو میدان جنگ میں ٹھیسٹ لاتی تھی۔ جسے اٹھالایا جاتا ہے۔ پہلو میں بٹھلایا جاتا ہے۔ وہی حسن اور وہی کشش جو عظیم قوموں میں جائز نہیں۔ جس پر قلم اٹھا کر وہ لفظ بھی نہیں لکھے جاتے۔

”میں نے سنا ہے کہ کچھ روگی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ایک سچا اور کھرا انسان ایسے روگیوں پر ایک چھوٹے مارتے تو وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تمہیں تو مجھے

چھوٹک بھی مارتی نہیں بڑی۔ اور سنو۔ اگر ہم اچانک سے بہت غریب ہو گئے تو ہم ایک شفا خانہ کھول لیں گے۔ تم چھوٹکیں مارتی جانا۔ میں پیسے اکٹھے کرتا جاؤں گا۔ ہلہلا نہیں۔ میں۔ میں۔ میں تمہیں اپنی شفا کے پیسے نہیں دوں گا۔ ایک روپیہ بھی نہیں۔ ٹھیک ہے عین کوئی ایسا روگی بھی نہیں تھا۔ لیکن تم میں تو مکمل کا مکمل تھا۔“

”افتخار! عدنان کی آواز اس کی پشت سے ابھری وہ آواز دیتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑھ کر اسے تھام لیتا چاہتا تھا۔“

افتخار آنسو ہاتی رہی۔ وہ اباک (بہوت) کھڑا رہا۔
”کاش! خدا نے فرزام نامی انسان پیدا ہی نہ کیا ہو۔“ خدا اسے یاد بھی آیا تو شکوے کے کیسے۔
”میں شخص کے لیے آنسو بہا رہی ہو جو تمہیں چھوڑ گیا۔“

افتخار کے جوگ سلو جینا میں تبدیلی نہ ہوئی۔ شاید وہ اسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً وہ فرزام کے دل کی دھڑکنیں تلاش رہی تھی۔ آس پاس سے اندھی بہری ہوئی وہ فرزام کے آسن جملے تھی۔ عدنان ٹخنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تم کہا کرتی تھیں کہ خدا کو تمہیں امان دے دیا ہو گا۔ تم خدا کو منا کر رہی چھوڑ دو گی۔ دیکھو! تم نے خدا کو منائی لیا۔ خدا امان کیا افتخار۔ اسی نے ہمیں دوبارہ ملایا ہے۔ واقعی خدا تمہاری بہت مانتا ہے۔ تم نے راضی کر ہی لیا اسے۔“

”اب ہی تو میں نے اسے ناراض کیا ہے۔“ افتخار نے عین اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں ڈر کا شبہ تک نہ تھا۔ چادر کا کونا دانتوں میں دبائے، سرخ پڑتی ڈرا ذرا سی کیک پاتی کیا یہ وہی لڑکی ہے۔ بل پر اس کے سامنے سے گزرتے جس کی جان نکل جاتی۔ وہ فرزام کے لیے اس کی جان لے لیتا چاہتی تھی۔ نگاہوں کے اس تصادم نے ایک گہرا صدمہ دیا۔ عدنان کا بھاگ کر کہیں چھپ جانے کو جی چاہا۔ کوئی

اس پر صرف اتنا ہوا کہ وقت کو پیچھے لے جانا، جس میں اس لڑکی کی نظریں شرا کر چکر لگا کر نکل جایا کرتی تھیں۔ جن نظروں میں پہلی شبیہ اس کی ہوا کرتی تھی۔

اسے صدمہ ہوا۔ گہرا صدمہ ہوا۔ اس لڑکی نے دو دو کر ان آنکھوں کو بریل کیوں نہ کر لیا۔ اسے یہی تو کرنا تھا۔ ایک کمزور ڈال پر بیٹھی کمزور سی تلی جیسی لڑکی کو۔ خود کو اجاڑ لیتا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اتنی مضبوط کیوں ہوئی؟ وہ جو کن ہو جاتی تو وہ زندگی کے کسی بھی حصے میں اسے خود کو دان کر آتا۔ اب تو وہ مشکل لیے کھڑا ہے۔ افق جیسی لڑکی اس پر یہ نوبت کیوں ملائی؟ اول آئے والے کو وہ اس درجے پر کیوں لے آئی؟ وہ افق سے پوچھتا۔ ضرور پوچھتا۔ لیکن اب کیسے پوچھتا؟

”تب وہ میرا تھا۔ اس نے مجھے تم سے بچا لیا۔ میری راتوں کی عبادتوں مسجدوں دعاؤں پر اس نے مجھے فرزام دیا۔ اس نے مجھے وہ ہیرا دیا جو انسانوں کی کلن سے نہیں نکلتا۔ جسے مقدس صفات سے بنایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو وہ کیا ہے؟ تم نہیں جان سکتے۔ تمہارے پاس وہ علم نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو وہ آنکھ ہے۔ جسے میرا حسن نظر آتا تھا۔ وہ آنکھ جو مجھے دیکھتے رہتا چاہتی تھی۔ میرے حسن کے قصیدے بیان کرتی تھی۔ تم نے وہی سب دیکھا تا جو بازار سے خریداری کرتے وقت ایک گاہک دیکھتا تھا۔ وہی گاہک جو انسان اور چیز میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے مطلب کا۔ اپنے مطلب سے خریدنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بس وہی خریدار ہوتا تم۔“

”تم اس وقت غمے میں ہو۔“ عدن نے اپنے اندر اٹھنے والی کپکپی کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ وہ افق کے سامنے ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”مگر میں غمے میں ہوئی تو تم پر تھوکتی۔ کیا میں نے ایسا کیا؟ میرا تم پر غمہ بھی حرام ہے۔ جیسے تم مجھ پر حرام ہو۔“

”تم کھو! تم میرے لیے کس قدر حقیر ہو۔ اگر تم اس حال تک نہ پہنچتے اگر تم اس دنیا کے بادشاہ نہ ہوتے تو بھی افق پلٹ کر تمہیں نہ دیکھتی۔ تمہیں تمہاری اوقات معلوم ہوئی؟ افق جم کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عدن کو واقعی اپنی اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گئی تھی۔

”فرزام کی نظروں میں مجھے تمہاری اوقات معلوم ہو گئی ہے۔“ ہمت کر کے آواز کو مضبوط بنا کر عدن نے کہہ دیا۔ جبکہ وہ ایسے گرتے والا تھا۔ جیسے گھن گھلایا زہ۔ جو ذرا سے دباؤ سے دھڑام سے چر مرا کر گر پڑا ہے۔ اسے کچھ بھی نہ ملا اور وہ گھن گھلایا کھڑا رہا۔

”تمہارا نام ان ناموں میں لکھا ہی نہیں گیا۔ جن پر محبتیں واجب ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو جان جاؤ۔“ وہ بدو عادی رہی تھی یا سزا سزا رہی تھی۔ اس نے یہ سب کیسے جان لیا تھا۔ جیل چلنے کے بعد سے وہ بار بار رو پڑا تھا۔ اس سے پہلے زندگی میں یہ نوبت کبھی نہیں آئی تھی اس پر۔ یہ بات سن کر اسے رونا آیا۔ اس پر مینوں روار گھے چلے والے تشدد سے زیادہ اسے اس وقت صحیح سلامت کھڑے ہو کر آیا۔

”فرزام تمہیں چھوڑ گیا ہے افق۔ اس صدمے سے

باہر آ جاؤ۔“ وہی عدن کا شہرہ پر ملت دینے والا انداز۔ ”تم تمہیں دھتکار رہی ہے۔ اسے اپنی پیشانی پر لکھ کر رہا ہے۔ اس نے عدن کی بچائی بساط ہی الٹ دی۔ جب جب اپنی شکل دیکھو۔ تمہیں یہ دکھائی دیتا ہے۔“

”مجھے تم دکھائی دیتی ہو افق۔ ایسی باتیں تو تم کرتی تھیں۔ اب میں کر رہا ہوں۔ مجھ میں تم سما گئی ہو۔ میں سانس کیسے لوں افق۔ میری سانسیں تم سے جڑ گئی ہیں۔“

”اس نے بڑھ کر افق کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ افق دو قدم پیچھے ہوئی۔ وہ اس سے ڈر نہیں رہی تھی۔ بھاگ تو اب قہقہہ نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے نہیں بھاگے گی۔ یہ ڈر کر بھاگنے کا ہی انجام تھا۔

”پانی آئے تو اونچائی پر چڑھ کر جان بچانی ہے۔ عذاب آئے تو سجدے میں جھک کر۔ انسان دیل بن کر آئے تو سامنے سے ڈٹ کر۔“

”میں اسے تمہاری اور اپنی ساری باتیں بتا آیا ہوں۔ تم کتنی بار میرے ساتھ اکیلی نکلیں۔ کیسے تم دیوانہ وار مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ ساری خاص باتیں بتا کر گیا ہوں اسے افق۔ آخر کو وہ بھی ایک انسان بن ہے نا۔ کتنا بھی اچھا ہو گا۔ فرشتہ نہیں ہو گا۔ تمہاری زندگی میں اب مجھے واپس نہیں آئے گا۔ تمہاری قسمت میں میں لکھا گیا ہوں۔“

”اس کے رد عمل پر وہ چڑ گیا۔ ورنہ یہ سب نہ لکھا افق نے اپنے تاثرات بمشکل دوائے۔ جن میں پہلا تاثر غیظ و غضب کا تھا۔

”مجھ سے متعلق مشورہ لینے وہ تمہارے پاس نہیں گئے گا۔“

”مگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے چلا نہ جاتا۔ اپنی بیوی کو مجھے ساتھ چھوڑ کر۔ تمہیں چھوڑ چکا ہے۔“

”مگر وہ مجھے چھوڑتا تو خود میں رہتا اور مجھے تمہارے ساتھ چلا کرتا۔“

”تم بہت خوش فہم ہو افق۔“

رہی۔ فرزام میرے لیے کوئی جنگی جھاڑی نہیں جسے اکھاڑا اور زمین کسی اور تیل بولنے کے لیے تیار کر لی۔ تمہاری بھول ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو بھی وہ میرا ہی ہو گا۔ کیونکہ میں اسے اپنا ہی رہنے دوں گی۔“

اس آخری بات سے عدن کو بہت تکلیف ہوئی اس کا جی چاہا کہ زوردار تھپڑ افق کے گل پر مارے۔ ”تم سو سال بھی میری راہ میں کھڑے رہے۔ تو بھی تمہیں میری ایک نظر نہیں ملے گی۔ تم افق کو پلٹ کر خود کو دکھانا نہیں پاؤ گے۔“

کیا ہوا اگر وہ اس جسم حور کو گھیسے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ کاش! وہ پاکستان میں ہوتا۔ کاش! وہ نام نہاد و ہشت گرد نہ ہوتا۔

”تم افق کو پلٹ کر خود کو دکھانا نہیں پاؤ گے۔“ اس کے اندر باہر سائیں سائیں ہونے لگی۔

ایک نے اس سے محبت کی تھی۔ ایک سے اس نے شادی کی تھی۔

افق کو چھوڑ دیا تھا۔ اریہ نے چھوڑ دیا ہے۔ ایک کو دھتکارا تھا۔ ایک دھتکار رہی تھی۔

افق نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ضرور رخ موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چال میں تھکن اور دکھ ضرور تھا۔ لیکن اس کی سمت سیدھی تھی۔ اس کا اٹل انداز بتا رہا تھا کہ وہ کب تک بیمار کے چل سکتی تھی۔ وہ تا عمر بیمار کے چل سکتی تھی۔

عدن وہیں کھڑا رہ گیا۔ افق اپنے پیچھے وہ اندھیرے سمیٹ لائی۔ جو آج ہی کی رات خاص بوشن پر اترے تھے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سب ہی بتیاں روشن کر دیں۔ اندھیرا پھر بھی پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

اس نے چاہا بھاگ کر جلیں بھر کی روشنی لے آئے۔ فرزام لے آئے۔ باہر نکلے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر فرزام کو آوازیں دے۔ وہ اس کی پہلی آواز پر نہ ملے تو آخری آواز پر ہی پلٹ آئے۔ وہ اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دے۔ اسے بجائے بھی نا۔ اسے مرجائے دے۔ لیکن ایسے چھوڑ کر نہ جائے۔

”میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں دریا میں پھینک

”دل۔“
”مجھے؟“ اسے سن کر بھی یقین نہیں آیا۔
”ہاں! تمہیں ہی یا۔ تمہیں بہانے سے سب سے نظر بچا کر کنارے سے دھکا دے دوں۔ پھر جھٹ جیکٹ اتار کر خود بھی کو جاؤں اور تمہیں پچا لاؤں۔“
”سب سن کر بھی مجھے یقین نہیں آیا۔“
”سنو۔ تمہیں لو پر لے جاؤں اور دھکا دے دوں۔“
”شو اپ۔ تم پھر کنٹینر پانی میں۔ میں بھی کو دیا پانی میں اور پھر سے تمہیں پچا کر اوپر لے آؤں گا۔ میں ہیرو بن جاؤں گا۔“
”ہیرو بننے کے لیے؟“

”ہاں! میں بار بار تمہارا ہیرو بننا چاہتا ہوں۔“
وہ اس بات پر دونوں ہنسی۔ اور خوشی سے اسے کئی راتیں نیند نہ آئی۔ وہ ذہن میں اپنے دریا میں گرنے کی اور فرزام کے ہاتھوں پچائے جانے کی فلم چلاتی رہی۔ ہر بار اس فلم کو چلاتے اسے بہت اچھا لگتا۔ ہر بار اسے اس فلم کے ہیرو پر الو کے انداز میں پیار آتا۔ محبت ان پر بہت سے الگ الگ کھوں میں وارد ہوئی تھی۔ جیسے اوس۔ بارش کی طرح نہیں برسی۔ نظر بھی نہیں آتی۔ لیکن گیلیا کر دیتی ہے۔ نری سے محبت کے۔ لہ گائے گئے لوک گیتوں کی طرح بھی۔ جو ان گنت پتیاں رکھنے والے پھول کی طرح الگ الگ جدا جدا ہوئے۔ لیکن لے اور رو ہم ایک ہی رکھتے ہیں۔

اگر وہ دریا میں کود جائے تو کیا وہ کہیں سے بھی آجائے گا۔
”ہاں۔“ افق جانتی تھی۔ ایسا جانتا جس کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ جس یقین کے پیچھے ہی شک چلا آتا ہے۔

”میں تمہیں بہت یاد کرتا رہا۔“ ایک دن وہ اسے ہر دو منٹ کے بعد فون کر کے کہتا رہا۔
”بارش ہو رہی ہے۔ بہت بد صورت سی بارش ہے۔ مجھے تو اچھی نہیں لگ رہی۔ ہوا ایسے چل رہی ہے کہ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جانے کیوں۔ اور پھول ہاں

صرف پھول ہی پیارے لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے سارے امریکی کھڑوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ کھڑا مجھے چلنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی۔ افدایہ امریکی۔ افدایہ لڑکے لڑکیاں۔ اف اف۔ ہاں! میں بھگ رہا ہوں۔ نہیں! میں آؤں کریم نہیں کھاؤں گا۔ نہیں بیٹھنا مجھے کہیں۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے اپنا نام تو تم لے نہیں رہیں۔ میں بھی نہیں لوں گا۔ نہیں! مجھے اب افق نہیں چاہیے وہ دھوکہ دے گا۔ ایک گندی سی لڑکی نے مجھے جیسے مقصوم سے لڑکے پر کولڈ کلن ایڈیل دی ہے۔ وہ اب اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ اسے اس کا گلا دبا دینا چاہیے۔ میں تمہارا گلا دبا دوں گا افق۔ یاد رکھنا۔“

ہولے ہولے الہام کی سی صورت لیے محبت ان پر اترتی رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مقید ہوئے۔
وہ اسے فون کر رہی تھی۔ لیکن اس کا فون بند تھا۔ اس کے بیڈ روم کی کھڑکی کے ساتھ وہ ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ جس راستے سے اسے آتا تھا اس پر نظریں گاڑے۔

واقعات تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ محبت کا جو معجزہ رونما ہو چکا تھا۔ اپنا اثر رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا فرزام ضرور آئے گا۔ ایسا یقین جو خود کو خود ہی کروایا جاتا ہے۔ جو پانی پر بنے بلبلے سا ہوتا ہے اس کے پاس یقین کے کئی دھانچے تھے۔ وقت ہی ثابت کرنے والا تھا کہ کون سا دھانچا کتنا مضبوط ہے اور ٹوٹ جانے کے لیے کتنا نازک۔

وہ بہت زیادہ رونا چاہتی تھی۔ ہر وہ حسب آواز جانتی تھی۔ جس سے اس کی زندگی میں فرزام کے ہونے پر آج نہ آئے۔

جب وہ امریکا آ رہی تھی تو اماں نے کہا۔ ”میری بیٹی بہت خوش قسمت ہے۔“
”امریکا جاری ہوں اس لیے؟“ وہ مسکرائی۔
”تم فرزام کے پاس جا رہی ہو اس لیے۔“
اس نے اپنے ویزے کے لیے بہت دعائیں کا

خمس۔ وہ بار اس کے ویزے پر مختلف اعتراضات لگ چکے تھے اور دونوں بار وہ کئی گھنٹے روتی رہی تھی۔ اس نے فرزام کو نہیں بتایا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ اس نے بھی نہیں بتایا تھا کہ یہاں آنے کے لیے اس سے بچک نہیں ہو رہی تھی۔ جس پر پھل پھل کر اس کے ہاتھوں سے گر جاتی تھیں۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ فرزام کے پاس آخر کار جا رہی ہے۔ آخر کار اس کے عین سامنے بیٹھ کر اسے دیکھ سکے گی۔ اسے سن سکے گی۔ جہاز میں بیٹھنے تک اسے یقین نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ جہاز کریش ہو جائے گا۔ وہ مرجائے گی۔ پورے آخر کار وہ کبھی بھی فرزام سے نہیں مل سکے گی۔ پوئشن ایر پورٹ پر اس کے کانڈزات رو کر رہے جائیں گے۔ ان پر کوئی نیا اعتراض اٹھے گا۔ اسے وہم تھا کہ اس کے اور فرزام کے درمیان ضرور کوئی آئے گا۔ وہ عین ہو گا۔ اسے گمان تک نہ تھا۔ اس طرح اسے گامے خیال تک نہ آیا۔

فرزام۔ اس نے سسکی سی سرگوشی کی اور پھر وہ کبھی سرگوشیاں کرتی ہی رہی۔

ایک غیر معروف علاقے۔ ایک غیر معروف سڑک کے کنارے سے ذرا آگے وہ ایک ڈھلان نما جگہ پر دونوں گھنٹوں پر بازو نکالے بیٹھا تھا۔
فرزام۔

گلابی کے نشانات ذرا دور ہی معدوم ہو جاتے تھے۔ وقفے وقفے سے سڑک پر سے کوئی نہ کوئی گاڑی معمول کی رفتار سے گزر جاتی تو زندگی کے شولہ زندہ ہو جاتے۔

یہاں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی کوشش کی تھی۔ ”افق جائے بھاڑ میں“ سوچ کر۔

اس سے کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ اس نے کافی پینے کی کوشش کی اور کافی ٹھنڈی ہوتی رہی۔
وہ ایک بار میں بھی گیا۔ وہ خود سے بے خود ہو جانا

چاہتا تھا۔ اس کا دل غ سوچے جا رہا تھا۔ سوچے جا رہا تھا۔ اسے سلا دینا چاہتا تھا۔ ہر اس زبان کو بند کر دینا چاہتا تھا۔ جو اس سے ہزاروں طرح کے سوال کر رہی تھی۔ اسے اکسار ہی تھی۔ سلا رہی تھی۔ تکلیف دے رہی تھی۔ اتنے سارے سوال جو اس کے اندر اٹھ رہے تھے۔ اس کے پاس ان سب کا جواب نہیں تھا۔

آرڈر دے کر وہ اٹھ گیا۔ اوش روم جا کر وہ بلاوجہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے۔ وہ کر کیا رہا ہے۔ کل اس کی زندگی کچھ اور تھی۔ آج کچھ اور تھی۔ کل تک سی جو بھی وہی زندگی تھی۔

اسے افق پر غصہ تھا۔ وہ اس پر بے حد ناراض تھا۔ اس کی شوخی جاتی رہی تھی۔ سوید نمیزی حد تک بد مزاج ہو گیا تھا۔ یہی تجویز کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے افق کے لیے۔ وہ بد دل بھی ہوا تھا اور افق کو ایک تھپڑ بھی مارنا چاہتا تھا۔ اور یہ سب بس یہاں تک ہی تھا۔ وہ افق کو نکل باہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”بیوی وہ تمہاری ہوگی۔ محبوبہ وہ میری ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

ایسے لفظوں کی بازگشت پر وہ اس وقت گھر سے باہر نہ ہوتا تو کہاں ہوتا۔

”میں اس کی جان ہوں۔ مجھے یقین ہے اتنے سال اس نے میری گمشدگی کا سوگ ہی منایا ہو گا۔ اس جیسی لڑکیاں محبت کے نام پر کھیل نہیں کھیلتیں۔ یہ وہ عورتیں ہوتی ہیں جو محبت کے نام پر جو پودا لگاتی ہیں۔ اسی کے نیچے اپنی قبر بناتی ہیں۔“

فرزام نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بار بار اپنا ذہن جھٹک رہا تھا۔ وہ افق کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی پرسکون جگہ پر جا کر اپنے ذہن کو سلا دینا چاہتا تھا۔ اسے خیال سا آیا۔ زندگی صرف وہاں پیچھے چلی جائے تو وہ افق کو لے کر کہیں چلا جائے۔ اس نے اس انسان کی یہ سب باتیں نہ سنی ہوئیں۔ جواب اس کے ہر یقین کو بے یقین کر رہی تھیں۔

وہ افق کو جانتا تھا۔ اس جاننے کو وہ اب بھول رہا تھا۔ وہ افق سے محبت کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس پر اس کا یقین کھو گیا تھا۔

اسے عدن کی کئی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔ وہ بکواس کر گیا تھا۔ وہ مکار ہے۔ وہ افق کا المن ہے۔ وہ انہیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ تو صرف حقیقت بیان کر گیا۔ وہ افق کو چاہتا ہے۔ وہ افق کی ترجمانی کر گیا ہے۔

پہلے کو رو کر تھوڑے سے سر اٹھاتے خیالات اس کے اندر جنگ کی حالت میں تھے۔ اس کی عقل عروج و زوال کے ہندو لے میں جھول رہی تھی۔ روی گئی تو وہ دوبارہ تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا اسے فون کرے اور اسے بتائے کہ ایسے آکر چلے جانے سے۔ ایسے اپنا کر چھوڑ دینے سے کیا کیا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ روی کی محبت کو روی سی محبت کو دوبارہ زندگی میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ افق جارہی ہے تو اس کی جان کیوں نکل رہی ہے۔ اب وہ روئے گا نہیں۔ اب وہ مرجائے گا۔ کیا نیا ہو گا۔ جانے کتنے چلتے پھرتے اپنی لاش لیے پھرتے ہیں۔

So good bye please! dont cry

(اچھا تو پھر الوداع۔ دیکھو رونا نہیں) اسے یہ ساعت منحوس لگی Houston Whitney کے اس الوداع کا یاد آنا منحوس سالگا۔ تو کیا وہ افق کو الوداع کہہ آیا ہے؟ کیا محبتوں میں ایسے الوداع کہہ دینا جائز ہے؟

"I will always love you" اس نے افق کا ہاتھ اپنے شانے پر رکھا۔ سائمن کی نیو ایر پائی میں Whitney کے انسٹرومنٹل (Instrumental) عشق کو بہت سوں نے زندہ جاوید کیا۔ وہ بہت دیکھا رہا۔ اس سے پہلے اسے معلوم نہیں تھا۔ محبت رقص کی کیفیت میں

ایسے بھی فسون جگاتی ہے۔ دراصل جس دل کے اندر محبت در آنے لگی ہو اسے ہر چیز قصا نظر آتی ہے If i should stay I would only be in your way۔

"تم مجھے گراؤ گی۔ کاش! تم کبھی ایک کام تو میری خوشی کے لیے کر سکو۔"

اس نے اس کی کمر میں بازو جمائے کیسے اور اس کے رنگ بدلتے حسن کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے جھبٹ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کبھی نہیں سکتی تھی۔ وہ وہی شہزادی تھی نا جو سب سے چھپ کر اپنے شہزادے کے لیے بیٹھے بیٹھے گیت گاتی ہے۔ پاکنی میں کھڑی ہوتی ہے، چاند کو دیکھتی ہے اور جنگل میں نکل جاتی ہے۔ اپنی بہترین پوشاک میں ملبوس۔ سارا ہار سنگھار کیسے۔ بیٹھی آواز میں ترنم سے اسے بلاتی ہے۔ اسے ڈھونڈتی ہے اور جب اس کا محبوب آ جاتا ہے تو چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرتی ہے اور اگر وہ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو ہی چھو لیتا ہے تو کانپ کر بھاگ جاتی ہے۔ اور پھر رات بھر مسکراتی رہتی ہے۔

"ایسے ایسے کرنے میں تمہارا کیا جاتا ہے افق؟" اسے دکھا رہا تھا کہ وہ صرف مذاق ہی یہ سب کر رہا تھا جبکہ وہ بے حد شجید تھا۔

"میں انگریز نہیں ہوں۔ مجھے ڈانس نہیں آتا۔" شہزادی ڈر گئی۔ "انگریز ہونے سے رقص نہیں آتا۔ محبت ہو جانے سے آتا ہے۔ کیا تم نے دیوانوں کو رقص کی کیفیت میں نہیں دیکھا۔" وہ اسے کیسے سمجھا تا کہ عشق میں جھوم جانے کی کس کیفیت میں وہ تھا۔

So i'll go but i know I'll think of you every step (اور میں چلا ہی جاؤں گا۔ اور ہمیشہ ہر موڑ پر تمہیں ہی سوچوں گا) وہ بیٹھا تھا۔ وہ افق کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

So good bye Good bye (اچھا تو پھر الوداع۔ الوداع)

اس سب کا حساب کرنے میں کہ ان کی زمیں کیوں نہیں گیا ہو گیا۔ بہت وقت نہیں بہت حوصلہ تھا۔ اس میں یہ حوصلہ ابھی نہیں تھا۔

کتنی سی سڑک کے کنارے بیٹھے "افق عدن سے محبت کرتی ہے؟" سوچ آتے ہی اس کا جی چاہا کسی کار کے سامنے آجائے یا خود کو لوچ ڈالے۔ لیکن کیوں؟ جب بات ہی ختم ہو گئی۔ وہ افق کو چھوڑے گا۔ بس سب ٹھیک۔

مگر کو تمام کر وہ اس "سب ٹھیک" کو لے کر بیٹھا کیوں ہے۔ کسی آرام دہ جگہ پر جا کر آرام کیوں نہیں کرنا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا وہ جگہ ٹھیک رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں افق کو خود میں سے جھٹک کر کھڑا کرے گا۔ زمین اس کے وجود کے نیچے سے کھسکے گی۔ افق نہ لے گا تو اس کے پاس کیا رہے گا؟ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

افق نے اسے ایک شلوار سوٹ خود ڈیزائن کر کے بنایا تھا۔ صرف خاص اس کے لیے۔ جس کے ساتھ سیاہ رنگ کی مردانہ شال بھی تھی۔ جس الماری میں اس نے وہ شلوار سوٹ ہنگ کیا تھا۔ اسے وہ کھول کر دیکھا تھا۔ ایسے ہی آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں کیل ٹھونک کر اسے لٹکال احمد کی ٹیبلٹ میں وہ پن نہ سکا۔ اس پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

ایک ہندوستانی ہم جماعت کی شادی میں پہننے کے لیے اس نے ایک گھنٹہ لگا کر اچھی طرح استری کیا اور پھر اسے خیال آیا کہ روایتی ہندوستانی کھانوں میں سے اگر اس پر کچھ کر گیا تو اسے دل و گون مٹائے گا۔ اگر وہ اسے نہ مٹا تو؟

جموعہ کے دن سوٹ کو پہن کر وہ کمرے میں ہی بیٹھا پڑھا۔ جب وہ کلنی بنانے کے لیے اٹھا تو واپس اپنے پرانے لباس میں آگیا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد ہی۔

پھر اسے وہ سوٹ کب پہننا چاہیے؟ اس نے یہ سوچنا چھوڑ دیا۔ بیڈ کے عین سامنے کی دیوار پر وہ افق کے آنے سے پہلے تک لٹکا رہا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کے روم روم میں چرلغ جل اٹھتے۔ وہ اس کے لیے وہ ایک راک بن گیا۔ الہامی محبت اسے مکمل کرتی جارہی تھی۔ اپنے احساسات کی مختلف اشکال پر وہ خود ہی فدا ہو تا جا رہا تھا۔

کون ہے جو محبوب بننا نہیں چاہتا؟ کون ہے جو محبوب کو پانا نہیں چاہتا؟ محبت کی دھن سب کو ہی نچا ڈالتی ہے۔ اب جو کچھ اس کے اندر جل چکا تھا۔ بچا تو وہ مرجائے گا۔ کیا ابھی بھی شک تھا۔ ابھی بھی کوئی شک تھا فرام کو؟

"میں خود چھوڑ دوں گا افق کو۔" وہ بلند آواز سے بڑبڑایا۔ تاکہ خود کو پکا کر سکے۔ اپنی زبان سے اپنے دل کو سنا رہا تھا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اب اگر کسی رشتے، تعلق سے اسے صدمہ ملا تو وہ اس کی جان لے لے گا۔ وہ اس کی جان لے رہا تھا۔

وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ یعنی اپنی جان دے دے گا۔ دو بار اس نے روی کو وقفے وقفے سے فون کیا تھا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ وہ بری طرح سے چڑ گئی۔ "معلوم ہے تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔"

"غلط معلوم ہے۔ خدا نے اسے فرصت سے نہیں بنایا۔ خدا نے اسے اپنی بے پایاں محبت سے بنایا ہے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اگر تم مجھے نکال باہر نہ کرتیں۔ اگر تم سب وہ نہ کرتیں تو میں خدا کا اتنا شکر گزار نہ ہوتا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے روی! خدا کی رحمت کسے کہتے ہیں۔ مجھ پر وہ افق کے نام سے نازل کی گئی۔"

"رحمت کو رحمت بننے دیر نہیں لگتی۔" "تم بد دعا دو تو بھی ایسا نہیں ہو سکتے۔ کبھی

نہیں۔۔۔
”تم خوش گمان رہو تو بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“
”ہو چکا ہے رومی۔۔۔ کاربن کالی کے بجائے کائنات کے مصور نے مجھے اصل تصویر تھما دی۔ اس تصویر کا عنوان ”فخ“ ہے۔ اس تصویر کا خالق خدا ہے۔ اس تصویر کا مالک فرزام کو بتایا گیا ہے۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ ان گزرے سالوں میں وہ بہت خوش رہا تھا۔ کھلے ڈانس کے دور ان اس نے ایسا کوانٹار کر دیا۔“
”میں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں۔“
”کس کا۔۔۔؟“ وہ سمجھی کسی اور ہم جماعت کا۔
”ویل۔۔۔ کوئی بہت ہی خاص۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔
”وہ بہت ہی خاص“ گیارہواں بعد امریکا آسکی۔
جول ہوتا ہے تا یہ مکمل وجود سے پرے آگے کسی اور ہی مقام پر موجود ہوتا ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا باقی کے وجود نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ اس دل کے مقام پر باقی کا وجود چاہ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔
اس نے یاد کرنا چاہا کہ وہ اس سے محبت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ گری ہوئی رات میں وہ گہرائی میں ڈوب چکا تھا۔
البتہ اسے وہ وقت ضرور یاد آ رہا تھا جب وہ ایک پتلا بنی ان کے پاس کالم کیا کرتی تھی۔ ایک ایسا پتلا جسے یہ تو معلوم تھا کہ اسے کام کرتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خوش کیسے ہوتا ہے۔ ہونا بھی ہے یا نہیں اور۔۔۔ ہونا بھی کیوں ہے؟؟
وہ ایک سوالیہ وجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کئی سوال جاگ اٹھتے۔
”وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔“ فرزام کو یقین سا ہوا۔ شکوک و شبہات کے باتل میں وہ پور پور ڈوب چکا تھا۔ عدن کا زہر اثر دکھا رہا تھا۔
ایک گہرا سناٹا پھٹ کر پھیلا۔ درد کی ایک گہری تیز لر اس کے وجود میں لہرا کر پھیلی۔

خود کشی کرنے والا آخری بار تو سوچنا ہی ہو گا۔ آخر یہ موت ہی کیوں؟
مارنے والا نہ جانتا ہو۔ مرنے والا تو جانتا ہی ہے ہمار وہ مر رہا ہے۔
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یوسٹن میں رہنے والے دو لوگوں پر ایک ہی قیامت جدا جدا مقامات پر ایک ہی انداز سے گزر رہی تھی۔
فرزام نے سر کو جھٹکا۔ کوشش کر کے بھی وہ دل کو نہ جھٹک سکا۔ ایسی کوشش بار بار کرنے سے بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ ایسی کوششیں بار بار کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی جانی تھی۔
مکئی ٹوٹ جانے پر وہ دس بار رومی کے پاس گیا تھا۔ محبت کے ٹوٹ جانے پر اسے ہزار بار تو جانا ہی چاہیے۔
اس نے کار اشارت کی۔
اسے تاعمر جاتے رہنا چاہیے۔ ایک محبت کے لیے۔ صرف اتنا کرنے میں کیا جاتا ہے؟
* * *
عدن اپنے فلیٹ تک جانے کے لیے بس میں بیٹھا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ بس میں بیٹھا ہے۔ اس کا مطلوبہ اسٹاپ اگر گزر چکا ہے۔ آخری اسٹاپ پر اسے اترنا ہی پڑا۔ اسے پھر معلوم ہوا کہ وہ کتنی دور آچکا ہے۔ وہ اتنی دور کیسے آگیا۔ اسے معلوم کیوں نہ ہو؟ اسے واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ ایسی جگہ جانے کی۔ جہاں اس کے سونے کے لیے ایک بستر موجود ہے۔
صرف سونے کے لیے ہی گھروں کو کون جاتا ہے؟ وہ چلتا جا رہا ہے۔ کہیں تو وہ رک ہی جائے گا۔
چند دن پہلے وہ بن ٹھن کر ماریہ کے پاس گیا تھا۔ اس کے باپ کے پاس بھی جانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں دکھانا چاہتا تھا کہ وہ باہر آچکا ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ وہ انہیں ذرا سا ڈرا بھی دینا چاہتا تھا کہ اس کے اس طرح چل جانے پر ان کے رد عمل کو وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ کبھی

نہیں۔۔۔ انہیں رچوت ضرور پہنچائے گا۔
انہیں تین چار مزید شکاریاں تو گری چکی ہوگی۔ اسے اسے دیکھ کر ضرور پچھتائے گی۔ عدن جیسے قاتل ڈاکٹر کو کیل ہاتھ سے جانے دیا۔ باہر آئی گیانا۔ کیوں طلاق لی۔ اس کا باپ ضرور ہاتھ ملے گا۔ نشہ کر کے کہیں مر گئی ہو۔
اس نے ذریعہ کالیاں دی۔ خالصتاً وہی کالیاں جو اس پر تشدد کرنے والے دیا کرتے تھے۔ ان کالیوں کے لائق صرف ماریہ ہی تھی۔
اسے شک تھا کہ وہ اگر زندہ ہوئی تو اسے امریکا میں نہیں ملے گی عزیز کا کتا تھا کہ وہ ایک لمبے عرصے کے لیے امریکا چھوڑ گئے ہیں۔ آغا کو اس نے تلاش کیا تھا وہ یوسٹن میں ہی تھا۔ ماریہ سے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی۔
وہ اپنے اور اس کے گھر گیا۔ وہ گھر تک چکا تھا۔ ناچار اسے اتنا سے بات کرنی پڑی۔ اسے پہچان کر وہ چپ ہو گیا۔
”کیا چاہتے ہو؟“
”ماریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے لگے ایکشن میں وہ گورنری سیٹ کے لیے کھڑا ہوئے والا ہے۔ قاتل وقت میں وہ ماریہ سے بھی مل لیتا چاہتا ہے۔
ذرا در خاموشی رہی۔ وہی اس کے فرعون صفت ساتھی مسکری عظیم عادت۔
دس منٹ بعد اسے دوبارہ فون کیا گیا۔ ماریہ کے گھر کا پتا لکھوایا گیا۔ وہ خوب ہنس۔ یعنی اس گری ہوئی لڑکی کو گھر اس کے سامنے کیا جا رہا تھا۔ پھر اسے علاج کی ضرورت ہوگی۔ اس بار وہ اسے اس کا نفیس خلاصہ ضرور سنا لے گا۔
وہ ٹیکسی سے گیا تھا اور گھروں کے نمبرز پڑھ رہا تھا۔ پھر اسے یہ ضرورت بھی نہ رہی۔ ایک بڑے گھر کے سامنے پہنچے اور وسیع لان میں اسے ماریہ کھڑی نظر آئی۔ وہ پوئلہل اور پھولوں کے ساتھ مصروف تھی اور ایسے مصروف تھی۔ جیسے یہ دنیا کا مقدس ترین کام ہو۔

قریب ہی گھاس کلٹنے کی مشین رکھی تھی۔ جس کے ساتھ ایک دو ڈھائی سالہ بچہ زور آزمائی کر رہا تھا۔
”ماریہ۔۔۔“ گھر کی روش پر کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔
ماریہ پٹی۔ اس کا حسن۔ اف! اس کا وہ بے مثال حسن۔ عدن نے جھرجھری لی۔
امریکن میگزین میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہننے والی۔ ڈانس فلور پر جم کر ناچنے والی کا حسن نہیں تھا۔ وہ۔۔۔ بار میں بھی اس کی ہانسیوں میں، کبھی اس کی ہانسیوں میں۔ کبھی اس کوٹے میں، کبھی اس کوٹے میں۔ یہ وہ حسن نہیں تھا۔ جس کو دیکھ کر خباثت سے آنکھ ماری جائے۔ نہیں۔ اب اسے دیکھ کر یہ جرات نہیں کی جاسکتی تھی۔
”وہ عدن۔“ وہ فوراً اس کی طرف آئی۔ سیاہ فام بچہ بھی ماریہ کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔
”میرا خیال تھا تم ایک دو دن میں آؤ گے۔ پیانے فون کیا تھا۔ آؤ! کہیں بیٹھو گے۔ آجاؤ! اندر ہی چلتے ہیں۔“ پلیٹ کر اس نے بے بی کٹ اٹھایا۔ جس میں اس کی شبابت لیے ایک بچی آنکھیں کھولے دراز تھی۔
”فلور۔۔۔“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے آواز دی۔
میڈیکن میں سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں فیڈر تھا۔ جو ماریہ نے لے لیا۔
”ابراہیم ابھی اور کانٹ چھانٹ کرنا چاہتا ہے۔ آپ اس کے ساتھ رہیں۔“
ماریہ اسے اپنے ساتھ لیے سنگ اریا میں آئی۔
”صرف پندرہ منٹ لگیں گے سارہ کو سونے میں۔ تمہیں اتنا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔“
”ایک سیاہ فام ہے۔ ایک سفید فام۔۔۔ کتنے شوہر بدل چکی ہو ماریہ۔ یا۔۔۔“
وہ اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے لفظوں کا پہلا طمانچہ ماریہ کو مارا۔ نفیس خلاصے کی پہلی سطر۔

ماریہ کے چہرے کے رنگ بدلے اور صاف نظر آنے لگا کہ وہ خود کو قابو میں رکھنے کے لیے دل ہی دل میں کچھ دہرا رہی ہے۔ ذرا سی دیر بعد وہ مسکرائی اور اس کی طرف کامل اطمینان سے دیکھا۔

”میرا خیال تھا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔“ وہ پھر ایسے مسکرائی۔ جیسے عدنان کی بیوی ہوتے تو کبھی نہیں مسکرائی تھی۔

”یہ۔“ اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جس دیوار کو دیکھ کر عدنان پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔

”جس نے بڑا سا ہیٹ پہن رکھا ہے۔ طللال ہے اور اس کے ساتھ جو ٹنگ شرٹ میں ہے۔ وہ ذکر کیا ہے۔ دونوں اس وقت اسکول میں ہیں۔ ورنہ تم دیکھتے کہ یہ تمہیں بھی اتنے سکون سے بیٹھنے نہ دیتے۔“ جن کی طرف وہ اتنے اطمینان سے اشارہ کر رہی تھی۔ وہ بھی سیاہ فام ہی تھے۔ ایک کی عمر قریباً ’نوسال‘ تھی اور دوسرا سات آٹھ سال کا ہو گا۔

عدنان حیران ہوا۔ دیوار دس پندرہ تصویروں سے ایک ہی جگہ سے بھری ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں ماریہ اور ایک اسمارٹ سا لڑکا مسکراہٹ دہائے کھڑا تھا۔ صرف اسی تصویر کو عدنان نے ذرا سی دیر کے لیے دیکھا تھا۔

”ہو گا موجود ہوائے فریڈ۔“ وہ تمسخر سے ہنسا۔ بچوں کی تصویروں کے بارے میں اس نے کوئی بھی خیال دوڑانے کی کوشش نہیں کی۔

”یہ جمل ہے۔“ اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ جو گرل فٹ دم سے پکڑے کھڑا تھا اور ماریہ کھلا منہ فٹ کی طرف برصا کر رہی تھی۔

”ریکس کی جگہ اب جمل نے لے لی۔“ عدنان نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی اور جیسے پاپ بیٹی ٹانگ ہلایا کرتے تھے۔ ویسے ہی اپنی ٹانگ ہلائی شروع کر دی۔ مطلب ہش۔ ہش۔

”میرے شوہر۔“ ماریہ کے انداز میں فرق نہیں کیا تھا۔

”اس وقت یوگنڈا میں ہیں۔ ورنہ تم ضرور جمل

سے مل کر خوش ہوتے۔“

”شوہر۔“ اس نے بلند آواز میں بلند قہقہہ لگایا۔

”تم شوہر ہانے کا ترڈ کیوں کرتی ہو ماریہ؟“

ماریہ کا رنگ فق ہو گیا۔ عدنان نے خوب مزاحیہ ہاتھ برصا کر فریش جوس کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگایا۔

”شادی کرنے کا ترڈ تو میں نے تم سے کیا تھا۔“

تو مجھے اب ملا ہے۔ بیوی تو مجھے اب مل گیا ہے۔“

”کسے کب تک چلتا کرو گی ماریہ؟“ عدنان پھر سے ہنسنے لگا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ٹوٹے تعلقات ہیں۔ محبت نہیں۔“

اس بات پر وہ اتنی دیر تک ہنسا کہ تھک کر بے دم ہو گیا۔

”محبت ساریہ! محبت۔ تم محبت لائق چیز نہیں ہو۔ تم تاجے گانے لڑکھڑانے تک ہی ٹھیک ہو۔“

وہ اٹھی اور جمل کی تصویر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ”جمل کا کہنا ہے میں وہ صبح ہوں۔ جو زندگی کے لیے کی گئی۔“

”ہالہ! اور تم بھل گئیں۔“

”میں ایمان لے آئی۔“ وہ بھرپور سنجیدگی سے بولی۔

”اسے دیکھ چکی تھی۔ اسے سن چکی تھی۔ اس لیے ایمان لے آئی۔“

عدنان تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مذاق اڑاتا ہو۔ جیسے کامیڈی ڈراما سمجھ کر ابھی تالیاں بجاتے لگے۔

”ہالی ووڈ کی کس فلم کا ہیرو ہے تمہارا یہ موجود شوہر؟“

ماریہ اس کے انداز پر ہنسی۔ پھر اس نے سمجھا لیا۔

”جانا کہ وہ کس حد تک جمل کی ہنک کرنے والا ہے۔“

”مرکا کے بڑے بڑے ٹائیگون کا بیٹا ہے جمل۔“

اس وقت نا بھرا میں ہے۔ وہاں جلدی امراض کی ایک دباؤ پھلتی ہے اور وہ ہر صورت وہاں رہنا چاہتا تھا۔“

”اسے بھی تمہاری طرح شہرت کا شوق ہے؟“

”وہ چھوٹ کی بیماریوں کے مریضوں کی دیکھ جمل

کر رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے زخم صاف کرتا ہے۔ تکلیف سے کرا رہے بچوں کو اپنی آغوش میں رکھتا ہے۔ ان کے وہ کلم کر رہا ہے جو تم سے قابل نہیں کرتے۔ پہلے ناک ڈھانپ لیتے ہیں۔ مجھ سے غیر انسانی لوگ منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ ناک نہیں دیکھتا۔ اتھ نہیں کھینچتا۔ تیسری دنیا کا ایک چھوٹا موٹا شہر خرید لینے کی استطاعت رکھنے والا جمل یہ سب کرتا ہے۔ عدنان۔ شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا میری خوش قسمتی کا۔ ایسی قسمت کہ جمل میرا شوہر ہوتا۔ ہاتھ جوڑ کر یہ خوش قسمتی میں نے خدا سے مانگی تھی۔ زخم زخم صاف کرنے والے کی میں نے جا کر منت کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے بھی بیمار لگا چار ہی سمجھ لے اور میرا زخم زخم صاف کر دے۔ صرف اتنا ہی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں نے خدا سے پہلی بار دعا کی کہ وہ مجھے جمل سے شادی کر لے۔“

”مجھے میں بدست ہو کر ہر بات پر گولی نکالنے والی خدا کا نام لے رہی تھی۔ دعا کرتا سیکھ گئی تھی۔“

عدنان پھر ہنسا۔ اس بار اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس پر ہنسا۔ وہ اس کے گھر میں بیٹھا تھا۔ جس کی آرائش کو اپنی رہے رہی تھی کہ یہاں ایک خاندان آباد ہے۔ یہاں کچھ لوگ محبت سے رہتے ہیں۔ گھر خوب صورت تھا۔ سجا ہوا تھا۔ لیکن وہ نمائش کی کوئی دکان نہیں لگ رہا تھا۔

بات ختم کر کے ماریہ خاموشی سے عدنان کو دیکھنے لگی۔

”تجارت ہے عدنان!“

”جو نکاسہ انکار کر کے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ سہلا کر اٹھ گیا۔ سو کچھ دیر اور اس گھر میں گزارنا چاہتا تھا۔“

ماریہ ابراہیم کو کھلاتی رہی۔ وہ اتنے غرے کر رہا تھا کہ عدنان کا پیچھا اس کی کرسی الٹ دے۔ وہ اسے دھڑک کر دھکا دیا۔

”میں کہیں سے اٹھایا ہے؟“ عدنان نے انگلیں

میں اتنی بے رحمی سے کہا کہ ابراہیم ایک دم چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ غصے سے ماریہ کا منہ سرخ ہو گیا۔

”تمہیں اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے۔“

”کیا یہ سچ نہیں۔۔۔ جگہ جگہ سے اٹھا کر انہیں گھر میں ملا رکھا ہے؟“

ماریہ نے ایک نظر ابراہیم کی طرف دیکھا اور اس کے گل چوڑے۔

”یہ ہمارے بچے ہیں صرف۔ یہ ہمیں خدا کی خاص رحمت سے ملے ہیں۔ وہ تو حق جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے۔“

اتنے کرارے جواب پر عدنان بد مزہ ہو گیا۔

”تو اب چیری کر کے سکون حاصل کرتی ہو؟“

”جمل مجھے مل چکا ہے۔ سکون کی تلاش نہیں ہے مجھے۔ سکون کی تلاش چند سال پہلے تھی۔ اسی تلاش کا انعام ہے جمل۔ تم کب کر رہے ہو سکون کی تلاش؟“

”میرے پاس بہت سکون ہے۔“ نہہکن سے ہونٹ صاف کیے۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے دونوں کہنیاں نیمل پر ٹکا دیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ عدنان اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔

”مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“

وہ اس پر تھوکنے کے لیے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری دھتکار کے لیے۔ عدنان کا پیچھا اپنی حسرت پوری کر رہی تھی۔ ڈرگز کا کیرا اب کیسے بن ٹھن کر بکواس کر رہا تھا۔

”پہلے سکون کی تلاش جلد ہی کر لو۔“

”عالمہ بھی بن گئی ہو یا نن۔ مجھے تو ٹھیک سے تمہارے مذہب کا بھی نہیں معلوم۔“ یہ بات وہ کہہ رہا تھا۔ جسے ٹھیک سے اپنے مذہب کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

”رب العالمین سے اپنے لیے دعا کرو۔“

”خدا کے نام بھی سیکھ لیے ہیں۔؟“

”نماز رھا کرو۔“
”نیک بھی ہو گئی ہو۔ اتنا حیران مت کرو۔“
”تو گویں پر رحم کیا کرو۔“
”تم تو فرشتہ بن گئی ہو۔“

”اپنے گناہوں پر توبہ نہیں کر سکتے تو شرمندہ ہونائی سیکھ لو۔“
”خج اور رئیس کے علاوہ کتنوں کا نام لے کر توبہ کی تھی تم نے؟“
”توبہ کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔“
”تم تو حیران کر رہی ہو، وہی شراب کے ڈالنے بھول گئی ہو؟“

”حرام سے ہر حال میں بچ کر رہنا۔ خدا سے معافی مانگو۔ وہ سب دتا ہے۔ تیرے خیراتی اسپتال کے غلیظ سے اسٹور روم میں روتے بھی اس نے مجھے سن لیا۔ ہر طرح کے حرام کو چھ چکی میری زبان کو جلتے اس نے مجھے سنا۔ یقین جانو ایسا ہوا۔“

”بند کرو اپنا یہ وعظ۔“ عدن اٹھ کھڑا ہوا۔
”میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔ میرے لیے یہ فرض کبھی کسی اور نے ادا کیا تھا۔ افریقہ کے صحراؤں میں۔ تمہارے لیے میں ادا کر رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”مشفق سی وہ عدن کو بہت پیاری لگی۔“

وہ اس گھر سے جا رہا تھا۔ جانا ہی تھا۔ اور وہ جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ بیس ماریہ کے سامنے بچھ جائے اور رونے لگے۔ التجا کرے کہ ماریہ اسے کہیں چھپالے۔ ایسی باتیں کرتی وہ کتنی انہولی لگ رہی تھی۔ ایرے غیرے کے گلے سے جھول جائے والی۔

وہ ماریہ کے قریب آیا۔ اور ہاتھ اس کے گل کی طرف بڑھایا ماریہ دو قدم پیچھے ہوتی حیران ہوئی۔
”مجھ سے دور رہو۔“

”تم میرے لیے ایسی کیوں نہ بنیں ماریہ؟“
”تم جمل کیوں نہ بنے؟ تم خریدنے والوں میں سے نہیں ہو۔ صرف محبت ہی ایک مکمل انسان کو

خریدنے کا ہنر رکھتی ہے۔ تم نے یہ ہنر سیکھا ہی نہیں۔“
عدن اکڑ کر چلا ہوا ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ خود گھسٹتا ہوا وہاں سے نکلا سو میٹر کی دوڑ میں ریکارڈ بننے والے سے اب کوئی پوچھے۔ پیچھے رہ جانا ہار جانا کتے ہیں؟

اس نے اگلی کئی راتیں بار میں گزاری۔ کئی طرف کے افسوس آگے تھے اسے۔ لیکن وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ باتیں یہ وعظ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اکھل کو اپنے اندر اٹھاتے ہوئے اس نے سب ہارنا

افتی کو کیسے ہار جاتا؟

خلی ہاتھ رہ جانے والا افتی کو کیسے جانے دیتا؟
”ماریہ۔ آخ تمہو۔ محبت۔ جمل۔ تمہو۔“
خج کیا جانے محبت کیا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔ بچے میں رہتے میں نے ایک معمولی لڑکی سے محبت کی ہے۔ کسی میں یہ حوصلہ میں نے کی۔ ڈاکٹر عدنان نے۔ جس کے پیچھے ایک عالم پاگل تھا۔ ”وہ بڑبڑا رہا۔“

”میرے کیسے افتی کو چھوڑ دوں۔“ کتنا ہی گر جائے کتنا ہی جھگڑے افتی کو کیوں چھوڑ دے وہ؟
”خدا کو مجھے امان دینا ہی ہو گا۔“ افتی بہت بار اسے کہہ چکی تھی۔

”تم خدا کو میرے لیے اتنا تنگ کرتی ہو؟“
”میں تو التجا کرتی ہوں۔“
”جو ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوتا ہے۔“ اس نے انگریزی شکل بیان کی۔

”کیا مطلب ہوا اس بات کا؟“
وہ دل کھول کر ہنسا۔ وہ تو اسے تنگ کر رہا تھا۔ ”یعنی کہ اگر تمہارے کہنے پر بھی خدا مجھے نہیں دے۔ تو۔“

”تی بڑی بات۔ اتنی بد شکونی۔“ وہ رونے لگی۔
”تو تمہیں کوئی اور مل جائے گا۔ کوئی رکشہ چلائے والا۔“

”میری محسوس بات۔ ایسی۔“ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔
”کتنی تو اس کے لیے ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا۔“
”تو اسے چاہیے تھا۔ کاش! وہ ایسی بات نہ کرتا۔“
”میری محسوس سماعت کی وجہ سے ہوا۔“
”ایسا! کوئی لڑکی ہے؟“ چلتے چلتے اس نے فون نکال کر کسٹن کال کی۔

”کوئی۔؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ اس کی آواز اور انداز پر گہرا گئے۔

”اب آپ کس سے میری شادی کریں گے؟“
”تم پہلے کسٹن تو آؤ۔ بہت لڑکیاں ہیں۔“
”کیا واقعی بہت ہیں؟ ابھی بھی بہت ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایک افتی جیسی ہے۔ یاد آئی آپ کو افتی۔“

”غلام علی نے فون بند کر دیا۔“ بد ذات۔
”بند فون کو وہ کھن سے لگائے رہا۔“
”جانتے ہیں آپ وہ کتنی بڑی دھوکے باز نکل۔“

”کتنی ہے مجھ پر ایک نظر ڈالنا نہیں چاہتی۔ کتنی ہے مجھ پر محبت واجب نہیں ہوئی۔ اس بات کا کیا مطلب ہے۔“
”میری محبت بھی یہی کہتی ہے۔ کچھ ایسا ہی۔ آپ نے مجھے اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں تو ہمیشہ شان سے جیتا ہوں۔ اب کیسے میں ٹل ہو گیا۔ صرف اسی ایک کھیل میں کیوں۔“
”میں نے تو جم کر کھیلا تھا۔ پہلے تو افتی میری ہر بات کا یقین کرتی تھی۔ اب کیوں نہیں کرتی۔ میں نے کتنی بار اسے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے کھونا نہیں چاہتا۔ پلایا اسے فرق ہی نہیں پڑا۔ کیا اوقات ہے فرزام کی میرے سامنے۔ اندھی ہوئی ہے افتی۔ مجھے متنا نہیں چاہتی۔ ایسی بہری پہلے تو نہیں تھی۔ ایسی بہری وہ کب سے ہو گئی؟ وہ نہیں مان رہی۔ فرزام کو چھوڑنے کے لیے وہ نہیں مان رہی۔ میں فرزام کو مجبور کہوں گا۔ اسے چھوڑ دے گا۔ پھر وہ میرے ہی پاس آئے گا۔ فرزام اسے چھوڑ ہی چکا ہے۔“ سڑک پر چلتے بہت دیر تک بند فون سے باتیں کرتا رہا۔ اور

پھر ایک بار میں بیٹھ کر بیڑا لے لگا۔
”میں ہر طریقہ آزماؤں گا۔ میں بہت ذہین ہوں۔“
میرے پاس بہت سے راستے ہیں۔“
اس کی بلند بیڑا ہٹ کر ایک دوا سے اچھے سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اتنے بھی حیران نہیں تھے۔ ایسی فلمیں وہاں ہزاروں بار چل چکی تھیں۔

عبادت گاہوں میں بیڑا لے والوں کو عقیدت کی نظریں نصیب ہوتی جاتی ہیں۔ انہیں پاگل بھی سمجھا جاتا ہے تو خاص رتبے کا پاگل سمجھتے ہیں۔
ایسی جگہوں پر بیڑا لے والوں کو لوگ مزے سے گالیاں دے جاتے ہیں۔ ٹھو کریں مار جاتے ہیں۔ یہی ان کا رتبہ ہے۔

وہ حلق تک شراب اندل چکا تھا۔ نشہ تھا کہ اگر نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی نشہ تھا۔ جا کر نہیں دے رہا تھا۔ افتی کے انداز کا۔ وہ ماریہ کو گالیاں بک رہا تھا۔ فرزام کی شان بیان کر رہا تھا۔ لیکن افتی کی شان میں کوئی کستانی نہ کر سکا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر افتی چاہتی ہے تو یہی سی۔ اگر وہ اس کی راہ میں بچھ جائے۔ تو وہ آئے گی اس کے پاس۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ وہ پہلی محبت ہے افتی کی۔ وہ پہلا مرد جس کے لیے اس نے اپنی ذات کے دروازے کھولے۔ افتی یہ کیوں بھول رہی ہے کہ امان سے ہی اس کی محبت کی ابتدا ہوئی۔ انتہا بھی امان پر ہی ہونی چاہیے۔ ایک بشری لڑکی ہے وہ۔ اس میں رد و بدل کس طرح کر سکتی ہے۔ ایسی محبت کر کے وہ امر ہو جاتی۔ کسی اور کی زندگی میں جا کر اس نے یہ کڑی کیوں توڑی؟ افتی کو تو سزا ملنی چاہیے۔ اسے یہ حق کس نے دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرے؟ اگر اسے یہ حق استعمال کرنا ہی تھا تو پورے امان سے امان میں نہیں اترنا چاہیے تھا۔ سارا قصور افتی کا ہے۔ فرزام نامی تعلق کو وہ آگ لگا آیا تھا۔ دنیا کو وہ آگ لگا دے گا۔“

اس کی ٹانگ پر بھاری جوتے کی ضرب لگی اور ڈوبتی ابھرتی ایک آواز سنائی دی۔

”تم یہاں سے دفعتاً کیوں نہیں ہو جاتے؟“
کون تھا جو اس کے کان کے پاس غرارہا تھا۔ عدن نے ہوا میں سے لہرائے اس کے جڑے پر ایک زوردار گھونسا بڑا۔ اس نے اٹھنا چاہا اور وہ گر گیا۔ چھتا کے کی آواز آئی۔ شاید بہت کچھ گرا۔

اس کے پیٹ میں لاتوں کی بارش ہو گئی۔ وہ بھی ہاتھ پیرہا تو رہا تھا۔ ابھی اس میں ہمت تھی۔ وہ مار سکتا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا رہا تھا۔ گالیاں بولے رہا تھا۔ لیکن اٹھ کر ہر بار وہی گر رہا تھا۔

اس میں بہت ہمت تھی ابھی بھی۔
وہ مار کھا رہا تھا۔ اسے پینا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے محلول سے کیلے ہو چکے تھے۔ جانے کیا کیا کچھ گر گیا تھا اس پر۔ وہ چلا رہا تھا اور جیسے جیسے اس کے چلانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ویسے ویسے اس کے منہ پر پیٹ میں۔ کمر میں۔ اگر گھونٹے لگتے تھے۔ اسے کئی بار گریبان سے پکڑ کر رون میں ہاتھ ڈال کر کھڑا کیا گیا۔ گھینٹا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتا ہی جا رہا تھا۔ اسے خفیہ جیل خانہ یاد آ گیا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلانے لگا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ نہیں ہوں میں دہشت گرد۔ میں۔ پانی دو مجھے۔ چھوڑ دو کتوں مجھے۔“ اسے چٹا کیا۔

”میں دہشت گرد نہیں ہوں جیسٹوں۔“
اس کا سر کسی دن کی چیز سے ٹکرایا۔ جلتی بھتی لائش اس کے آگے پیچھے رقص کرنے لگیں۔

وہ کہاں بڑا ہے؟ فٹ ہاتھ پر۔ سڑک پر۔ یا کسی گندی سی گلی کی غلیظ سی جگہ پر؟ اور پھر اس کی پروا کسے تھی۔ پروا کرنے والے عدن جیسے نہیں ہوتے۔ وہ عدن کی طرح نہیں ہو جاتے۔

اس کی جیب میں رکھا فون بج رہا تھا۔ اس کا باپ اسے فون کر رہا تھا۔

شاید اب وہ عدن کو کوئی نئی راہ دکھالے۔ زندگی گزارنے کا کوئی نیا گر۔ نئی مشق۔ اب وہ اسے کسی اور میدان کارنگ ماسٹر بننے کے لیے کہے گا۔ شاید اب وہ کتے بلیوں سے اوپر کا کوئی اور جانور نما انسان اسے

سدا جانے کے لیے اکسائے۔ وہ عدن کو بتائے کہ اس کا باپ وہ ہے۔ غلام علی غلام۔ عدن اس کا باپ نہیں ہے۔

اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون کی ایک تکی لیکر کپٹی سے ہوتی ہوئی بدبو دار جگہ میں جذب ہو رہی تھی۔ ایسی ہی ایک لیکر اس کے منہ سے نکل کر اس کے گریبان تک جا رہی تھی۔

اس میں اٹھ کر چلنے کی سکت نہیں اور وہ فرزام کو مار دینا چاہتا تھا۔

شراب پی کر وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور افق کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ امریکی عدالت میں اس کا مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ابھی بھی بہت سوں کو پیروں تلے مسل دینا چاہتا تھا۔

اس کے باپ نے اسے کبھی ہارنا نہیں سکھایا تھا۔ سکندر اعظم ہناؤندھے منہ پڑا تھا۔ جن انسانوں کو وہ پھاڑنے گیا تھا۔ ان سے وہ پھاڑ آیا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ گرہن نہیں رہا تھا۔

”افق میری ہے۔ فرزام اسے چھوڑ دے گا۔“ وہ بدبو داتا رہا۔

وہ ضدی ہے؟ نہیں۔
وہ نصیب ہے؟ نہیں۔
وہ قفل زدہ ہے۔ وہ قفل جو بے بدلتوں پر لگا ہے۔ وہی قفل جسے وہ توڑنا ہی نہیں چاہتے۔

فرزام گھر آیا تو تیزی سے بلڈنگ کی سیڑھیاں پھلانگتا اور آیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اسے خوشی ہوئی۔ انجانی خوشی۔ رات کے اس پہر۔ اس آخری پیریہ دروازہ ایسے ہی نہیں کھلا۔ سارا گھر روشن تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہاں نہیں۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ جس عورت کو وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہاں نہیں تھی اور گھر تک آئے جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اسے دروازے پر نظریں گاڑے ہی ملے گی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔

اس نے سارا گھر دیکھ لیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس

نے بار بار دیکھا۔ حد تو یہ کہ اس نے کپڑوں کی لماری تک کھول کر دیکھی۔

یہ وقت گزر گیا۔ یہ صرف ایک وقت نہیں تھا۔ ایک نیا نہ تھا۔ جو انہیں بتا گیا تھا کہ ان کی محبتیں اس جگہ میں کھلی ہیں۔ کس درجے پر

فرزام نے درجہ دیکھ لیا تھا۔

یہ صرف ایک رات نہیں تھی۔ گھپ رات۔ یہ ایک حساب کتاب کی رات تھی۔ وہ اس میں موجود محبت کا حساب کمال انداز سے کر گئی تھی۔

اسے افسوس ہوا۔ وہ واپس کیوں آیا۔ افق تو جا چکی تھی۔

وہ عدن کے پاس گئی ہے۔ یا وہ اس سے ناراض ہو گئی ہے۔

اس نے خود سے بھی چھپا کر دعا کی کہ وہ ناراض ہو کر نہ آئی ہو۔ اس کے سارے اعتراضات ابھی بھی اس پر وہی تھے۔ لیکن ایک یہ دل ہے۔ جو اپنے ہی حکم صادر کرتا ہے۔ الگ ہی کھڑا ہوتا ہے۔

فرزام کے پاس افق کے لیے وہی دل تھا۔ وہی دل جو افق دھل گئی تھی اپنی طرز پر۔ وہ بار بار اس کے دل سے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار تھا۔

وہ بار بار اس کی منت کرتے۔ گڑگڑانے کے لیے تیار تھا۔

یہ دل جو الگ ہی مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔

پلٹ کر۔ لپک کر۔ افق سے پلٹ جانے کے لیے تیار تھا۔

اعتراضات۔ شکوک و شبہات۔ غصہ، نفرت، بے گامگی۔ سب ابھی بھی وہیں تھے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ مل بہت حیر ہوتا ہے۔ بہت بھرتلا۔ وہ اس جنگ میں غلبہ رہا۔

بہت بڑی زندگی۔ فرزام نے سراٹھایا۔ اسے آہٹ مل گئی تھی۔ اسے ایسی ہی آہٹ پہلے بھی بہت بار مل گئی تھی۔ سنگ اریا میں فلور کشن پر بیٹھے میز پر سرگشتہ فرزام نے آنکھوں کو اٹھایا۔

وہاں سامنے افق کھڑی تھی۔ دروازے میں۔ گھر پہاٹل سے وہ اوپر آیا۔ یکدم صحت سے اس کے سارے یقین بجے تھے۔

اس کے سارے شکوک جھوٹے تھے۔ سب وہی جل لگے۔ ویک راگ آب و تاب سے گونجنے لگا۔

”کہاں تھیں تم؟“ اٹھ کر بھاگ کر اس سے لٹنے سے پہلے اس نے یہ پوچھا۔ اسے جواب چاہیے۔ ٹھیک وہی جو ان دونوں کو بچا سکے۔ وہی جواب چاہیے۔

”جہیں ڈھونڈنے؟“ اس پر نظر پڑتے ہی وہ شامت ہو گئی اور فرش پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اتنے بڑے شرم میں وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔ جبکہ جانتی تھی اسے ڈھونڈ نہیں سکتی۔ جو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ ایسے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ پھر بھی وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔

”میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی تھی۔“

”یہ مجھے ڈھونڈنے نکلی تھی۔“

ایک نیا لوگ گیت محبت کے لیے لکھا جا رہا تھا۔ فرزام چل کر اس کے پاس آیا اور اس کے بالکل پاس بیٹھ گیا۔

”میں ہر سانس کے ساتھ تمہاری منت کروں گی۔ آنسوؤں کا ہر رنگ لیے روؤں گی۔ فرزام۔ میں تمہیں خود کو چھوڑنے نہیں دوں گی۔“

فرزام نے بڑھ کر اسے خود میں سمیٹ لیا۔

لوگ گیت لکھا گیا۔

اپنی ہیروئن کا ہیرو بننے کے لیے وہ دریائے سین (پیرس) کے آس پاس ٹھہل رہا تھا۔ اسے وہاں کسی کا انتظار نہیں تھا۔ یہ نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ غصہ کا موسم تھا۔ اچھی ہو آچل رہی تھی۔ دراصل کافی روہن پرور ہوا تھی۔ کیا پیرس میں ایسی ہی ہوا چلتی ہے؟ شاید۔ اور شاید یہ صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہی چلتی ہو۔ ان ہی پر اثر کرتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ملیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی مائٹل کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

to stand on my own two

Can't seem
جانی۔ بند مٹھی کے ساتھ فرزام گھٹنوں کے بل جھکا
پیار کے پہلے شہر میں رہنے والے ایسے مناظر
جشن مناتے ہیں۔ آس پاس ارد گرد پھیلے ہوئے لوگ
فورا متوجہ ہوئے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ
صرف گردنیں موڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے
انہیں کیا کرنا ہے۔

I fear...

I am in Love...oh

I am in Love...

اس نے بند مٹھی کھولی۔ انگوٹھی کو وہ انگلیوں میں
لیا۔ گستاخ اہل کے طور پر ذرا سا جھانک کر دیکھا۔
روایت زندہ کی جارہی تھی۔ محبت کے اظہار کی
رسم نبھائی جارہی تھی۔ صدیوں پہلے کی۔ صدیوں
بعد کی۔ صرف یہی ایک رسم زندہ جاوید کر دینے کے
لیے کافی ہے۔

نامحسوس طور پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کا۔ بوڑھوں
کا۔ بچوں کا ایک دائرہ بن گیا۔ سب زیر لب مسکرا
رہے تھے۔ وہ اس بدلی کے کچھ بولنے کے انتظار میں
تھے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کی شرمیلیں
مسکراہٹ کے انتظار میں تھے۔

”یہ انگوٹھی تمہاری ہے۔ اس انگوٹھی کو تھامنے
والا ہاتھ تمہارا ہے۔ اس ہاتھ کے مالک کا دل تمہارا
ہے۔ کیا یہ دل ہمیشہ کے لیے تمہارا ہیرو بن سکا
ہے؟“

افتخار نے ایک بلند قہقہہ فضا میں چھوڑا۔
”ہاں۔“ وہ ذرا سا چلائی۔ انگوٹھی سے اس کا ہاتھ
دکھنے لگا۔ اور انگوٹھی پر افتخار نے اپنے ہونٹ رکھ
دیے۔ دائرے کی صورت میں بچنے لوگوں نے دل کھول کر
تائیاں بجاائیں Jeff Beck کا ”آئی ایم این
لو۔ آئی ایم این لو“ تیز ہو گیا۔
محبت کی رسم نبھادی گئی۔ اور۔ محبت مقدس
تھی۔

اس کی ہیروئن ایک بہت بڑی آئیں کینڈی کھارہی
تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اکیلی ہی کھارہی
تھی۔ وہ اسے دینا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا لایاں
ہاتھ کوٹ کی باتیں جیب میں پھنس چکا تھا۔ نکل ہی
نہیں رہا تھا وہاں سے۔ جب تک وہ ہاتھ باہر نہیں
آئے گا۔ وہ بے رحم ہی بنی رہے گی اس کے ساتھ۔ وہ
آس پاس دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس
کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی پر
لگی تھیں۔

اور وہ ہنس رہا تھا۔ ہاتھ برآمد نہیں کر رہا تھا۔ لطف
اندوز ہو رہا تھا۔

وہ تب بھی ہنسا تھا اور عدن کے تاثرات پر لطف
اندوز ہوا تھا۔ جب بہت سے شراب خانوں میں سے
اسے ڈھونڈ ڈھانڈا اس نے ایک گھونسا جڑا تھا۔

”میں افتخار کو ضرور چھوڑ دیتا۔ اگر میں عدن
ہوتا۔“ اس نے کہا تھا۔ عدن پر جیسے سب ہی آسمانی
بجلیاں آگئیں۔ اس کی شکل بتا رہی تھی۔ ایسا ہوا
ہے۔ وہ بری طرح سے پٹ چکا ہے۔

افتخار کو آئیں کینڈی بالکل مزہ نہیں دے رہی تھی۔
اسے فرزام پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

گٹار لیے ایک بے حد خوب صورت لڑکے
Jeff Beck (گٹکار) کو گارہا تھا۔ یقیناً ”وہ اپنے
سامنے بیٹھی لڑکی پر اپنا جادو جگانا چاہتا تھا اور یقیناً“
اسے کچھ اور بتانا چاہ رہا تھا۔

"I am in Love

Oh i am in Love"

کوٹ سے ہاتھ برآمد ہو چکا تھا۔ ہاتھ مٹھی بند
تھا۔ یقیناً ”اس میں کچھ بہت خاص بند تھا۔“

I am all shock up

well my knees are shaking...

my hands are getting weak...

And

شعبہ 12619، ستمبر 2013ء



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY